

اسیرِ موسمِ ہجر

ضیاءِ نسیم

PDFBOOKSFREE.PK

اسپر موسم ہجرات



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

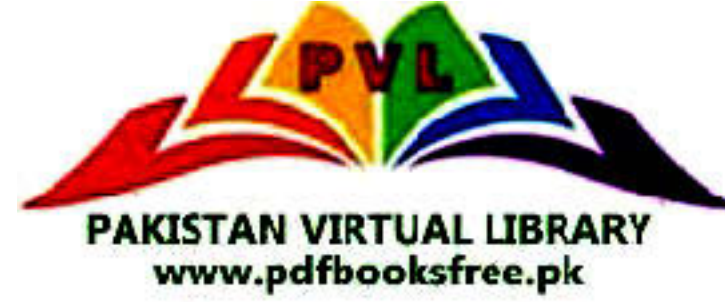
ضواریہ ساتر

پبلیکیشنز **آفتاب**

ہیڈ آفس: طبع بابا فرید ضلع کچہری لاہور 042-37311965

شاپ نمبر 12 فرسٹ فلور، جسٹس پلازہ، (مچھلی منڈی) اردو بازار، لاہور

انتساب



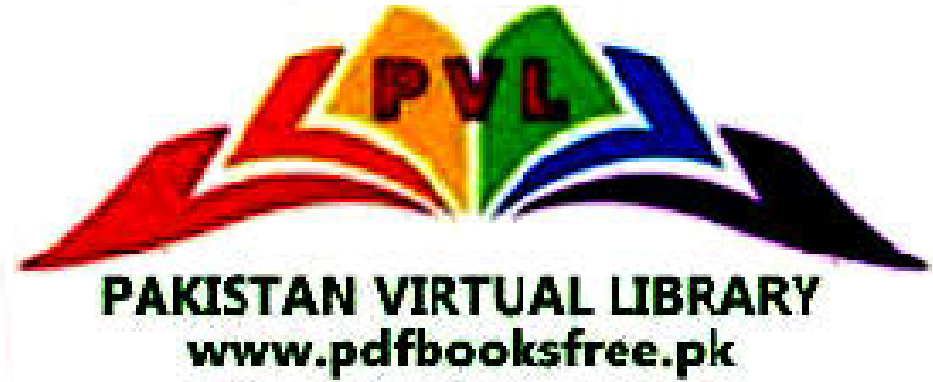
اپنے پیارے سے باباجانی اور امی کے نام
جن کی محبتیں پا کر ماضی کا ہر دکھ بھول گئی
ان کے تعاون کے بغیر شاید میں یہ چند
لفظ بھی نہ لکھ پاتی۔

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

- ناشر آفتاب ہاشمی
- نام کتاب اسیرِ موسمِ ہجراں
- مصنفہ ضواریہ سائر
- کمپوزنگ ایمان گرافکس، لاہور
- قیمت 175/- روپے

بھاگتے ہوئے قدم یکدم رک گئے اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا، سیاہ گھورتا رنگی کا عفریت چاروں اور اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھا لیکن اسے اس اندھیرے میں سفر کرتے کچھ دیر ہو چکی تھی اس لیے یہ اندھیرا یہ تاریکی اس کی نگاہوں سے نامانوس ہرگز نہیں تھی۔ پھولی ہوئی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پاؤں آگے بڑھا دیئے۔ حلق خشک لکڑی کی مانند چیخ رہا تھا ہر بن مو سے پسینہ کسی سیل آب کی مانند رواں تھا۔ اس کے پرانے بوسیدہ لباس کو پسینہ تر کر چکا تھا لیکن وہ بھاگ رہی تھی۔ اسے بھاگنا تھا جانے کون سی منزل اس کی منتظر تھی؟ کہاں اس کا پڑاؤ ہونا تھا؟ کون سی جگہ ایسی تھی جہاں پہنچ کر اس کی مسافت نے دم توڑنا تھا؟ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ جو وہ چھوڑ آئی تھی نہیں سوچنا چاہتی تھی لیکن بار بار سوچیں اس کے ذہن میں کیٹکس کے خار بن کر اتر جاتی تھیں۔ وہ نڈھال تھی پیاس سے بے حال تھی لیکن پھر بھی جس قدر جلدی ہو سکتا تھا وہ یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتی تھی۔ جہاں اس کے ماضی کا اندھیرا اس کا تعاقب نہ کر سکے۔ یہ سڑک سے ابھی قدرے فاصلے پر تھی۔ جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ لے کر بھاگ رہی تھی کہ یکدم کہیں دور سے روشنی کی ایک باریک سی لکیر نے اس کی اندھیرا شناس آنکھوں کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ ڈر گئی، سہم گئی۔

انسان نماد رندوں کے چنگل سے نکلنے کی خاطر اس نے مسافت کا راستہ چننا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دنیا میں قدم قدم پر اسے ایسے ہی انسانوں سے واسطہ پڑے گا۔ وہ سڑک کے کنارے نئی تعمیر شدہ دیوار کے ساتھ رکھے اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئی۔ اس کی رگ رگ میں خون کی جگہ خوف دوڑ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن یوں تھی جیسے اس کی رفتار کا کوئی تعین ہی نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا ابھی دل سینے کی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہلکی ہلکی روشنی اب قدرے تیز ہو گئی تھی ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی ابھرتی معلوم ہوتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنا آپ مزید سمیٹ لیا۔ تیز ہوتے تنفس کو قابو میں کرنے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سختی سے دبایا۔ اور سر کو قدرے اونچا کر کے آہٹوں کی سمت دیکھا۔ وہ کوئی چوکیدار تھا جو سامنے سے آ رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد جب قدموں کی چاپیں بالکل مدہم پڑ گئیں تو



اس نے ایک بار پھر اینٹوں کے ڈھیر کے عقب سے جھانکا تاریکی میں چوکیدار کا بس بیولا سا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈھیر کے پیچھے سے نکلی اور ایک بار پھر اندھا دھند بھاگنے لگی۔ وہ جلد سے جلد کسی محفوظ پناہ گاہ پر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈے سے نکل کر وہ سڑک پار کرنا چاہتی تھی لیکن اچانک اسی اثناء میں ایک تیز رفتار گاڑی اس کے بے حد قریب پہنچ گئی۔ اس کی خوفزدہ آنکھیں جیسے ساکت سی ہو گئی تھیں۔ اسے اتنا ہی محسوس ہوا تھا جیسے گاڑی کے ٹائر چر چرائے تھے۔ پھر جیسے اس کے وجود کو ایک زوردار دھکا لگا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ باہر کی پھیلی ہوئی تاریکی اور سنانا اس کے وجود کے اندر اتر گیا تھا۔



آج خلاف معمول انہیں کلینک سے کچھ دیر ہو گئی تھی اور دیر کا موجب وہ ایمر جنسی کیس تھا جو شام سات بجے ان کے کلینک پر لایا گیا تھا۔ ایک چھ سالہ بچے کو ایک تیز رفتار بس نے کچل دیا تھا۔ بچے بالکل جاں بلب تھا جب ان کے پاس لایا گیا۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح اس معصوم کو بچالیں لیکن شاید مشیت ایزدی نے اس کی زندگی کی اتنی ہی بہاریں لکھی تھیں۔ اس بچے نے ڈاکٹر فواد کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ اور اس وقت سے اب تک جبکہ رات کے گیارہ بجے کا عمل ہو گا ان کی طبیعت کا بوجھل پن دور نہیں ہو پایا تھا۔ مسلسل اڑھائی گھنٹوں کی محنت ضائع ہو گئی تھی۔ ذہن پر جیسے اداسی کی لکیر سی جم گئی تھی۔ سوچوں پر جمود طاری تھا۔ نگاہوں کے سامنے جیسے ایک ہی منظر ٹھہر سا گیا تھا۔ نادانستگی میں ایک سیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا سوچوں میں گم ہونے کے باعث انہیں روڈ کراس کرتا ہوا وہ نسوانی وجود نظر نہیں آیا تھا۔ وہ چونکے تب جب وہ گاڑی کے سامنے آ گئی۔ غلٹ میں بریکوں پر پاؤں رکھنے کے باعث گاڑی کے ٹائر بری طرح چر چرائے تھے لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ وجود ان کی گاڑی کی زد میں آ چکا تھا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر نکلے۔ ہلکے سرمئی رنگ کے پلین کاٹن کے سوٹ میں ملبوس وہ اس سیاہ تاریک رات کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی اور وہ سڑک پر اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ ریشمی سیاہ بالوں نے اس کے چہرے کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔ انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا جو غائب سڑک پر گرنے کے باعث گلنے والی چوٹ کی وجہ سے تھا۔ بظاہر پورے وجود پر کوئی زیادہ نمایاں چوٹ یا زخم نظر نہیں آ رہا تھا۔ ممکن ہے وہ خوف و دہشت کی زیادتی سے بے ہوش ہو گئی ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اچانک کوئی غیر متوقع حادثہ ہمارے حواس سلب کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی شاید یہی ہوا ہو گا۔ ڈاکٹر فواد نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا دور و دور تک کسی ذی روح کا وجود اساطعت میں نہیں آیا تھا۔

”تو کیا یہ لڑکی اتنی رات گئے اکیلی ہی کہیں سے آ رہی تھی۔ کیا مسئلہ ہو گا اس کے ساتھ۔“ انہوں

نے اس کی پیشانی سے بھل بھل بہتے خون کو دیکھا۔ ایک ہاتھ سے اس کی پیشانی کے زخم کو زور سے دباتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا مگر نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ ہر گز رتا لحد اس اجنبی لڑکی کو زندگی کی رنگینیوں سے دور لے جا رہا تھا۔ انہوں نے پیشانی سے اس لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر جیسے یکدم ہی فیصلہ ہو گیا انہوں نے اسے اٹھا کر گاڑی کی گچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ خود تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھادی۔ تیزی سے گاڑی دوڑاتے وہ پانچ چھ منٹ میں ہی پندر منٹ کا راستہ طے کر کے گھر پہنچ گئے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور وہ گاڑی اندر لے گئے۔ گاڑی کو پورچ میں کھڑا کر کے باہر نکلے۔ وسیع و عریض کوٹھی کے بیشمار کمروں کی لائٹس آف ہو چکی تھیں لیکن ایک کمرہ جو کوٹھی کے بالکل کونے میں تھا۔ اس کے باہر جلنے والی لائٹ دیکھ کر ڈاکٹر فواد نے طمانیت بھرا سانس لیا۔ بیک ڈور کھول کر انہوں نے اس زخمی لڑکی کو باہر نکالا اور کندھے پر ڈال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر انہوں نے اندر جھانکا۔ پھپھوٹتا سمب معمول تحت پوش پر بیٹھی ہاتھ میں تسبیح لیے اپنا وردہ ہرارتی تھیں۔ ان کی خوبصورت آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر نرمی اور روشنی کا جو ملا جلا تاثر تھا ان کی شخصیت کو ایک عجیب سا تقدس بخشتا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں ان کا صبیح چہرہ اپنے اندر جیسے پوری کائنات کا حسن سمیٹے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر فواد نے آگے بڑھ کر دھیرے سے ان کو پکارا۔

”پھپھوٹینا۔“

انہوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ آنکھوں میں تعجب کی پرچائیں سی لہرائی۔ ”فہدی تم اس وقت اور..... اور یہ.....“ ان کا جملہ ڈاکٹر فواد کے کندھے پر جھولتی بے ہوش لڑکی کو دیکھ کر ادھورا رہ گیا۔ ڈاکٹر فواد نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کو بید پر لٹا دیا۔

”میری گاڑی سے ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔ نہ جانے کون ہے..... کہاں سے آ رہی تھی..... کہاں جانا تھا..... کچھ علم نہیں؟ جب سے ایکسڈنٹ ہوا ہے بے ہوش ہے۔ پھپھوٹرا اسے دیکھئے گا میں اپنا فرسٹ ایڈ باکس لے آؤں۔“ ڈاکٹر فواد کمرے سے نکل گئے۔ پھپھوٹینا نے جائے نماز کا کونہ موڑا اور اٹھ کر بیڈ کی طرف آ گئیں۔ بیڈ پر بے ترتیبی سے بکھرے وجود کو قدرے سمیٹ کر چادر اوڑھائی اور اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ مانوس سے نفوش تھے لیکن پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس کی غلافی آنکھیں..... پگھڑیوں جیسے ہونٹ..... تالیاں ناک..... چاند کی طرح روشن پیشانی اور پیشانی کے گرد کالے بالوں کا ہالہ۔ شینا پھپھو کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت بلکورت لینے لگی۔ دل میں ایک نرم سا احساس چٹکیاں لینے لگا۔ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ڈاکٹر فواد اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے بید سائید ٹیبل پر باکس رکھا۔ روٹی بھگو کر اس کی پیشانی کا زخم صاف کیا اور پھر اس کی بیڈ میں

کرنے لگے۔ پھوپھو بھی قریب بیٹھی بغور ان کو دیکھنے جا رہی تھیں۔ بیڈنگ سے فارغ ہو کر وہ کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں جا کر ہاتھ دھو کر آئے اور پھر پھوپھو کے پیروں کے پاس نیچے قالین پر بیٹھ گئے۔
 ”فہدی کوئی اور مسئلہ تو نہیں؟“

”اوہ پھوپھو! کیوں پریشان ہو رہی ہیں کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔ آپ تو جانتی ہیں اچھی طرح میں امی سے پھر بھی جھوٹ بول سکتا ہوں لیکن آپ سے..... ناممکن!!“

”فہدی میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں میں پریشان نہیں ہوں۔ بس یونہی لڑکی ذات ہے ناں سب گھروالے کیا کہیں گے یہ سوچ پریشان کر رہی ہے۔ خیر پٹی تو تم نے کر دی ہے اب اس کو ہوش میں لانے کی بھی کوئی تدبیر کرو۔“ پھوپھو ہینا کے کہنے پر انہوں نے خود بھی سوچا کہ ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ حادثہ اتنا شدید بھی نہیں تھا کہ بے ہوشی اتنی طویل ہوتی۔ ابھی وہ اسے ہوش میں لانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ کمرے میں کسی نے جھانکا یہ تائی مقسوم تھیں۔ گھر بھر میں پھوپھو ہینا کے بعد ڈاکٹر فواد اگر کسی پر اعتبار کرتے تھے تو وہ تائی مقسوم تھیں۔ اللہ کی طرف سے ان کی گود خالی تھی لیکن دل غنی تھا۔ خدا نے ان کے دل میں ممتا کے خزانے بھر دیئے تھے۔

”ہینا کیا بات ہے! یہاں کیا کر رہا ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ تائی کے لہجے میں چچی پریشانی تھی۔

پھوپھو ہینا کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل کر معدوم ہو گئی۔

”بھابی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ اندر تو آئیے۔“ تائی مقسوم نے بیڈ پر لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ قدرے حیران سی وہ کبھی پھوپھو کی طرف دیکھ رہی تھیں اور کبھی ڈاکٹر فواد کی طرف۔

”یہ..... کون ہے یہ لڑکی؟“

”تائی امی میری گاڑی سے ٹکر ہو گئی تھی۔“ ڈاکٹر فواد نے مختصر سا جواب دیا۔

”واللہ کے بندے تو اس کو گھر کی بجائے ہسپتال لے کر جانا چاہتے تھے۔ خدا جانے کتنی زخمی ہو۔“ تائی کے لہجے میں تردد تھا۔

”اوہ تائی امی! کچھ زیادہ چوٹ نہیں ہے۔ دہشت کے زیر اثر بے ہوش ہے۔ ابھی ہوش میں آجائے گی۔“

”تو بھلا کوئی پوچھے تو سہی یہ رات کے اس پہر سڑک پر کیوں دندناتی پھر رہی تھی۔ ایک تو آج کل کی لڑکیاں بھی شتر بے مہار کی طرح جدھر منہ اٹھا چل پڑیں۔ اب خدا معلوم کس کی بہن بیٹی ہے۔ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟“ تائی مقسوم ہمدرد تو تھیں لیکن حقیقت پسند بھی تھیں اس بارے میں تو ڈاکٹر فواد نے بھی نہیں سوچا تھا۔ پھوپھو ہینا کی دو ہی بیٹیاں تھیں روہیہ اور بیٹھ وہ دونوں بھی باتوں کی آوازیں کر

پھوپھو کے کمرے میں آ گئیں۔ وہ دونوں انتہائی اشتیاق سے اس خوابیدہ وجود کو دیکھ رہی تھیں۔
 ”مما..... یہ کون ہیں؟“ بیٹھ کا لہجہ بھی اشتیاق سے لبریز تھا۔

”پتا نہیں بیٹا..... زخمی ہے۔ ہوش میں آئے گی تو پتا چلے گا۔“ پھوپھو ہینا اسے جواب دینے کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ جو دھیرے دھیرے کسماری رہی تھی۔ اس کے بند ہونٹ وا ہوئے اور ان میں سے ایک سسکاری بلند ہوئی اور پھر جیسے رفتہ رفتہ وہ ہوش میں آنے لگی تھی۔ نیم وا ہونٹوں سے ٹھہر ٹھہر کر کراہیں نکل رہی تھیں۔ کمرے میں موجود افراد نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اور پھر سب ہی اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ سب کی نظروں نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اور پھر سب نے دیکھا کہ اس نے دھیرے دھیرے اپنی غلافی آنکھوں پر سے پردہ اٹھا لیا۔



اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کتنی دیر تک تاریکیوں کی ہمسایہ رہی تھی۔ جانے کتنے لمبے کتنے گھنٹے کتنے دن بیت چکے تھے۔ اس کے حواسوں پر سیاہ کپڑے تسلط بجا رکھا تھا۔ پھر جیسے اس کپڑے کی چادر میں ننھے ننھے شکاف پڑنے لگے۔ اندھیرے پر روشنی غالب آنے لگی۔ روشنی جو زندگی ہے۔ روشنی جو سانسوں کی ضمانت ہے۔ وہی روشنی اس کے کانوں کو سماعت اس کے ہونٹوں کو گویائی اور آنکھوں کو بصارت دینے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے وجود کے ریٹے ریٹے میں درد سانس لے رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں آپس میں یوں پیوست تھیں گویا کبھی نہ کھلنے کی قسم کھالی ہو۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے ہوش کی وادی میں قدم رکھا تو سماعت ارد گرد کے ماحول سے کچھ بھٹنا ہٹ آمیز آوازوں سے آشنا ہوئی۔ شاید اس کے ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے جو آہل میں بانس کر رہے تھے۔ وہ کہاں تھی؟ اور کب سے تھی؟ یہ نہیں جانتی تھی۔ بس ذہن کے ایوانوں میں ایک حوت جاگ رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں تیز روشنی کا جھمکا ہوا تھا اور اس کے وجود کو ایک زوردار درد آمیز جھٹکا لگا تھا۔ پھر اندھیروں کے ساحروں نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ جانے کون کون سی ظلمتوں کی مسافت طے کی تھی اس نے اور اب روشنیوں کے سفیر جانے کہاں لے کر آئے تھے اسے۔ اس کے ہونٹوں سے درد بھری سسکاری بلند ہوئی اور پھر وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگی۔
 ”فہدی دیکھو اسے ہوش آ رہا ہے۔“ ایک نسوانی آواز کہیں بہت دور سے آئی تھی اور اس کی نیم وا آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اس کے ارد گرد کئی افراد جمع تھے۔ نکھرے نکھرے خوبصورت چہروں والے افراد جن کے چہروں پر اسے ہوش میں آتے دیکھ کر عجیب سا سکون پھیل گیا تھا۔ اس نسوانی آواز کے جواب میں ایک شخص تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ شاید ڈاکٹر تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں طبی آلات تھے۔ اس نے ایک کھوپڑی سے اس کی ہارٹ بیٹ چیک کی۔
 ”اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔“

میں ہی گزرتا تھا لیکن اس وقت جو خیال سوئی کی طرح ان کے ذہن میں چبھ گیا تھا وہ چاہنے کے باوجود اس سے چپچاہی نہیں چھڑا سکی تھیں۔ موذن کی پہلی آواز کے ساتھ ہی انہوں نے بستر چھوڑ دیا۔ ساری رات بستر پر کمر نہیں بدلتے گزرتی تھی۔ نیند کی ایک جھلکی بھی نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئیں۔ آریان بہت گہری نیند میں تھی۔ انہوں نے ایک لحظہ کو ٹھہر کر اس کے پاکیزہ چہرے کے ایک ایک نقش کو بغور دیکھا۔ ہر نقش ان کے خیال پر مہر تصدیق ثبت کر رہا تھا۔ پھر جیسے وہ یکدم حال کی دنیا میں واپس آگئیں اور وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے میں مشغول ہو گئیں۔



ڈاکٹر نواز کا گھرانا اچھے خاصے افراد پر مشتمل تھا۔ ان کی فیملی سمیت پانچ فیملیاں ایک ہی وسیع و عریض کوٹھی میں سمٹی ہوئی تھیں۔ سب سے بڑے شفقت تایا اور تائی مقسوم اولاد کی نعمت سے محروم ہونے کے باوجود ہر ایک کے لیے اپنے دل میں بے حد پیار رکھتے تھے۔ ان سے چھوٹے عارب تایا اور ھینا پچھوہنیں بھی بچوں نے تائی کہہ کر نہیں پکارا تھا کیونکہ انہیں پچھو کہلوانا زیادہ پسند تھا۔ ان کی دو بیٹیاں روبہ اور انیتہ۔ ان سے چھوٹے باہر چچا اور زابدہ چچی۔ انظر اور حسین۔ سب سے چھوٹے چچا شاہ اور ان کی خیمہ حدیقہ تھیں ان کے دو بچے تھے۔ انار اور باصر۔ سب گھر والے الگ الگ پورشنز میں رہتے تھے لیکن کھانا ایک ہی جگہ پکایا اور کھایا جاتا تھا۔ چھوٹی چچی حدیقہ اپنے مزاج اور طبیعت کے باعث فیملی میں چھڑ زیادہ ہر دلعزیز نہیں تھیں نہ ہی انہیں کچھ خاص پرواہ تھی۔ البتہ چچاؤں میں آپس میں گاڑھی چھتی تھی یہی وجہ تھی جو سب مختلف النوع مزاج رکھنے کے باوجود ایک ہی گھر کے مکین تھے۔

اس گھر کو جوڑ کر رکھنے میں دو شخصیات کا ہاتھ زیادہ تھا۔ تائی مقسوم اور پچھوہنیا۔ تائی مقسوم تو دور پرے کی رشتہ دار تھیں جبکہ پچھوہنیا، تایا عارب کی سگی چچا زاد بھی تھیں۔ سو اس لحاظ سے وہ دینی اہمیت کی حامل تھیں لیکن انہیں تایا عارب نے وہ مقام نہیں دیا تھا جس کی وہ اہل تھیں اگرچہ سسرال میں ان کے نام کا ذکر نکالتا تھا۔



مسرت جہاں اسم سہمی تھیں۔ شوخ، چنچل، کھلندری، دوشیزگی کی کھل تصویر۔ حسن ایسا کہ بہار بھی آئے تو پہل بھر کورک کر دیکھے اور دل میں حسد لے کر روانہ ہو جائے۔ لمبے لمبے سیاہ گیسو، ہادلوں کو شرماتے ہوئے۔ بڑی بڑی سیاہ گھوڑا نکھیں جن میں رات کی ساری سیاہی سمٹ آئی تھی۔ دودھیارنگت جیسے سورج کی پہلی انمول، ان چھوٹی کرن نے صبح کا ماتھا چوما ہو۔ پانچ بھائیوں کی لاڈلی بہن۔ بچپن سے ہی اماں بی نے ان کی تربیت پر خاص توجہ دی تھی۔ آنچل سے ڈھکاسر۔ سینے کی اٹھانوں پر حیا کا پلہ۔ چال میں نزاکت اور بولنے میں حلیمی۔ اماں بی جانتی تھیں کہ نجیب الطرفین سادات گھرانے کی بیٹیوں میں کیا

خوبیاں ہونی چاہئیں لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے کبھی مسرت جہاں پر ضرورت سے زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ گھر بھر میں ان کے چنچل قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ بھابھیاں ان سے بہت پیار کرتی تھیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بھابیوں نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔

شبیر حسین بہت بڑے ٹرانسپورٹر تھے۔ شہر میں ان کی کئی گاڑیاں چلتی تھیں۔ مسرت جہاں ان کی بھی بے حد لاڈلی تھیں۔ شام گئے وہ جب گھر آتے تھے۔ تو مسرت جہاں ان کے گلے میں بازو ڈالے فرمائش کرتے نہ تھکتی تھیں اور انہوں نے کبھی ادھی زبان سے بھی ناں نہیں کہا تھا۔ دولت کی ریل ویل ہونے کے باوجود اخلاقی برائیاں اس گھر سے کوسوں دور تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہی رہی ہو کہ یہ گھرانا خالصتاً اسلامی گھرانہ تھا۔ نماز روزے کی پابندی، صدقہ و خیرات کی روایت اس خاندان میں شروع سے چلی آ رہی تھی۔ شبیر حسین ماہ رمضان میں کتنے ہی غریب گھرانوں کو پورے پورے مہینے کا راشن ڈلو کر دیتے۔ ان کی گاڑیوں پر کئی ایسے بچے کام کرتے تھے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا لیکن انہوں نے کبھی ان کا حق مارنے کی کوشش نہیں کی۔ اچھا کھلایا۔ اچھا پہنایا۔ وقت پر مزدوری دی۔ یہی وجہ تھی کہ خدا نے انہیں سعادت مند اولاد دی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے پیار بھی بہت کرتے تھے۔ لیکن جہاں اصول کی بات آتی تھی وہاں ان کا رویہ اور برتاؤ بے چلک ہو جاتا تھا۔ اماں بی ان کی مزاج آشنا تھیں۔ عاجز اور منسکراہے انج ہونے کے باعث ان دونوں کی بہت اچھی سمجھ رہی تھی۔ بلکہ شبیر حسین اپنی بیوی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان دونوں ساون کی آمد آمد تھی۔ گھنگھور گھٹائیں آسمان کو اپنی سرمئی آغوش میں سمیٹتی اور سے ادھر چکراتی رہتی تھیں لیکن ابھی ساون کی پہلی بارش نہیں ہوئی تھی۔ مسرت جہاں نے ہار سنگھار کے درخت کے ساتھ جھولا باندھ لیا۔ ساری ساری شام ان کی جھولا جھولنے میں گزر جاتی۔ اماں بی بھی اپنی چار پائی درختوں کے نیچے لا بچھاتیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نم آلود ہوائے گرمی کا زور توڑ دیا تھا۔ جلتے جھلتے درود یوار کو بھی ٹھنڈک میسر آگئی۔ مسرت جہاں شام کے وقت وسیع دالان میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیتی تھیں۔ پھر تو گویا زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو ایک خمار کی طرح فضا پر طاری ہو جاتی تھی۔ یوں جیسے زمین اپنے بار آور ہونے کے خواب دیکھنے لگتی۔ اس کی تادیدہ آنکھوں میں بہار کے سپنے ہلکورے لینے لگتے۔ آسمان کی روشنیاں اس کی گود بھرنے کو بے چین اور وہ بارش کی بوندوں کو ماں کی طرح آغوش میں لینے کو بے تاب۔

اس دن مسرت جہاں جھولا جھولنے کے لیے ہار سنگھار کے درخت کی پٹا ہوں میں جانے لگیں تو یکدم فلک راجہ کو ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد خوشی کے ٹھنڈے آنسوؤں نے بڑھ کر مسرت جہاں کے صبح رخساروں کی بلائیں لیں۔ انہوں نے جھٹ سے سر اٹھایا۔ گھور گھٹائیں بڑے مدد بھرے انداز میں انہیں تک رہی تھیں۔ یوں لگا وہ برآمدے تک نہ پہنچ پائیں گی اور ہادل ان کا راستہ روک

لیں گے۔ انہوں نے بھاگ کر درخت کے نیچے سے چار پائی اٹھائی اور تیز تیز قدموں سے چلتی برآمدے تک پہنچیں۔ چار پائی بچھا کر انہوں نے کچن میں جھانکا۔ بڑی بھابی رات کے کھانے کے لیے سالن بنانے میں مصروف تھیں۔ شینا بھابی برتن دھو رہی تھیں۔

”بھابو! بادل آگئے۔“ جملہ کسی چپکار کی صورت ان کے حلق سے نکلا تھا۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔

”پگلی.....“ بڑی بھابی مسکرا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

”ارے یہ کوئی چھوٹی موٹی خبر ہے کیا..... باہر نکل کر تو دیکھیں۔ کیا منظر ہے۔ اف..... جی چاہتا ہے کسی پرندے کی طرح اڑ کر بادلوں تک جاؤں انہیں چھو کر آؤں اور پھر آ کر آپ کو بتاؤں کہ بادل کیسے ہوتے ہیں۔“ وہ آنکھیں میچے خود ہی اپنے کہے لفظوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

”ارے پاگل لڑکی! بادل صرف دھواں ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ان کا سارا لطف اس پانی میں ہے جو ان سے برستا ہے۔ بادل تو بس یہاں سے دیکھنے میں ہی اچھے لگتے ہیں۔“ شینا بھابی ان کی باتوں پر مسکراتے ہوئے گویا انہیں سمجھا رہی تھیں۔

”جانتی ہوں! لیکن حسن کو محسوس کرنے میں بھلا ہرج بھی کیا ہے۔“ انہوں نے مصنوعی ناراضگی سے شینا بھابی کی طرف دیکھا۔

”ہرج ہے! کیوں نہیں ہے؟ حسن اگر موجود ہو تو اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سراب تک پہنچنے کا خواب ہمیشہ تعبیر کو رہتا ہے۔ پگلی! تم ابھی بچی ہو۔ زمانے کے سرد گرم سے نا آشنا۔ تم کیا جانو جو چیزیں دور سے دیکھنے میں بھلی لگتی ہیں جب ہاتھوں میں آ جاتی ہیں تو ان کا اصل کتنا بے رنگ، کتنا پھیکا ہوتا ہے۔“ شینا بھابی کے لہجے میں ہلکا سا ملال گھل گیا۔ بھابی مقسوم نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا ان کی نگاہوں میں شینا بھابی کے لیے محبت اور شاید کھوتے کا پیغام تھا اور یہ پیغام تو وہ پچھلے دو سال سے سمجھ رہی تھیں۔ وہ یہاں کھوتہ ہی تو کر رہی تھیں۔ ان کے والد بلال حسین کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے تایا شبیر حسین نے انہیں اپنے بڑے سے چھوٹے بیٹے عارب کے لیے مانگ لیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ عارب بھائیوں میں مزا جاتا تو سب سے اچھا ہے لیکن اس کی ایک دو عادات ایسی تھیں جن کے ساتھ کھوتہ نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن شینا بھابی پچھلے دو سال سے نباہ کر رہی تھیں اور حقیقت حال کا سوائے بھابی مقسوم کے کسی کو علم نہیں تھا۔ اس وقت بھی بھابی شینا نے فوراً اپنے محسوسات کو کنٹرول کیا اور موضوع بدل دیا۔

”مسرتی! بارش تو برسے بھی لگ گئی۔“ کچن کی کھڑکی سے باہر کا سماں چند ہی لمحوں میں جل تھل

ہو گیا تھا۔

”بھابی ماں! ایسے موسم میں بھلا کیا کیا جاتا ہے؟“ ان کے لہجے پر فرمائش کا عنصر غالب تھا۔ بھابی مقسوم نے مصنوعی انداز میں انہیں گھورا۔

”چنوری کہیں کی! تم چل کر اماں بی کے پاس بیٹھو میں ابھی پکوزے بنا کر لاتی ہوں۔“ اور مسرت جہاں تو جیسے من کی مراد بن گئے پوری ہو جانے پر نہال ہی ہو گئیں۔ چھابوں چھان برستامینہ۔ درختوں کے مکھڑھو جو کر زمین کو سیراب کر رہا تھا۔ پرندے کچھ دیر لطف اٹھانے کے بعد اب شاید اپنے گھونسلوں میں دبک گئے تھے کہ آسمان پر سوائے خنداؤں کے اور کچھ نہ تھا۔ ہاں دھرتی کے رنگ نکھر کر اپنی نیرنگیاں بکھیرنے لگے تھے۔

”اماں بی! بارش میں نہانے کو جی چاہ رہا ہے۔“ مسرت جہاں اٹھا کر بولیں۔

”بیٹا! سادوں کی پہلی بارش ہے آسمان کی ٹیل اٹارنے کو ہوتی ہے۔ اگلی بار خوب دل بھر کے نہانا۔ یہ بارش تو سویتا ریاں لاتی ہے۔“ اماں بی کے تھکاتے پرودمان گئیں۔

”اماں بی! کیا آسمان بھی میلا ہوتا ہے۔“

”ہاں! کیا بارش سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ کیسا تھا اور اب دیکھو کیسا ہے؟“ اماں بی کے کہنے پر انہوں نے غور سے دیکھا تو قائل ہو گئیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں بی! اب آسمان صاف لگ رہا ہے۔“

”اماں بی! رات کے کھانے میں بیٹھ کر کیا بتایا جائے؟“ بھابی مقسوم اماں بی کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

”ارے بیٹا! جو دل چاہے بناو۔ میرے شا کر اور اظہر تو کھیر پسند کرتے ہیں۔ باقی سب سے بھی پوچھو۔“

”اماں بی! کھیر ہی ٹھیک ہے سبھی شوق سے کھائیں گے۔“ شینا بھابی ہاتھ میں پکوزوں کی پلیٹ تھامے آگئی تھیں۔

”پھلو! پھر تیاری کرتے ہیں۔“ بڑی بھابی اٹھ گئیں۔ اماں بی بھی مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن مسرت جہاں وہیں کرسی پر بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ بارش انہیں یونہی لگتی تھی جیسے آسمان کوئی غنی تھا جو بنا مانگے اپنے دامن کے موتی لٹا رہا تھا۔ وہ برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئیں اور ہاتھ کا دامن پھیلا کر وہ موتی سمیٹنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اسی بل بلیک لینڈ کروزر گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ پورچ میں آ کر بی اور اس میں سے شبیر حسین اپنے شاہانہ طعراق کے ساتھ باہر نکلے۔

”بیٹا رانی! آپ یہاں بارش میں کیا کر رہی ہیں۔“ یہ ان کا مخصوص انداز تھا۔

”وہ ابا میاں! موسم بہت اچھا تھا اس لیے یہاں کھڑے سو رہی تھی۔“

انہوں نے جواب دیا تو وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئے۔ سرت جہاں بھی پھر وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں۔ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شاید وہ موسم کی ٹھنڈک اپنے وجود میں اتار چکی تھیں۔



اس کی آنکھ کسی کھٹکے سے کھلی تھی۔ چند ٹائیوں کو تو اسے احساس ہی نہ ہوا کہ وہ کہاں ہے۔ اجنبی اور نامانوس جگہ۔ وسیع و عریض بیڈ پر کبیل اوڑھے اس کا وجود ایک پل کو اسے خود بھی بیگانہ سا لگا۔ ماحول میں کچھ ہلچل تھی۔ کوئی چہل پہل تھی۔ چند نسوانی آوازیں تھیں۔ جو غالباً ساتھ والے کمرے سے آرہی تھیں کیونکہ جس کمرے میں وہ تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

”اما۔ آپ روٹی کو سمجھالیں اس نے پھر میرا چین نکال لیا۔“ ایک آواز آئی قدرے بھنبھلاتی ہوئی۔

”اوہو بیٹا! اس میں لڑنے والی تو کوئی بات نہیں۔ الماری میں دیکھو۔ شاید کوئی چین رکھا ہو۔“

بہت برہ یارنی سے جواب دیا گیا۔

”اما جھگڑے کی بات نہیں۔ بات اصول کی ہے۔ جب وہ خود اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائے دیتی تو میری چیزیں کیوں ادھر ادھر کرتی ہے۔“ وہ آواز بنور غصے کا اظہار بنی ہوئی تھی۔

”نھیک ہے! اب بند کرو صبح صبح اس طرح لڑنا۔ سمجھا دوں گی اسے میں۔ تم آکر ناشتہ کر لو کالچ سے دیر ہو جائے گی۔“ جواب میں قدرے خاموشی چھا گئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ماں کی بات مان لی گئی تھی۔ وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی۔ ابھی تک اس گھر کے مکینوں میں سے کوئی بھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس گھر کے لوگ اسے کسی بے جان شے کی طرح اس کمرے میں رکھ کر بھول گئے تھے۔ کس قسم کے لوگ تھے؟ وہ نھیک طرح جان نہیں پاتی تھی۔ اتنا اسے یاد تھا کہ ان سب کے رویوں میں اس کے لیے سختی اور اجنبیت نہیں تھی۔ ملائمت اور اپنائیت تھی اور یہی احساس اس کے اندر سکون، وقتی سکون بن کر اترتا تھا۔ اور طویل مسافت کے بعد جس نے اس کے جسم سے زیادہ اس کی روح کو تھکا یا تھا۔ اسے نیند آگئی تھی۔ کل کیا ہونا تھا؟ کل کیا ہو سکتا تھا؟ سب کچھ وقتی طور پر بھلا کر وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔

”ارے! تم کب سے جاگ رہی ہو؟“ فربہ بی مائل خوبصورت سی خاتون اس کے قریب آئیں۔

شاید یہ انہی کا کمرہ تھا جہاں وہ براجمان تھی۔

”میں۔۔۔ میں تو کافی دیر سے جاگ رہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ انھہ کر بیٹھ گئی تھی۔

”اوہو سوری بیٹا۔ دراصل صبح صبح میری بینیاں گھر کو میدان کا رزدار بنائے ہوئے ہوتی ہیں۔ سب کچھ بھول جاتا ہے کیا کرتا ہے۔ کیا نہیں کرتا۔ ایک منٹ باتیں بعد میں مجھے یقین ہے تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ وہ سامنے واش روم ہے تم فریش ہو جاؤ میں اتنی دیر میں ناشتہ لے آتی ہوں۔“ وہ کمرے سے

باہر نکل گئیں۔ آریان کبیل ایک طرف پھینک کر اٹھ گئی۔ ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو مکینوں کی امارت اور خوش ذوقی سے مرعوب سی ہو گئی۔ ہلکے سرمئی رنگ کی ٹائز کے ساتھ ہاتھ روم فٹنگ۔ واش بیسن۔ چیئر کموٹ۔ ہاتھ ڈب ہر چیز ہلکے سرمئی رنگ کی تھی۔ اس نے واش بیسن کے ساتھ لگے بڑے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ گلابی رنگت صرف ایک دن اور رات میں ہی مرجھا کر سرمیوں کے پھول سی ہو گئی تھی۔ سیاہ بالوں کی ابھی ہوئی ٹیس چہرے کے گرد بے ترتیبی سے جھول رہی تھیں۔ پیشانی پر دائیں طرف ہنڈوؤں سے تھوڑا اوپر زخم کی جینڈا جگ تھی۔ اس نے ہلکے ہلکے دو چار چھپکے سے مارے بال سمیٹ کر یونی جوڑا سا باندھ لیا اور تولیے سے منہ خشک کرتی ہاتھ روم سے باہر آگئی۔ سامنے ہی وہ خاتون ناشتے کی ٹرے بیڈ پر سجائے اسے محو انتظار ملیں۔

”آؤ! بیٹھو اور تکلف برطرف رکھ کر ناشتہ کرو۔ فہدی ابھی تھوڑی دیر میں آئے گا تمہیں چیک کرنے کے لیے۔ ویسے وہ رات بھی کہہ رہا تھا کہ کوئی ایسی میجر انجری نہیں ہے۔ جلدی امپرو و کر لو گی تم۔“ وہ بولتے بولتے یکدم رک گئیں پھر کچھ سوچ کر وہ بارہ گویا ہوئیں۔

”میرا خیال ہے کہ جب سے تم جاگی ہو اس وقت سے مسلسل میں ہی بولے جا رہی ہوں تم نے کیا نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے؟“ وہ اب مسکرا رہی تھیں۔

”آئی! میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ کیا کہوں۔ یوں بھی آپ بولتی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔“ اس نے ان کی جانب مسکرا کر دیکھا تھا۔ جاتے کیوں ان کی موجودگی اور ان کی باتوں کی وجہ سے وہ خود کو کسی حد تک ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

”ہوں! تو باتیں کرنے کا مگر جانتی ہو۔ ویسے میری رویہ تہبازی طرح ہے۔ خاموش خاموش۔ سلجھی بلکہ کبھی کبھی کچھ ابھی ابھی لیکن اس سے چھوٹی ایفہ تو ایسی ہے جیسے کسی باتیں کرنے والے کھلونے کو چابی دے کر چھوڑ دیا جائے۔“ وہ بہت محبت بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ آریان کی پکلوں پر نمی سی دم توڑ گئی۔

”اماں! تم۔۔۔ تم بھی تو یونی پیار کرتی تھیں مجھ سے۔ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھلانے سے لے کر تعلیم کے میدان تک میرے بمقدم رہیں۔ پھر۔۔۔ پھر آخر۔۔۔ اب کیوں دوریاں حائل ہو گئیں ہمارے درمیان۔ کیوں تمہاری محبت بھری آنکھیں مجھے نظر نہیں آتیں۔ تمہاری مانتا بھری آنکھوں کیوں دور ہو گئی مجھ سے۔“ نوالہ جیسے اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ بالکل ایسے کہ اسے لگا کہ بس اس کی آخری سانسیں ہیں۔ شینا پھپھو کی نظریں اس کے چہرے پر پڑیں۔

”ارے۔۔۔ ارے تمہیں کیا ہوا۔“ تیزی سے سرخ پڑتی رنگت اور آنکھوں سے بہتے پانی نے انہیں بوکھلا دیا۔ ان کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا لگا اس پانی کا بھر کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ ایک دو گھونٹ پی

کراہنے لگی۔ آنسوؤں کے گولے کو حلق سے نیچے کیا لیکن چہرے کے تاثرات بدستور ویسے ہی تھے۔
 ”دیکھو بیٹا! تمہیں جو پریشانی ہے ہم سے کہو یقین کرو ہم تمہاری پوری مدد کریں گے لیکن تم تنہا اس طرح پریشان ہوتی رہو گی تو بھلا کیا حاصل؟“
 ”ہینا پچھو جیسے اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولیں۔ لیکن اس کی کہانی ایسی ہی تھی جو اس کے دریدہ دل میں ہی پنہاں رہتی تو اچھا تھا۔ وہ ڈوب رہی تھی۔ اس لیے تنکے کا آسرا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا دماغ مسلسل ادھیر بن میں لگا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ یہاں مستقل طور پر رہنے نہیں آئی تھی۔ اسے سوچنا تھا کہ آگے کیا قدم اٹھایا جائے کہ وہ حادثہ زمانہ سے محفوظ ہو جائے۔ فی الحال تو یہی پناہ ہی اس کے لیے غنیمت تھی۔

”نہیں آنٹی! کوئی پریشانی نہیں۔“ وہ جبراً مسکرائی۔ ”دراصل آپ کی باتیں سن کر مجھے اپنی ای کی یاد آگئی تھی۔“

اس کی بات پر انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ وہ مہربان آنکھوں والی عورت ساری رمزیں جانتی تھی۔ ضرور اس لڑکی کے بیک گراؤ میں کوئی ایسی بات تھی جو یہ اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے نکلا رہی تھی لیکن وہ اصرار کر کے اس کے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتی تھیں۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا ڈاکٹر فواد اپنی حیرانگیز شخصیت کے ساتھ دروازے میں موجود تھے۔

”ارے فہدی! میرے کمرے میں آنے کے لیے تمہیں اجازت کی ضرورت اب سے پڑنے لگی۔“
 ”پچھو! اب یہ صرف آپ کا کمرہ نہیں ہے ناں!“ انہوں نے آنکھوں سے آریاں کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

”دیکھو بھئی! میرے کمرے میں کوئی اجنبی نہیں ہے۔ آریاں بھی روپیہ، انیقہ کی تیسری بہن ہے مجھے۔“ انہوں نے محبت سے کہا۔ آریاں کا سر جھکا ہوا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس پل ہینا پچھو کے چہرے پر جو خوبصورت تاثر سمنا ہوگا۔ وہ دیکھ کر ماں کی ہوک کم ہو جائے گی۔

”ذرا اپنی نفیس چپک کر دیکھئے۔“ جیسے ہوئے سر کے سامنے بھاری مردانہ ہاتھ نظر آیا۔ اس نے خاموشی سے وہاں ہاتھ آگے کر دیا۔ ان کی انگلیاں اس کی کلائی پر متحرک ہوئیں تو ایک لمحے کو وہ حیا آمیز جھجک کا شکار ہو گئی۔ ان کی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں۔

”شی از پر فیکلٹی آل رائنٹ پچھو!“ وہ ہینا پچھو سے مخاطب تھے۔

”فہدی! ذرا اس کا زخم بھی دیکھ لو۔“ پچھو کے کہنے پر انہوں نے آگے بڑھ کر جینڈا کھول دی۔ خون میں تر روئی کو نہایت احتیاط اور نرمی سے زخم سے الگ کیا۔ چیشانی پر ایک انچ لمبا اور تقریباً دو سینٹی میٹر گہرا زخم کا نشان تھا۔ خون رسنا بند ہو چکا تھا۔ انہوں نے نیوب نکال کر زخم پر دوا لگائی۔

”پٹی کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ نیوب رکھ لیں۔ دن میں تین چار بار لگائیں گی تو ایک آدھ دن میں کافی بہتر ہو جائے گا۔ اچھا پچھو میں کلینک چلوں۔ دیر ہو رہی ہے۔“ وہ پہلے آریاں سے پھر پچھو سے بات کر کے باہر نکل گئے۔ آریاں اس سارے عرصے میں خاموش رہی تھی۔ پچھو ہینا بھی اسے لینے کی تلقین کرتی ہوئی برتن اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ کمرے میں اب وہ تھی یا پھر ببولوں کی طرح چکراتا ہوا اس کا ماضی، عفریت کی طرح منہ کھولے سامنے کھڑا حال اور بے اماں مستقبل۔



آج ”سادات نگر“ میں جیسے رنگ ہی رنگ اترے ہوئے تھے۔ مسرت جہاں نے فرسٹ کلاس پوزیشن لی تھی میٹرک میں۔ اماں بی کے تو فخر کے مارے پیر ہی زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ ان کی آنکھیں جھگڑا رہی تھیں اپنی ہونہار بیٹی کی کامیابی پر۔ بھائی الگ بے حد خوش تھے۔ سوئے اتفاق سب ہی گھر پر موجود تھے۔ شام کی چائے کے انتظار میں سب درختوں کے نیچے کرسیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ جب کرمو نے کوئی رجسٹری لاکر مسرت جہاں کے ہاتھ میں تھمائی۔

”چھوٹی بی بی! باہر ڈاکے نے یہ کاغذ دیا ہے اس پر دستخط کر دیں۔“ مسرت جہاں نے دستخط کر کے وہ کاغذ اسے تھمایا اور ابھی لفاظی کھولنے ہی لگی تھیں کہ شا کرنے اچک لیا۔ لفاظی کھول کر مارکس شیٹ پر نظر دوڑائی۔
 ”جج..... جج..... پانچ بھائیوں کی لاڈلی بہن، اور اس بری طرح فعل..... افسوس صد افسوس..... ہماری تو ناک کنوا دی تم نے۔“ سنجیدہ صورت لیے وہ مسرت جہاں سے ہمکلام تھا۔

”کیا مطلب.....؟“ اچھے اچھے پیر ہوئے تھے میرے۔ مجھے دکھائیں مارکس شیٹ۔“ ”دور وہاں سی ہو کر بولیں اچک اچک کر خود سے دھنٹ لے مارکس شیٹ چھیننے کی کوشش کرنے لگیں۔

”ارے کیوں ہماری بیٹا رانی کو ستاتے ہو۔“ ہتا دو کیا نتیجہ نکلا؟“ ابامیاں کی مداخلت نے شا کر حسین کو مزید شرارت سے باز رکھا اور انہوں نے مصنوعی روئی صورت بنا کر مسرت جہاں کے ہاتھ میں دے دی۔ مارکس شیٹ پر نگاہ ڈالنے کے بعد پہلے تو مسرت جہاں کی آنکھیں مسرت سے پھیلیں یوں کہ ریجک کر کانوں سے جا لگیں۔ پھر ایک فلک شگاف جج ان کے شکر فی ہونٹوں سے بلند ہوئی۔ کاغذ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور پھر جو انہوں نے چہکوں چہکوں روٹا شروع کیا تو مانو اماں بی اور بھائیوں کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

”ارے بچی! رہنے دو کوئی بات نہیں۔ پھر امتحان دے دینا یوں رونے سے بھلا اب کیا حاصل!“ اماں بی اس کا سر سینے سے لگائے تسلی آمیز انداز میں کہہ رہی تھیں۔

”ارے اماں بی! کیوں دل چھوٹا کرتی ہیں۔ ہم نے تو پہلے ہی عرض کی تھی کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ آپ ہی کو شوق چڑایا تھا۔“ اظہر بھائی نے چھیڑا تو مسرت جہاں نے شاکی نظروں سے ان کی

طرف دیکھا اور تنگ کر بولیں۔

”یہ آنسو غم کے نہیں خوشی کے ہیں۔ دشمن جلتے رہیں۔ اماں بی ہم پاس ہو گئے ہیں ساڑھے آٹھ سو میں سے ساڑھے چھ سو نمبر لیے ہیں۔“ وہ اظہر بھائی کو زبان دکھا کر چڑا رہی تھی۔ اماں بی تو خوشی سے نہال ہو گئیں۔ جھٹ سے بڑھ کر ان کی پیشانی چوم لی۔ ابامیاں نے اسی وقت جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ان کے ہاتھ پر دھرا۔ شفقت بھائی اور عابد بھائی دونوں زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ باہر بھائی نے کہا کہ جوان کی لاڈلی بہن فرمائش کرے گی وہ پوری کریں گے۔

”تو ٹھیک ہے باہر بھائی! مجھے کانچ میں ایڈمشن دلا دیں۔“ مسرت جہاں دلار سے بولیں تو باہر بھائی ایک لچک خاموش ہو کر ابامیاں کی صورت دیکھنے لگے۔ جن کے چہرے پر مسرت جہاں کی فرمائش سن کر سنجیدگی سی طاری ہو گئی تھی۔ گھر بھر میں میٹرک سے آگے صرف اظہر بھائی اور شا کر ہی گئے تھے۔ اب مسرت جہاں بھی اس میدان کارزار میں اترتا چاہتی تھیں۔ اماں بی بھی کچھ خاموش نگاہوں سے مسرت جہاں کو دیکھنے لگیں۔

”کیا ہوا؟“ ابامیاں کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔ ابامیاں! اتنے اچھے مارکس آئے ہیں میرے، کسی بھی اچھے کانچ میں آسانی سے ایڈمشن مل جائے گا۔“

”بات یہ نہیں ہے بیٹا جی! ہم جانتے ہیں کہ آپ کا ذہن بہت اچھا ہے۔ تعلیمی ریکارڈ بھی قابل تعریف ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ ابامیاں کے حتمی انداز نے ہل بھر کو ماحول پر سکوت طاری کر دیا۔ مسرت جہاں کو تو جیسے سانپ سو گھ گیا۔ شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ ابامیاں یہ فیصلہ صادر کریں گے۔

”لیکن کیوں ابامیاں؟“ بہت دھیمی آواز میں انہوں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

”اس لیے کہ بیٹیاں گھر کی چار دیواری کے اندر اچھی لگتی ہیں۔“ ابامیاں یہ کہہ کر اٹھ گئے تھے اور اپنے ساتھ ساتھ خوشیوں کے سارے رنگ بھی سمیٹ کر لے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ کرسیاں خالی ہونے لگیں۔ مقسوم بھابی اور شینا بھابی اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔ اظہر بھائی کسی دوست سے ملنے نکل کھڑے ہوئے اور شا کر اپنے کمرے کو چل دیا۔ اب وہاں صرف اماں بی تھیں یا پھر باہر بھائی۔ مسرت جہاں نے عجیب سے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”اماں بی۔ ابامیاں کیا سمجھتے ہیں مجھے۔ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ پڑھ لکھ کر میں اس خاندان کی ذلت کا باعث بنوں گی۔ اماں بی۔ کیا میں نہیں جانتی کہ کن حدود کا تعین کیا گیا ہے ہمارے خاندان میں لڑکیوں کے لیے۔“ وہ بولتی ہوئی ان کے قریب نیچے بیٹھ گئیں ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”اماں۔ مجھے اجازت لے دیجئے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کبھی ان حدود کو پار نہیں کروں گی جو

میرے لیے مقرر کی جائیں گی۔ پلیز اماں بی۔ ابامیاں کو منالیں۔“ ان کے لہجے اور آنکھوں میں التجا تھی۔

”بیٹا! تم اچھی طرح جانتی ہو تمہارے ابامیاں ایک بار جو فیصلہ کر لیں کبھی اس سے ہٹتے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے کچھ سوچ کر ہی ایسا کہا ہوگا۔ ورنہ وہ تمہارا دل کبھی نہیں دکھا سکتے۔“ انہوں نے مسرت جہاں کو سمجھانا چاہا۔

”اماں بی۔۔۔۔۔ صرف ایک بار کوشش کر کے دیکھیں۔ ممکن ہے آپ کی بات مان جائیں وہ۔“ مسرت جہاں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

”ٹھیک ہے۔ ایک بار بات کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ باہر بھائی بھی مسرت جہاں کے ہموار بن گئے۔ اماں بی خاموشی سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن ان کا ذہن کہہ رہا تھا کہ لفظ رائج کیا جائیں گے۔ وہ ان کے شریک حیات تھے۔ زندگی کی بتیں، تینتیس بہاریں ان کے سگ دیکھی تھیں انہوں نے۔۔۔۔۔ ان سے زیادہ بہتر بھلا کون جان سکتا تھا کہ شبیر حسین جس قدر نرم دل رکھتے تھے اندر سے چٹان کی طرح سخت اور مضبوط تھے۔ ان کے فیصلے شروع سے ہی مقدم جانے جاتے تھے۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ کوئی فیصلے میں ترمیم کی خواہش کرتا یا ان کی ماننے میں کوئی عذر لگ گھڑتا۔ خود اماں بی نے بھی ان کے جلال کو آواز دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جو کچھ انہوں نے کہا فوراً تسلیم کر لیا۔ شاید اسی لیے ان کی اچھی نہی تھی لیکن اب مسرت جہاں کی فرمائش سن کر وہ محضے میں پڑ گئی تھیں۔ اتنا تو وہ جان گئی تھیں کہ جو فیصلہ انہوں نے کر لیا ہے وہ بدلے گا نہیں۔ لیکن بیٹی کا دل رکھنے کی خاطر انہوں نے ابامیاں سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب سب اپنے اپنے کمروں کو سدھار گئے اور ابامیاں حسب معمول کچھ دیر کے لیے اسٹڈی روم میں جا بیٹھیں تو اماں بی بھی ان کے پیچھے اسٹڈی روم میں چلی آئیں۔

”کیا بات ہے زہرہ خاتون۔۔۔۔۔ آپ کچھ پریشان ہیں۔“ ابامیاں نے خاموش بیٹھی اماں بی سے پوچھا۔ ان کے اس طرح آکر بیٹھ جانے اور بات نہ کرنے سے ابامیاں یہ تو سمجھ گئے تھے کہ انہوں نے کوئی بہت اہم بات کرنی ہے لیکن ان کی ناراضگی یا غلطی کے ذرے کہہ نہیں رہیں۔

”آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟“ انہوں نے جیسے حوصلہ آمیز انداز اپنایا۔

”شاہ جی! ساری زندگی آپ نے جو کہا۔۔۔۔۔ میں نے تسلیم کیا۔ کبھی آپ کی کسی بات کسی حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کی۔“

”تو آپ کو تجدید کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔“ ابامیاں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

”اس لیے کہ آج پہلی بار آپ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔ سوچتی ہوں ایسا نہ ہو کہ دست سوال دراز کرنے کے بعد خالی لوٹ آنے کا چھٹا داخل جائے۔“

”کیا مطلب؟“ کیا آپ ہم سے کوئی ایسی چیز مانگنا چاہتی ہیں جس کی قدرت ہم نہیں

رکھتے۔" ابا میاں سیدھے ہو بیٹھے تھے۔ کتاب جو ان کے ہاتھ میں تھی انہوں نے بند کر کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی اور پوری طرح اماں بی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"نہیں قدرت تو رکھتے ہیں۔۔۔ لیکن شاید وہ چیز آپ دینا نہ چاہیں۔" اماں بی کا انداز انہیں الجھائے جا رہا تھا۔

"زہرہ خاتون! یہ آج آپ کس انداز میں بات کر رہی ہیں۔ جو بھی کہنا ہے کہہ دیجئے۔ یقین جانے اگر اس چیز پر ہمارا اختیار ہوا۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی جرأت ہم میں ہوئی تو بخدا انکار نہیں کریں گے۔"

"میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مسرت جہاں زمانے کی اونچ نیچ، اپنا اچھا، برا سمجھتی ہے۔ عزت، ذلت کا خیال رکھ سکتی ہے۔ اس کی آرزو ہے کہ اسے آگے بڑھنے دیا جائے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس میں ایسی قباحت بھی نہیں۔ آخر لوگوں کی بیٹیاں سکولوں کالجوں میں پڑھ ہی رہی ہیں۔"

"ان لوگوں میں اور ہم میں بہت فرق ہے زہرہ خاتون! ہم آل نئی اولاد ملی ہیں۔ جن کی مستورات نے سورج سے بھی پردہ کیا تھا۔ ہم کس طرح مسرت جہاں کو کھلے منہ کاٹ آئے جانے کی اجازت دیں۔ ہم ان کی اس بے پردگی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے پڑھنا ہے تو ہم انہیں کتابیں منگوادیں گے۔ گھر بیٹھ کر پڑھیں اور پیچھے رہیں۔"

"شماوتی! کانٹا میں جا کر پڑھنے اور خود تیاری میں بہت فرق ہے۔ پھر وہ جو مضامین لینا چاہتی ہے وہ ایسے گھر بیٹھے نہیں پڑھ سکتے۔"

"زہرہ خاتون! زندگی کے اتنے سال گزار کر بھی آپ سمجھ نہیں پائیں کہ ہمارا مزاج کیا ہے؟ ہم کیا چاہتے ہیں۔ افسوس صد افسوس ہم اور اب کیا کہہ سکتے ہیں جب زندگی کا ساتھی ہی سمجھ نہ پائے۔"

انہوں نے میز پر سے کتاب اٹھائی تھی۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں کرتا چاہتے۔ اماں بی تو پہلے ہی جانتی تھیں کہ وہ اپنا فیصلہ کسی حور نہیں بدلیں گے۔ وہ خاموشی سے ان کے پاس سے اٹھ گئیں۔ کچھ دیر بعد مسرت جہاں کے پوچھنے پر کیا کہیں گی؟ اپنے کمرے میں آتے ہوئے انہوں نے مسرت جہاں کے کمرے کی جتنی جلتے دیکھی تھی۔ وہ ان کے دل کی بے چینی کو جان گئیں۔ مسرت جہاں کی اس شخص اور پڑھائی کی شوقین بھی۔ خود اماں بی داہی سا پڑھی لکھی ہوئی تھیں لیکن تعلیم کے حصول کو بڑا نہیں سمجھتی تھیں۔ پھر اب تو زمانہ بدل گیا تھا۔ بیٹا اور بیٹی دونوں کو مساوی حقوق دیئے جا رہے تھے۔ پھر ان کے گھر میں بیٹی کے لیے الگ سے قوانین کیوں وضع کیے جا رہے تھے۔ رات ایسی ہی سوچوں میں گزر رہی تھی۔ جانے کس گھڑی پلک سے پلک لگی۔ اذانوں سے کچھ دیر بعد میں آنکھ کھلی۔ وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ سنبھل کر رہی تھیں۔ جب دروازے سے مسرت جہاں داخل ہوئیں۔

سفید قمیض شلوار پر بڑا سا اندرین ملل کا دوپٹہ اوڑھے وہ اجلی نکھری صبح کا ہی حصہ لگ رہی تھیں۔ بالوں کی تیس دوپٹے کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔

جانے کیوں اماں بی کو ان کے چہرے پر پھیلے رنگ کچھ پھیکے اور ملال میں ڈوبے ہوئے لگے۔ ایک ہی شب جانے کون سی سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھ کر ان کے معصوم چہرے نے سنجیدگی کی دیوار چادر اوڑھ لی تھی۔ شرارت سے چمکتی آنکھیں کچھ بھٹی بھٹی لگیں۔

"بیٹا رانی! وہاں دروازے کے پاس کھڑی کیا کر رہی ہو؟ یہاں آؤ میرے پاس۔" انہوں نے بہت پیار سے کہا تو مسرت جہاں نے ایک پل کو سہاٹا کر ان کی سمت دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے کچھ قدم اٹھاتی ان کے قریب آ گئیں۔ جیسے وہ کالج کی بیٹی ہوں اور پتھر ملی زمین پر چھنا پڑ گیا ہو۔

"یہاں بیٹھو میرے پاس۔" اماں بی نے جانے نماز سمیٹ کر وہیں اپنے قریب ہی تختے پوش پر ان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ وہ خاموشی سے اماں بی کے پاس بیٹھ گئیں۔

"بیٹا! کیا ناراض ہو گئیں مجھ سے؟"

"نہیں اماں بی! ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ نے ایسا کیوں سوچا؟" مسرت جہاں نے ان کے خیالات کی تردید کی۔

"بیٹا! تم نے تو پوری کوشش کی لیکن تمہارے ابا میاں جب ایک بار کچھ کہہ دیتے ہیں تو پھر اس پر سے ایسا بچاؤ اٹھرا دھرتیں ہو۔ ان کا اقرار، اقرار ہوتا ہے اور انکار کا مطلب انکار۔"

"اماں بی! آپ مجھے وہ بات کیوں سمجھا رہی ہیں۔ جو پہلے سے میرے علم میں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں مانیں گے۔"

"تو پھر بیٹا یوں دل چھوڑ نہ کرو۔ وضو بولو۔ جیسے پہلے خوش رہتی تھی اسی طرح۔" اماں بی کے کہنے پر ایک پھٹکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر کر معدوم ہو گئی۔

"اماں بی! میرا ایک خواب تھا میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ اور خواب ہی تو زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ مجھے کم سے کم اپنے خوابوں کے ٹوٹنے پر اداس تو ہونے دیں۔" ان کی بات سن کر اماں افسردہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بیٹا! میرے اختیار میں ہوتا تو تمہارے خواب ٹوٹنے نہ دیتی۔ تمہارے ابا میاں کی سوچ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ وہ باہر کا ماحول دیکھتے پرکھتے ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسی لیے مستقبل کی پریشانی سے بچنے کی پیش بندی کرتے ہیں۔ تم بھی یہ سوچ لو کہ ان کا یہ فیصلہ شاید تمہارے حق میں اچھا ہو۔" وہ بے دلی سے اماں بی کی باتیں سن کر وہاں سے اٹھ گئیں۔ پھر آئے۔

جیسے گھسٹ گھسٹ کر گزرے تھے۔ مسرت جہاں کی خوش نوائیوں پر تو جیسے خزاں نے سیاہ پنچے گاڑ دیئے

تھے۔ مگر میں سنانے سے گونجنے لگے۔ جس بلبل کی لہکار سے ہر دم رونق رہتی تھی وہ خاموش ہو گئی تھی اور اس کی یہ خاموشی گھر بھر کو تشویش میں جھٹکے دے رہی تھی۔ مسرت جہاں نے نہ تو ضد کی نہ ہی رونا دھونا پچایا۔ بس غیر ضروری باتیں ختم کر دیں۔ ان کی اس نمایاں تبدیلی نے اماں بی اور ابامیاں کو بھی پریشان کیا۔

”زہرہ خاتون! مسرت جہاں آج کل کیوں چپ چپ سی رہنے لگی ہیں؟“ ابامیاں کے سوال پر انہوں نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ آپ سے زیادہ بہتر اس کا سبب کون جانتا ہے۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں ہماری طرف؟“ کیا ہم تصور وار ہیں اس بات کے؟“ ان کے دوبارہ سوال کرنے پر بھی اماں بی کچھ نہ بولیں۔ خاموشی سے بیٹھی ساگ بناتی رہیں۔

”ٹھیک ہے آپ جواب نہیں دینا چاہتیں تو ہم مسرت جہاں کو بلا کر خود پوچھ لیتے ہیں۔“ اور پھر انہوں نے واقعی اسی وقت مسرت جہاں کو بلوالیا۔

”بیٹھے بیٹا!“ مسرت جہاں ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔

”کیا ہم آپ کی خاموشی اور اداسی کا سبب جان سکتے ہیں؟“ وہ عینی نظری سے مسرت جہاں کے کھلے کتاب جیسے چہرے کا مطالعہ کرنے لگے۔ ابھی وہ اتنی سمجھدار نہیں ہوئی تھیں کہ جذباتوں اور تاثرات کو چھپا سکیں۔ ہر جذبہ آنکھوں کے آئینے پر آ کر اپنی اصل صورت حال دکھا دیتا تھا۔

”جی..... ابامیاں!“ انہیں توقع نہیں تھی کہ ابامیاں یوں بطور خاص انہیں بٹھا کر ان کی خاموشی کا سبب جانتا چاہیں گے

”ہم کہہ رہے ہیں کیا آپ ہمیں اپنی اس خاموشی کی وجہ بتائیں گی؟“

”کوئی نہیں ابامیاں! ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ کچھ نرم سی ہو گئی تھیں۔ شاید اس لیے کہ آج تک انہوں نے ابامیاں سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

”بیٹا! اولاد کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائے کتنی ہی خود مختار، کتنی ہی انڈیپنڈنٹ ہو جائے۔ ماں باپ کی نظروں میں اس کا بچپن ہی رہتا ہے۔ آپ اس وقت جھوٹ بول رہی ہیں۔ ہم یہ بھی اچھی طرح جان رہے ہیں۔ آپ نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی، ہم ان باپوں میں سے نہیں جو اولاد پر بے جا سختی کریں۔“ ان کے لہجہ میں تاسف کا ہلکا سا شائبہ تھا۔

”ابامیاں..... آپ ناراض مت ہوں۔ اصل میں میرا ایک خواب تھا۔ ڈاکٹر بننے کا خواب۔ لیکن میں آپ کے فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھاؤں گی۔ بس وقتی طور پر کچھ دکھ ہوا۔“ مسرت جہاں سادگی سے کہتی ہوئی شبیر حسین کو اتنی پیاری لگیں کہ انہوں نے جھٹ سے گوہر مقصود ان کی گود میں ڈال دیا۔

”اور اگر ہم اس دکھ کا اس رنج کا مداوا کر دیں۔“ وہ مسکراتی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھ رہے

تھے۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ہم کل ہی کالج سے آپ کے لیے فارم منگوائیں گے۔ اب تو خوش ہیں ناں۔“ ان کی بات سن کر مسرت جہاں کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ گویا ایک مژدہ جانفزا تھا جس کا حرف، حرف ان کے اندر روح بن کر اتر گیا تھا۔

”لیکن ایک بات..... اسے ہماری پہلی اور آخری نصیحت، تنبیہ یا پھر حکم سمجھ لیں کہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں ہماری عزت و حرمت کا خون شامل مت کیجئے گا۔ جس بے داغ پوشاک میں ملبوس ہیں آپ اس پر ہم ذلت کا کوئی پھینٹنا نہیں برداشت کر پائیں گے۔“ ابامیاں کے جملوں میں جانے کیا تھا کہ ایک پل کو مسرت جہاں لرز کر رہ گئیں لیکن ان احساسات پر بہت جلد خوشی کا احساس غالب آ گیا۔ گھر بھر کو خبر ہو گئی تھی کہ مسرت جہاں کو ابامیاں نے کالج میں ایڈمشن لینے کی اجازت دے دی۔ بھائیوں نے مبارکباد دی۔ سوائے عارب بھیا کے ابامیاں کے اس فیصلے کو کبھی نے سراہا تھا۔



مغنیہ کی آواز میں درد تھا، سوز تھا۔ اس کے لبوں سے تلخ حقیقت نزل نزل لفظوں کی صورت میں ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہی تھی۔ سارے ماحول پر فوسوں طاری تھا۔ وہ منچے جو آنکھوں میں شوق و ہوس کا ایک جہاں آباد کیے رقصہ کی ایک ایک جنبش کو نظروں ہی نظروں سے دل میں اتار رہے تھے۔ گانے والی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ کالے بارڈر کی کریم کلر کی ساڑھی میں لمبے سیاہ بال پشت پر دھرے، بالکل سادہ چہرے والی یہ عورت اس ماحول کا حصہ تو ہرگز نہیں لگ رہی تھی۔

اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو

اور ملے گا بھی تو اس طور کے پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشر صبح
ذخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے

اور ہر کشتہ و ماندگی آخر شب
بھول کر ساعت در ماندگی آخر شب

جان پہچان، ملاقات پہ اصرار کرے

لفظ ختم ہو چکے تھے یا شاید گویائی سے محروم ہو گئے تھے۔ رقص کرتے قدم بھی ختم گئے۔ طبلہ نواز، سارنگی نواز گونگے ہو گئے لیکن اس سراپا نازنین کے الفاظ نے ماحول پر جو فوسوں طاری کر دیا تھا وہ اسی طرح قائم تھا۔ وہ جا چکی تھی اور اس کے جاتے ہی ردشینیوں کے باوجود اندیرا سا پھیل گیا۔ جھروکے سے لگ کر گھڑی چھ سات سال کی بچی وہ سب بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس اجنبی ماحول میں اگر اس کی شناسائی کسی کے ساتھ تھی وہ صرف اور صرف اسی ساحرہ سے تھی جو ابھی ابھی محفل کو حنوط کر کے جا چکی تھی۔ پھر اس چھ سات سال کی بچی کو کسی نے نرم گرم آغوش میں لیا تھا۔ مالوں سی خوشبو تھنوں سے نکرائی تھی۔

”ماں... اس کے لبوں نے بڑے پیار سے یہ لفظ کہا تھا اور پھر پلٹ کر وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

”ماں... اس کی روح اسی لفظ کی تکرار کر رہی تھی۔ جب کسی نے اسے سمجھوڑا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

”تو... تو... کیا وہ سب خواب تھا یا میرے تحت اشعور میں چھپا ماضی عکس بن کر آنکھوں میں

طبلے پر تھاپ پڑی اور گھٹکھڑ گھنٹا اٹھے۔ سرخ قالین کے وسط میں دو گورے گورے پاؤں موسیقی پر جذب کے عالم میں متحرک ہو گئے۔ سفید چاندنیوں پر گاؤں کیے لگائے جیسے امارت کا رمب ڈالنے والے، دن کو اچلے لباسوں میں گھومنے والے اور راتوں کی سیاہی میں گناہوں سے آلودہ قفس ہونے والے تماش بین پوری طرح متوجہ ہو گئے۔ اس بازار میں جہاں عورت جس کی طرح بکتی ہے۔ اسے خریدنے والے ایسے ہی شریف ابن شریف آتے ہیں۔ عورت بے بس بھی ہے، خود مختار بھی۔ ظالم بھی ہے، مظلوم بھی۔ حاکم بھی ہے، محکوم بھی لیکن اس بازار میں جہاں دن سوتے، راتیں جاگتی ہیں عورت محض ایک کھلونا ہے۔ بگڑے ہوئے بچوں کے ہاتھوں میں تھمایا گیا ایسا کھلونا کہ جس کے نصیب میں صرف ٹوٹنا اور بار بار ٹوٹنا ہی لکھ دیا گیا ہے۔

اور کچھ دیر میں کٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے

عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری
سب ستارے سر خاشاک برس جائیں گے

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی

بے وفا کی گھڑی، ترک مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی

ترک دنیا کا سماں ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟

اتر آیا تھا؟" پھر ماں کا لمس، اس کی خوشبو کیسے اتنی شدت سے اس کے حواسوں پر حاوی تھی۔ اسے لگا جیج اس کی ماں آگئی..... ماں جو محبت کا سمندر ہے۔ ماں جو آفاقی جیج ہے۔ جس کی ماما کے آگے بڑے سے بڑا طوفان بھی ہل بھر کو ٹھہر نہیں سکتا۔ وہی ماں جس کی ممتا کے..... شجر کے نیچے سے اٹھ کر وہ امتحانوں کی کڑی تمیزاتوں میں آٹھنٹھی تھی۔ جانے کتنی آزمائشیں تھیں۔ کتنے چکر تھے اس کے پاؤں میں۔ اس کے ہونٹ خشک تھے۔ نمی سے بالکل نا آشنا۔ آنکھیں بھی پرانی پرانی سی لگ رہی تھیں۔ اس نے زبان لبوں پر پھیر کر انہیں تر کرنا چاہا لیکن اسے لگا اس کے منہ کے اندر زبان نہیں خشک لکڑی کا چٹخا ہوا ایک ٹکڑا رکھا ہوا ہے اور اس کا حلق اس چٹخے ہوئے ٹکڑے کو حرکت دینے سے معذور تھا۔

طلبہ، محنتور، رقص کرتے ہوئے سفید کبوتری سے پاؤں، سوز میں ڈوبی درد بھری آواز، لمبے گھنیرے بالوں والی پیکر حیا صورت، ماں.....

کیا وہ سب خواب تھا؟ نہیں.....! وہ خواب ہی تو نہیں تھا وہ لمس اس کے لیے نہ تو نیا تھا نہ ہی انوکھا ہاں حیات آفریں ضرور تھا۔ بوجھل بوجھل پلکوں تلے ایک ہی مہربان صورت کی شبیہ لہرا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی پلکوں پر کوئی دیدہ بوجھ آن لگا تھا۔ خود بخود اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ خیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اور اب..... اب اسے خیند سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ شاید اس کی آنکھیں خوابوں سے کترانے لگی تھیں۔ ان خوابوں میں رنگ بھی تو نہیں تھے نہ ہی امیدوں کی روشنی تھی۔ بس ماضی کے سیاہ دھبے تھے جو ان کی روشن اسکرین پر جا بجا بد صورتی کا نشان بن کر چپکے ہوئے تھے۔ وہ ان سیاہ دھبوں سے پیچھا چھڑانا بھی چاہتی تو ناممکن تھا۔ بس اس کی روح کسی زخمی پرندے کی طرح اس کے جسم کے قید خانے میں پھڑ پھڑاتی رہتی تھی اور شاید یہی اس کا مقدر تھا۔



"آریان! کیا بات ہے جینا! کیا سوچ رہی ہو؟" شینا پچھو ہاتھ میں سبزی کی نوکری اور چھری لیے کمرے میں داخل ہوئیں تو سامنے ہی اسے بیڈ پر سر جھکائے خاموش بیٹھا دیکھ کر اس کے قریب چلی آئیں۔ "کچھ نہیں آئی۔ میں نے کیا سوچنا ہے؟ بس یونہی۔" عجیب سا نالہ والا انداز تھا اس کا۔ "آریان! تم نے بتایا تھا کہ تمہارا کوئی نہیں۔ نہ امی نہ ابو نہ بہن بھائی وغیرہ..... اب تک تم کس کے پاس رہتی تھیں؟" شینا پچھو کے پوچھنے پر آریان نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ یہ وہ سوال تھا۔ جس کا کبھی نہ کبھی اسے جواب دینا ہی تھا۔ اپنی ذات کو قابل اعتبار ٹھہرانے کے لیے معاشرے میں اپنے مقام کا تعین کرنا تھا۔ وہ سنبھل گئی۔ شاید اس لیے کہ اپنی بقاء کی جنگ اسے تنہا لڑنی تھی۔

"آئی۔" بچپن سے ہی ایک رشتے کی خالہ کے ہاں رہتی تھی۔ چند دن پہلے وہ فوت ہو گئیں۔ ان کے دوسرے رشتہ دار گھر پر قبضہ جمانے کی خاطر مجھے جان سے مار دینے کے درپے ہو گئے کیونکہ وہ اپنا

گھر میرے نام کر گئی تھیں۔ سوان لوگوں سے اپنی جان بچانے کی خاطر مجھے وہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ "شینا پچھو! اس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ کیا اس کا کول وجود حالات کی ٹھوکروں کا تحمل ہو سکتا تھا لیکن پروردگار بھی جانے کیا سوچ کر اپنے بندوں پر نت نئی آزمائشوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس سے وہ انہیں رو بہ اورایتہ کی ہی طرح لگی۔

"آریان! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم ہمیشہ کے لیے یہاں رہ جاؤ میرے پاس۔ میری بیٹی بن کر۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی بے طرح یاد آ جاتا ہے۔ شاید اسی طرح اس کی یاد کا دکھ کم ہو جائے۔" شینا پچھو کی آنکھیں خلا میں جیسے کسی نقطے پر مرکوز تھیں۔ ذہن میں کچھ دھندلے دھندلے عکس واضح ہو رہے تھے۔ "آئی! کون..... کون یاد آ جاتا ہے؟" آریان کے پوچھنے پر ابھی انہوں نے جواب نہ دیا تھا کہ تائی مقسوم نے کمرے میں جھانکا۔

"ارے شینا! تم یہاں اطمینان سے بیٹھی ہو اور ادھر زاہدہ اور حدیقہ کی لڑائی ہو رہی ہے۔" انہوں نے غجلت میں کہا اور واپسی کو مڑ دیں۔ شینا پچھو نے سبزی کی نوکری اور چھری وین قریب ہی تپائی پر رکھ دی اور اٹھ کر ان کے پیچھے چل دیں۔

"بھابی! انہوں نے آگے جاتی تائی مقسوم کو آواز دے کر روکا۔ وہ رک گئیں اور پلٹ کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بھابی! کیا ہوا..... کیوں جھگڑ پڑیں دونوں؟" شینا پچھو متشکری ہو گئی تھیں۔

"ارے شینا! جانتی تو ہو ایک سیر ہے تو دوسری سوا سیر۔ جب سے حدیقہ بیاہ کر آئی ہے۔ دونوں میں بی بی نہیں۔ حدیقہ کی عادت کا بھی تمہیں پتہ ہے کیسے مرجھانے لگا کر بات کرتی ہے۔ بس اس نے زاہدہ پر طنز کیے اور وہ کھول اٹھی۔" تائی مقسوم نے بتایا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئی بڑی اماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگیں۔

"لیکن بھابی! جھگڑے کا سبب کیا ہے؟"

"میبی تمہارے کمرے میں جو لڑکی ہے..... یہی جھگڑے کا موجب ہے۔ اصل میں زاہدہ کچھ دیر پہلے باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی کہ حدیقہ پہنچ گئی۔ مہوئے ہی اس نے یہ بات کہی کہ "بھابی! فواد میاں تو جوان ہو گئے۔ خیر سے لڑکی بھگا کر لائے ہیں۔" بس یہ بات لڑ گئی زاہدہ کو۔ اس لیے کہ میں اور فہدی صبح اسے ساری صورتحال سے آگاہ کر چکے تھے۔ جانتی ہونا زاہدہ فہدی کے معاملے میں کتنی حساس ہے۔ اپنے بیٹے کے بارے میں ایسے کلمات کہاں برداشت کر سکتی تھی۔ اس نے جواب میں حدیقہ کے بھائی شرافت کا کچا چٹخا کھول کر رکھ دیا اور اب دونوں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر خاندانی حملہ کر رہی ہیں۔" وہ دونوں چلتے چلتے بڑی اماں کے کمرے تک پہنچیں۔ اندر سے آتی تیز آوازوں سے

انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ عدالت عالیہ تک پہنچ چکا ہے لیکن جج اس وقت خاموش تھا۔ البتہ متحارب مرد پتی جان سے ایک دوسرے پر کچڑا اچھال رہے تھے۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئیں۔ حدیث چچی اور زاہد و چچی دونوں ہی شدید غیض و غضب کے عالم میں ایک دوسرے کو گھور رہی تھیں کہ اگر اجازت ہوتی تو ایک دوسرے کی ٹانگہ بوٹی کر دیتیں۔ بھابی مقصوم نے آگے بڑھ کر زاہد و چچی کو کندھے سے تھاما۔

”زاہد! تم بڑی ہو۔ درگزر سے کام لو۔ چھوٹے اکثر ایسا کر جاتے ہیں۔ بڑوں کا کام ہے صبر و تحمل سے پیش آئیں۔“

”بالکل بڑوں کا کام ہے صبر و تحمل سے پیش آئیں تاکہ چھوٹے سر چڑھ کر نا چھیں۔ ارے بھابی۔ گزر بھر کی زبان ہے اس کی۔ نہ لحاظ نہ مروت۔ خدا جانے ماں نے کیسی تربیت کی ہے نہ چھوٹے کا پتہ نہ بڑے کی خبر۔ اپنی انہی عادتوں کی وجہ سے سارے خاندان سے کٹ گئی ہے۔ شا کر جیسے اچھے لڑے کو بھی خاندان بھر میں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ اب بھی کیجیے میں ٹھنڈ نہ پڑی۔“ زاہد و چچی نے سوشکا کافی کی۔

”بس بس۔ اچھی طرح جانتی ہوں میں اس گھر کے بڑوں کو۔ خرابی اپنی ادا میں ہوتی ہے اور دوسروں پر جڑھ دوڑتے ہیں۔ مینی تو آپ کی بھی ہے۔ کیا تربیت کر رہی ہیں اس کی۔ اتنی بڑے گائے کی گائے ہو گئی۔ چائے تو بنانی نہیں آئی اسے۔“ منہ یقہ چچی نے جو ابامہ کیا۔

”دیکھو حدیث! بات بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم ماں کیوں نہیں جاتی ہو کہ تمہاری غلطی ہے۔ بغیر تحقیق و تصدیق کے تم نے بات کیوں کی۔ فہدی سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ کس فیئر امنٹ کا بڑکا ہے وہ۔ وہ کوئی کھنڈہ رائین ایجر نہیں۔ ایک سلجھا ہوا۔ پڑھا لکھا۔ پروفیشنل آدمی ہے۔ کیونکہ چلا۔ ہا ہے ذمہ دار۔ آخر ہے۔ ایسی چیپ اور غیر ذمہ دارانہ حرکت کر سکتا ہے وہ؟ پھر تم نے اس کی ماں سے اس کے متعلق اس طرح بات کی تو اس کا بھڑکانا تو بنتا ہی تھا۔“ ہینا پھپھو نے سمجھانے کی کوشش کی۔ حدیث چچی بد لحاظی سے کچھ دیر سب کی طرف دیکھتی رہیں پھر تن فین کرتی کمرے سے نکلیں۔ یعنی سمجھانے کے باوجود انہوں نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔

”اماں بی! آپ کچھ کہتی کیوں نہیں اسے۔ آپ نے سر پر تہہ سار کھتا ہے۔ ہوتے ناں آج ابامیاں اچھر میں دیکھتی کہ یہ کس طرح بڑوں کے منہ لگتی ہے۔“ زاہد و چچی کا پارہ نیچے آئی نہ رہا تھا۔ اس لیے کہ حدیث چچی غلطی کر کے ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔ وہ غلطی کر کے شیر کی طرح سینہ تان کر کھڑی ہوئی جاتی تھیں کہ کر لو جو کرنا ہے اور ان کی یہی عادت گھر والوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انہوں نے آتے ہی الگ گھر کا مطالبہ کر دیا تو اماں بی نے فوراً اشاکر حسین کو گھر بٹوایا۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی معاملے میں الگ ازائے کو موجود ہوتیں۔

”زاہد! میں عزت سے ذر تھی ہوں۔ تم چاروں نے کبھی میرے سامنے زبان نہیں کھولی۔ ہمیشہ

میرا احترام کیا لیکن اس عورت کی زبان کے آگے خندق ہے۔ یہ بولتے سے سوچتی نہیں اس لیے میں اس سے زیادہ کلام ہی نہیں کرتی۔“ بڑی اماں رسان سے بولیں۔ زاہد و چچی خاموش ہو گئیں لیکن اندر ہی اندر کھول رہی تھیں۔ بھابی مقصوم اور ہینا پھپھو کے سمجھانے پر کسی حد تک وہ مان گئیں لیکن ان کے چہرے سے ناراضگی کے تاثرات بدستور مترشح تھے۔

”ہینا! کیا وہ بچی یہاں آ سکتی ہے؟ میں ملنا چاہتی ہوں اس سے۔“ بڑی اماں نے کہا۔ ”پتہ تو چلے کون ہے۔۔۔ کہاں سے آئی ہے۔۔۔ فہدی اسے کیوں لے کر آیا؟“

”کیوں نہیں بڑی اماں! آ کیوں نہیں سکتی۔ اصل میں مسئلہ یہ تھا کہ فہدی اس لڑکی کے متعلق جانتا کچھ نہیں تھا کہ یہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ آدمی رات کو تنہا سڑک پر کس لیے کھڑی تھی۔ چوٹ تو کچھ زیادہ نہیں آئی تھی۔ دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ فہدی کہہ رہا تھا کہ میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں اسے یوں تنہا سڑک پر بے ہوش پڑا چھوڑ کر آ جاتا۔ پھر خیر سے بھرا پرانہ گھر ہے۔ اس کی با آسانی عیادت اور دیکھ بھال کی جا سکتی تھی۔“

”لیکن وہ اسے ہسپتال بھی تولے جا سکتا تھا۔ وہاں اس کی زیادہ بہتر دیکھ بھال ہو سکتی تھی۔“ بڑی اماں نے کہا۔

”اس نے یہ بھی کہا کہ لے جانے کو تو میں اسے کیونک میں بھی لے جا سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ کسی اور کا نہ ہونا اس کو مشکوک بنا دیتا اور مجھے بھی۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ گھر لے چلوں۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے تم اس لڑکی کو یہیں لے آؤ۔“ ہینا پھپھو بڑی اماں کی بات سن کر کمرے سے نکل گئیں۔ کمرے میں گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ ہر نفس اپنی اپنی جگہ سوچوں کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔ چند ثانیوں پر محیط یہ وقفہ اس وقت ختم ہوا جب ہینا پھپھو کے ہمراہ وہ کوئل سی لڑکی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں موجود تینوں خواتین نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی انہی کی جانب متوجہ تھی۔ سوائس یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ قدرے زروں ہو گئی۔

”جی اماں بی! یہ آریان ہے اور آریان یہ ہماری اماں بی۔ یہ بھابی مقصوم ان سے تو کسی حد تک تمہارا تعارف ہو بھی چکا ہوگا اور یہ زاہد و۔ فہدی کی امی۔“ آریان نے تینوں خواتین کو بغور دیکھا اور پھر جیسے اس کی نگاہیں بڑی اماں کے جھریوں زدہ چہرے پر ٹپک گئیں۔ بڑی بڑی خواب ناک آنکھیں جو وقت کی ستم ظریفی سے قدرے ڈھلک گئی تھیں لیکن وقت کا ظالم ہاتھ ان کی چمک چھیننے میں ناکام رہا تھا۔ پتلے پتلے گاٹی ہونٹ اور ستواں ناک۔ سفید بالوں کو بڑے سے سفید آنچل میں چھپائے سفید چمکن کے سوٹ میں ان کا وجود اسے اس قدر مقدس اور پاکیزہ لگا کہ وہ بے اختیار چند قدم چل کر ان کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ ان کا نرم گرم گلجلی سا ہاتھ اپنے سر د ہاتھوں میں تھام کر

آنکھوں سے لگا لیا۔ یوں لگا جلتی ہوئی آنکھوں پر کسی نے برف کی ذلی رکھ دی ہو۔ بڑی اماں عالم حیرت میں اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ اس کا یہ طرز عمل ان کے لیے بالکل غیر متوقع اور عجیب سا تھا لیکن وہ بولیں کچھ نہیں۔ شاید وہ منتظر تھیں کہ آریان کچھ کہے۔

”بڑی اماں! کیا آپ مجھے بھی بڑی اماں کہنے کی اجازت دیں گی؟“ یہ سوال تھا یا اس کے زخمی وجود سے نکلی کراہ، اس کی محرومیوں کا آئینہ جو بڑی اماں کے درومند دل میں ترازو ہو گیا تھا۔

”ہاں بچی! کیوں نہیں۔ شوق سے کہو میں تمہاری بڑی اماں ہوں۔“ ان کا خلوص لفظوں میں ڈھل کر لبوں سے آزاد ہوا تو جیسے اسے سکون سا آ گیا۔

”بس! مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ بڑی اماں! میں نے زندگی میں اوپر والے سے کچھ مانگا تو صرف رشتوں کا غرور مانگا اور آج آپ نے مجھ سے یہ رشتہ جوڑ کر میری تمنا پوری کر دی۔ اوپر والے نے میری دعا مستجاب کر دی۔“ عینا پھپھو نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ کل سے اب تک یہ پہلی طویل بات تھی جو اس نے کی تھی۔ اس کی بات کے جواب میں پھر بڑی اماں کچھ نہیں بولی تھیں۔ اس لیے کہ جب اسے اپنا لیا تھا تو پھر یہ جان کر کیا لینا تھا کہ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ وہ اب ان کی تھی، ان کے پاس رہنا تھا اسے۔ ان سب کے لیے یہی کافی تھا۔



آج اسے اس گھر میں تیسرا دن تھا۔ روبیہ اور انیقہ تو اس سے ایسی دوستی ہو گئی تھی جیسے وہ شروع سے ہی ان کے ساتھ رہتی آرہی ہو۔ روبیہ اور وہ تقریباً ہم عمر ہی تھیں۔ جبکہ انیقہ چھوٹی تھی۔ چھوٹی تو تھی لیکن ہرئ مرتب۔ اس وقت وہ تینوں لان کے گھاس پر براجمان تھیں۔ موسم نے یکدم ہی بے وفا محبوب کی طرح رنگ بدلا تھا۔ صبح سے کڑکتی دھوپ کی تمازت سے جھپٹتے دیوار و دراب آسمان کی عنایت پر کچھ پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔ بولے بولے چلتی ہوا اور خستوں اور پودوں کے پتوں سے سرگوشیاں کرتی ان کئی کبھی آجارتی تھی۔ یہ تینوں پھولوں کے کنبے کے قریب بیٹھی تھیں ان سے قدرے فاصلے پر بیٹھی ان جیمز پر گھر کی دیگر نوآئین چائے پینے اور خوش پیوں میں مصروف تھیں۔

”ویسے آریان آپی! آپ نے اب تک ہمارے گھر کے افراد کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔“ انیقہ نے شریعہ بوا کی اٹھیلی سے ماتھے پر جھول آنے والی لت کو انگلی سے پیچھے کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس کے سوال پر ایک پھٹکی سی مسکراہٹ آریان کے لبوں پر در آئی۔

”کیا بہت ضروری ہے؟“ سوال کے جواب میں اس نے الٹا سوال کر دیا۔

”بالکل! جب ہم کسی خاص ماحول میں یا چند افراد کے درمیان میں رہتے ہیں تو خود بخود ہمارا ذہن وہاں کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتا ہے مثبت یا منفی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ کے

ذہن میں بھی رائے محفوظ ہے اس وقت۔“ انیقہ فلسفیانہ انداز میں گویا ہوئی۔

”خدا انیقہ! اپنا فلسفہ بول کر بلا وجہ دماغ پلپلا کرنے کی کوشش مت کرو۔ اچھا خاصا موسم ہے اور بہت ہی اچھا موڈ بھی۔ دونوں غارت ہو جائیں گے۔“ روبیہ اس کی باتوں سے اکتا کر بولی۔

”آریان آپی! ازل سے ہی بے چارے فلسفیوں کے ساتھ ایسا ہوتا آیا ہے۔ خواہ وہ جبران ہو یا سقراط۔ دکھ کا زہر پلاتے ہیں اسے یہ زمانے والے۔ کوئی قدر نہیں ٹیلنڈ لوگوں کی یہاں۔“ مصنوعی سرد آدھ بھر کے انیقہ نے کہا تو آریان مسکراتے لگی۔

”دیکھو بھئی! سیدھی سی بات ہے نہ تو ہم فلسفی کی بکریاں ہیں کہ تمہاری باتیں سن کر دماغ کا خانہ خالی کر دیں اور نہ ہی تم کوئی اتنی بلند پایا فلسفی ہو جس کا کہا ہوا اتنا قیمتی ہو کہ ہم اپنا وقت ضائع کرتے پھریں۔“ روبیہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے! ناپک چینیج کیے لیتے ہیں۔ آریان آپی نے تو اپنی رائے نہیں دی۔ البتہ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنی رائے سے اس بیماری سی لڑکی کو جواب ہماری آپی بھی جی ضرور شمع کریں۔“

”کیا مطلب؟“ ”کون سی رائے؟“ کس کے بارے میں؟“ روبیہ نے حیرت سے انیقہ کی طرف دیکھا۔

”ارے یہی جو رشتوں کی فوج ظفر مومج ہے ہمارے ارد گرد انہی کے بارے میں اور کیا۔“ انیقہ نے جیسے روبیہ کی کم عقلی پر ماتم کرنے والے انداز میں کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے۔“ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟“

”ارے روبیہ! کیوں بے چاری کو بار بار ٹوک دیتی ہو۔ کہنے دو۔ ہاں انیقہ بولو۔ کیا کہنا چاہتی ہو تم۔“ آریان نے پہلے روبیہ اور پھر انیقہ کو مخاطب کیا۔ تو انیقہ نے چڑانے والے انداز میں روبیہ کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔

”ہاں جی! تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ہر انسان کی اپنے ماحول اور ارد گرد بسنے والوں کے بارے میں اپنی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ باقی سب کیا سوچتے ہیں۔ اس کا تو ہمیں علم نہیں البتہ ہماری رائے سادات گھر کے یاسیوں کے بارے میں کچھ یوں ہے۔ ارے... ارے ایک منٹ...“ انیقہ یوں خاموش ہوئی جیسے اسے کچھ بھول گیا ہو اور وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”ہوں... تو جناب سفید کرتے شلوار اور دوپٹے میں لمبی پٹنائی، کبھی سمنائی سی یہ ہر گھر کی سب سے بزرگ ہستی ہیں۔ ان کے سفید بالوں اور پروقاہ شخصیت کی طرح ان کا دل بھی اسی قدر قابل تعظیم و تکریم ہے۔ اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس گھر میں سے ہماری سب سے زیادہ دوستی انہی سے ہے۔ عرف عام میں انہیں بڑی اماں کہتے ہیں اور عرف خاص یعنی ہم انہیں دادو کہتے ہیں۔ سادات

مگر انہی کی راج دھانی ہے۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی آپ کو ایک خوبصورت سرسبز لان نظر آئے گا۔ یقیناً لان کی دلکش آرائش، ترتیب اور خوبصورتی دیکھ کر آپ مینوں کی خوش ذوقی اور محنت کو سراہیں گی لیکن ایسا ہرگز نہیں کیونکہ یہ سارا کمال مینوں کا نہیں، مالی کا ہے۔ اس گھر والے آرائش و زیبائش اور محنت کو پسند ضرور کرتے ہیں لیکن اس آتش میں بے خطر کو پڑیں ایسا قلمی نہیں۔ "ایقہ ایک پل کو رکے۔ آریان دلچسپ نگاہوں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ جبکہ روبہ اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اس نے روبہ کی تیز نگاہی کو نظر انداز کرتے ہوئے بیان وہیں سے جوڑا جہاں سے سلسلہ کلام ٹوٹا تھا۔

"لان کے بالکل سامنے تین سیر حیاں چڑھنے کے بعد ایک چمکدار چکنے فرش والا برآمدہ ہے۔ برآمدے کے بالکل سامنے لکڑی کا بڑا سا منقش دروازہ ہے۔ یہ ہال کمرہ ہے جسے گھر کے افراد ہی وی لاؤنج کہتے ہیں لیکن آپ اسے کچھ بھی کہہ لیں۔ ڈرائنگ روم، سٹنگ روم، میٹنگ روم جو بھی آپ سمجھ لیں۔ کمرے کی دیدہ زیب ڈیکوریشن اور لشکارے مارتے ہوئے فرنیچر کی صفائی اپنے ہاتھوں سے نہیں بلکہ ملازمہ کے ہاتھوں پر کرنی نظر رکھ کر دینی جاتی ہے۔ یہ ملازمہ اس گھر میں برسوں سے کام کرتی چلی آ رہی ہے۔ نام شکرہ ہے لیکن عبر و شکر نام کو نہیں۔ گھر میں کھانا سب سے پہلے یہی کھاتی ہے چاہے مالکان نے کھایا ہو یا نہیں۔ اس بات کی محترمہ کو رتی برابر پرواہ نہیں۔ اب آتے ہیں گھر کے افراد کے پاس تو جناب سب سے پہلے ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ اس رائے سے مرد حضرات مستثنیٰ ہیں۔ ہم ان کے بارے میں رائے محفوظ رکھتے ہیں۔" ایقہ کی آخری بات پر روبہ اور آریان کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"کیوں مرد حضرات کے بارے میں رائے کیوں نہیں دی جاسکتی؟"

"دی جاسکتی ہے لیکن اس سے نقص امن کا خدشہ ہے۔ ہاں تو جناب گھر کی سب سے بزرگ خاتون کا تعارف تو ہو چکا۔ اب آتے ہیں اس گھر کی بڑی بیوی یعنی تائی جی کی طرف۔ تائی جی ایک معصوم اور بھولی بھائی خاتون ہیں۔ ہم انہیں پیدائشی ماں سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں جانوروں کے لیے بھی دل میں ذہنوں میں ہیر پھار رکھتی ہیں۔ گھر بھر میں کسی کو کوئی تکلیف ہو سب سے زیادہ دکھ تائی کو ہوتا ہے اور وہ اس تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش میں لگ جاتی ہیں۔ شاعر نے انہی کے بارے میں کہا ہے کہ

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

"کیوں روبہ! ہم نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟" ایقہ ایک شان بے نیازی سے بولی۔

"نہیں بھئی ہم میں اتنی جرأت کہاں کہ آپ کی کبھی کسی بات کو غلط کہہ سکیں۔" روبہ نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ آریان کو یہ دونوں نہیں انتہائی پیاری لگی تھیں۔

"نگی۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں۔" آریان نے ایقہ کو کچھ سوچتے پا کر کہا تو اس نے آریان کی طرف

دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے کچھ دیر پہلے کی شوخی ختم ہو گئی تھی۔ چہرے پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"دراصل جس ہستی کا میں اب ذکر کرنے جا رہی ہوں لوگوں کے لیے تو شاید وہ اتنی اہم نہ ہو۔

لیکن آپ!۔ ان کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ہماری سانسوں کا ایک تانا بانا انہی کے مریہوں منت ہے۔ آپ کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی ہے کہ آپ جان گئی ہیں وہ کون ہیں جی ہاں آپ نے ٹھیک سمجھا باقی سب کی عینا پھپھو اور ہماری ماما۔ یہ ایسی شخصیت ہیں جن کے بارے میں میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی کہ اگر کسی نے جنت کو مجسم و متحرک دیکھنا ہو تو وہ ہماری ماما کو دیکھ لے۔" محبت، عقیدت، احترام جانے کتنے ہی جذبے اس کے لہجے میں سمٹ آئے تھے۔ ایک ماں کی ذات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے۔ لیکن شاید دنیا میں ایسے لفظ ہی نہیں کہ جنہیں گل ہائے عقیدت کی صورت میں ماں کے قدموں پر پھرا کر کے ہم یہ سمجھ لیں کہ ہمارا فرض پورا ہوا۔ ہم نے اپنی محبت کا ثبوت دے دیا۔ آریان کی گھنیری چلوں تلے ماں کی پاکیزہ شبیہ لہرائی۔ کتنا سکون کتنی طمانیت تھی اس آغوش میں۔ کتنا پیار تھا آنکھوں میں۔ وہ سکون، وہ طمانیت وہ ماما۔ وہ محبت بھی کچھ اس کی میراث۔ اس کی جائیداد تھا لیکن آج وہ راستوں کی بیٹی تھی۔ گردشگر کی طرح قافلے کے پیچھے رہ گئی تھی۔ ڈار سے پھڑکی ایک ایسی کرلائی کوچ تھی جس کی کرائی نہیں، سسکیاں، جس کی چھین اور دکھ صرف اس کی ذات کے اندر تک محدود تھا۔ کوئی نہیں تھا جو اس کے اندر جھانک کر اس دھجے بے اماں میں اس کی خواہشوں کی بے کفن لاشیں ڈھونڈ سکتا۔ پھر کسی کو کیا پڑی تھی بے اثر دعاؤں کے مستجاب ہونے کے منتظر رہنے کی۔ سو پوری دنیا اپنی رنگینیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

"آریان آپ! آپ کیا سوچ رہی ہیں!" ایقہ نے پوچھا تو وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ سوچ نہیں رہی ہیں بوریور ہی ہیں تمہارے اس طویل و عریض تعارف سے جس کا نہ سر ہے نہ

پیر۔ جس کے ختم ہونے کے کوئی چانس نظر نہیں آرہے۔ اگر تم اسی طرح تعارف پیش کرتی رہی تو یقیناً یہ

سال ہمیں لان میں بیٹھے بیٹھے گزر جائے گا۔" روبہ کی بات سن کر ایقہ نے برا سا منایا۔

"دیکھ لیا آریان آپ! ایسے لوگ ہوتے ہیں شخصی آزادی کو سلب کرنے والے، غیر جمہوری، ڈکٹیٹر۔"

"ارے نہیں بھئی! میں ہرگز بوریور نہیں ہو رہی۔ جس کے پاس تم جیسی اچھی اور مخلص دوستوں کا

ساتھ ہو بھلا وہ بوریور یا دکھی ہو سکتا ہے۔ اصل میں مجھے اپنی امی یاد آگئی تھیں۔" آریان دھیمے لہجے میں

وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"آہم..... ہم بھی اتنی دیر سے یہی سوچ رہے تھے کہ آج تک ہماری پہنی سوائے روبہ کے کبھی

کسی کو ناگوار نہیں گزری پھر آپ کی نفیس طبع ہمیں کیوں نہ برداشت کر پائی۔ خیر مس روبہ کے کانوں تک

یہ خبر یقیناً پہنچ چکی ہوگی کہ آریان آپ! ہرگز بوریور نہیں ہو رہی بلکہ گہری دلچسپی سے ہماری گفتگو سے مستفید

ہوری ہیں۔ لہذا امید ہے کہ اب وہ اپنی چونچ بند رکھیں گی۔“ ایقہ شرارتی نظروں سے روبیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو اس نے ہونہ کہہ کر رخ دوسری طرف کر لیا۔

”یہ ہماری بہن کا مخصوص انداز ہے اس طرح رخ پھیر کر یہ ہمیں باور کرانا چاہتی ہیں کہ اب ان کی ناراضگی کا دور شروع ہو گیا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ یہ رخ پھیر کر اس لیے بیٹھی ہیں تاکہ ہماری باتوں پر جو اثرات ان کے خوبصورت چہرے پر آئیں وہ ہماری نگاہوں کی دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔“ ایقہ کی بات سن کر آریان مسکرا دی جبکہ روبیہ کھسپائی سی ہو کر سیدھی ہو بیٹھی۔ ”کیا مصیبت ہے؟ تم باز نہیں آسکتیں۔“

”یہ بولی ناں بات۔۔۔ ہاں تو مکمل تعارف کی طرف آتے ہیں۔ اوہو کچن میں اٹھا بیچ ہو رہی ہے یہ۔ پلیٹ توٹنے کی آواز ہے۔ گھبرائیے مت۔ ہمارے گھر کی ان خاتون کی کچن میں موجودگی کا ثبوت ہی یہی ہے۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھتے ہیں زاہدہ چچی ہمارے خاندان کے اگوتے ڈاکٹر فخر دادا پردادا جناب فواد حسین کی والدہ ماجدہ۔ خاندان بھر میں نیم حکیم مشہور ہیں۔ کسی کو کوئی بیماری ہو ایسے ایسے نسخہ جات سے بہرہ مند کرتی ہیں کہ مریض کی زندگی محض ایک معجزہ ہی رہ جاتی ہے۔ ابھی تک فیملی کے افراد ٹھیک ٹھاک ہیں کیونکہ ان کے بتائے ہوئے نسخہ جات پر عمل نہیں کرتے۔ پورا خاندان حیران ہے کہ زاہدہ چچی کے ہاں اتنے ذہین و فطین بیٹے نے جنم کیسے لے لیا۔ غالباً وہ ان کی قربت و محبت سے زیادہ فیض یاب نہ ہو پائے ہوں گے۔“ ایقہ کی بات سن کر آریان کے ذہن کے پردے پر ایک ہیوا سا سرسرایا اور پھر ٹکس بن کر آنکھ کی پتی پر سٹ آیا۔

ان تین دنوں میں اس نے محض دو بار ڈاکٹر فواد کو دیکھا تھا۔ انہوں نے سرسری سا اس کا حال چال پوچھا تھا اور بس۔ یوں جیسے وہ اسے یہاں لاکر بھول گئے ہوں یا شاید وہ کوئی بے جان بے وقعت سی چیز تھی جس کا خیال انہیں پھر دوبارہ آیا نہیں۔

”فیضی چچی نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کوئی کی مکمل تفسیر ہیں۔ نہ کسی کے معاملات میں ناٹک اڑاتی ہیں نہ اپنے معاملوں میں فعل اندازی پسند کرتی ہیں۔ انہیں صرف اپنے میاں اور بچوں کی ہمہ وقت پرواہ رہتی ہے لہذا یہ سارا دن ہی آپ کو کسی نہ کسی کام میں جتی ہوئی نظر آئیں گی۔ اظہر چچا انہیں کو لہو کا نیل کہتے ہیں اور غالباً غلط بھی نہیں کہتے۔“ ایقہ نے فرہی فیضی چچی کو ہدف بنایا۔ روبیہ اور ایقہ مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”کئی۔۔۔ کتنا بولتی ہو تم۔۔۔ تھکتی ہی نہیں؟“ روبیہ نے کہا۔

”ارے دنیا میں آزادی رائے کا حق ہر ایک کے پاس ہے۔ ماما اور تم دونوں ہی مجھے بولنے نہیں دیتیں۔ آریان آپ کی کوئی غیر تو نہیں ہیں کم سے کم ان کے سامنے بولنے سے تو مت روکو۔“

”ہیں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ آریان کوئی غیر ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے بچوں کا تعارف پھر کسی دن پراٹھا رکھیں گے۔ فیملی کی سب سے ہر دلعزیز شخصیت کا تعارف تو ہونا چاہئے ناں۔“ ایقہ کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ نے کروات لی۔

”کون؟“ روبیہ نے پوچھا۔

”میری۔۔۔ تمہاری، خاندان بھر کی آئیڈیل۔۔۔ حدیقہ چچی۔“

”کیا؟“ روبیہ تو جیسے مارے صد سے کے بیہوش ہونے لگی۔

”آئیڈیل۔۔۔ حدیقہ چچی؟“

”ہاں بھئی۔۔۔ اس میں غلط کیا ہے آئیڈیل ہو کی تمام تر خوبیاں ان میں بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ آریان آپ کی روایت کا حسین ترین نمونہ ہیں ہماری یہ چچی آئیڈیل بیوی، آئیڈیل بہو، آئیڈیل چچی اور آئیڈیل بھالی۔“ آریان نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ ایقہ کے لہجے میں اسے طنز کا شائبہ سا ہوا۔

”تیس سال سے جزا ہوا خاندان محض ان کی تنہا جدوجہد سے ٹھہر گیا۔ آئے روز گھر میں ہونے والے جھگڑوں میں بڑی جانفشانی سے کام لیتی ہیں۔ اکثر گھریلو نوک بھوک انہی کی تنگ و دو کی مرہون منت ہے۔ بڑی اماں کا غرور، چچوں، چچیوں کا محبت بھرا ساتھ اور احساس کارشت انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اور جان لڑا کر توڑا۔ کیا ایک خاتون میں آپ کو یہ سب خوبیاں مل سکتی ہیں۔“

”کئی۔۔۔ بس کرو۔۔۔ چچی نے سن لیا تو فساد کھڑا کر دیں گی۔“ روبیہ نے لان میں پیچھی کر سیوں کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک تمام خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ آریان نے سب کی طرف دیکھا۔ جانے کیا ہاتھ تھی۔ بڑی اماں کی طرف اس کا دل کھینچتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بڑی اماں کے پاس بیٹھے ان سے باتیں کرے لیکن پھر یہ سوچ کر رک جاتی کہ جانے وہ کیا محسوس کریں۔ اس کی پر سوچ نگاہیں بڑی اماں پر جمی تھیں اور ذہن جانے کن بھول بھلیوں میں ڈوب اُبھر رہا تھا۔ شاید ایقہ نے موضوع بدل دیا تھا۔ ماحول اب بھی خوشگوار تھا۔ سب کے چہروں پر اب بھی وہی مسکراہٹیں بہا رہی تھیں۔ لیکن آریان اس ماحول سے یکدم کٹ گئی تھی۔ یوں ہی جیسے بھری بہار میں جب ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہوں کوئی نوخیز گل اچانک شاخ سے ٹوٹ کر نیچے آگرے۔



گھر سے باہر لے آیا۔ مسرت جہاں پہلے بھی سکول جاتی رہی تھیں لیکن آج جانے کیا بات تھی۔ سیاہ نقاب کے پیچھے سے بھی انہیں دنیا کھری کھری، اجلی اجلی، نئی نئی سی لگ رہی تھی۔ یوں جیسے کائنات ساری کی ساری بدل کر ان کے سامنے آگئی ہو۔ انہوں نے نئی کتابوں سے بھر ایک یوں دبوچ کر سینے سے لگا رہا تھا جیسے اس میں ہفت اقلیم کی دولت سنبھال رکھی ہو جس کے کھو جانے کا خدشہ لاحق ہو۔ جانے ذہن کس سوچوں میں غلطیاں وہ پہچان تھا کہ کالج پہنچنے کی انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

”اے! اب اتنا بھی ہے یا چھٹی تک نہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے۔“ شاکر حسین کی آواز انہیں حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔ منزل آچکی تھی یا شاید یہ وہ راستہ تھا جو انہیں ان کی من پسند منزل پر لے جاسکتا تھا۔ وہ ہائیک سے اتر آئیں۔

”ایک بجے آ جاؤں گا لینے..... اس درخت کے نیچے میرا انتظار کرنا بھی۔“ گیٹ کے بائیں طرف لگے بڑے سے پتیل کے درخت کی طرف اشارہ کر کے انہیں سمجھانے کے بعد شاکر حسین نے ہائیک کو گھوڑے کی طرح ایڑ لگائی اور ہائیک جھپکنے میں یہ جاوہ جا۔ مسرت جہاں تو جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔ کالج کی لڑکیاں ابھی آ رہی تھیں۔ وہ بھی ان میں شامل ہو کر کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئیں۔ کہاں گورنمنٹ کا ایک سادہ سا مختصر عمارت پر مشتمل سیکنڈری سکول اور کہاں پوسٹ گریجویٹ کالج۔ جس بات نے مسرت جہاں کو پریشان کیا وہ یہ تھی کہ کالج میں کو ایجوکیشن سسٹم تھا۔ جگہ جگہ لڑکے لڑکیاں ٹولے بنائے کھڑے اور بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پریشان سی وزیٹرز لابی میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ غالباً اپنے ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں عدم معلومات نے انہیں کچھ حواس باختہ کر دیا تھا۔ بمشکل برقع اتار کر تہہ کر کے انہوں نے بڑا سا میروں دوپٹہ اچھی طرح اوڑھ لیا۔ عجیب گاؤدی قسم کے لوگ تھے۔ جنہیں بے چاری مسرت جہاں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

”ایکسیکونڈری میس! کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“ بھاری مردانہ آواز مسرت جہاں کو کچھ پریشان کر گئی۔ انہوں نے بوکھلا کر اپنے سامنے موجود شخصیت کو دیکھا۔ مہذب لب و لہجہ اور سلجھی ہوئی شخصیت۔ مسرت جہاں کے بوکھلانے پر وہ بھی قدرے پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ غالباً اپنی بات کا یہ رد عمل اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

”وہ..... وہ سائنس ڈیپارٹمنٹ کس طرف ہے؟“ وہ کچھ بکلا کر اپنا مدعا بیان کر گئیں۔ کسی نہ کسی سے تو انہیں پوچھنا ہی تھا۔ اب اس نے اپنی خدمات پیش کیں تو انہوں نے بھی جھٹ سے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔

”آئیے میرے ساتھ۔“ وہ آہستہ روی سے ان کے آگے چل پڑا۔ مسرت جہاں کی مثال ایسے اندھے کی طرح تھی جسے بالکل انجان جگہ پر لا کر تباہ چھوڑ دیا جائے اور اسے کچھ سمجھائی نہ دے رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔

سفید براق یونیفارم میں لمبے سیاہ بالوں کی چوٹی گوندھے سادہ سے چہرے کے ساتھ وہ اس وقت ابامیاں کی عدالت میں کھڑی تھی۔

”مسرت جہاں! آج سے آپ کا کالج آنا جانا شروع ہو رہا ہے۔ آپ کو پک اور ڈراپ کرنے کی ذمہ داری ہم نے شاکر حسین کے ذمے لگادی ہے۔ یہ بتانے کی سر دست ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ سکول اور کالج میں انسان پڑھائی کے حصول کے لیے جاتا ہے۔ اس لیے دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں مشغول ہونے کو ہم اچھا نہیں سمجھتے۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں ہم کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ شبیر حسین عمیق نگاہی سے مسرت جہاں کے پاکیزہ چہرے کو جانچ رہے تھے۔ شاید وہ نظروں ہی نظروں میں ان کے اعتماد کو نول رہے تھے کہ کیا ان کے گھر کی یہ..... زمانہ سے انجان کلی اتنی مضبوط ہے کہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔

”اجلے کپڑے پہننا مشکل نہیں ہوا کرتا بیٹیا رانی! ان کے اجلے پن کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ گھر سے باہر ضرور جاری ہیں لیکن ہر دم اس گھر کی روایات کو اپنے ساتھ رکھیے گا۔ ہم مزید کچھ نہیں کہیں گے۔ تھوڑے کوئی بہت چاہیے۔“ ابامیاں نے بات ختم کر کے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھام لی۔ اماں بی نے ان کے ہاتھ میں پچاس کا نوٹ تھمایا اور وہ دونوں کو خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکلی آئیں۔ باہر آتے ہی فضا میں یوں گہرا سانس لیا جیسے بڑی دیر سانس روکے کھڑی ہوں۔ اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے یونیفارم پر اوڑھنے والا میروں دوپٹہ تہہ کر کے فائل میں رکھا اور برقعہ جسے وہ خیمہ کہا کرتی تھیں اوڑھ کر باہر آ گئیں۔ شاکر حسین اپنی ہائیک چکانے میں مصروف تھا۔

”آگئی چڑیل! تم بھی میری آزادی سلب کرنے کی کوششوں میں لگی رہا کرو۔ آؤ بیٹھو۔“ مسرت جہاں کو اس کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئیں۔ کہ اگر کچھ کہہ دیتیں تو شاکر حسین نے یہیں سب کچھ بھول بھال کر جھگڑا شروع کر دیتا تھا۔ اور وہ ابامیاں کی عدالت کی وجہ سے پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکی تھیں۔ سو چار و ناچار خلاف عادت خاموشی سے ہائیک پر بیٹھ گئیں۔ شاکر حسین ہائیک اشارت کر کے

”آپ غالباً نوائے مشن ہیں؟“ وہ جیسے پرسش نہ کر رہا تھا۔

”جی ہاں!“ مسرت جہاں کے حلق سے مری مری سی آواز برآمد ہوئی۔ انہیں تو اپنا پہلا دن ہی بہت کھن گ رہا تھا اور ابھی تو کئی سال پہلے تھے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

”میں یہاں انگلش ڈیپارٹمنٹ میں فوٹو ایڈیٹر کا سٹوڈنٹ ہوں۔ فرجادیلی نام ہے میرا۔“ وہ اسی طرح ان کے آگے آگے چلتے ہوئے اپنا تعارف بیان کر رہا تھا۔ مسرت جہاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہیں اس بات سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ وہ کون ہے کیا کرتا ہے؟ البتہ اس مہربانی پر وہ اس کی شکر گزار تھیں کہ اس کی وجہ سے وہ بھٹکتے رہنے سے بچ گئی تھیں۔

”لہجے مس! آپ کا ڈیپارٹمنٹ آگیا۔“ وہ جیسے کسی بڑی فتح یا کامیابی کا اعلان کر رہا تھا۔ مسرت جہاں کے چہرے پر اطمینان اور سکون کا رنگ پھیل گیا۔ شاید انہیں خدشہ تھا کہ وہ کہیں ان کی غلط رہنمائی نہ کر رہا ہو لیکن وہ ان کے ارادے کے برخلاف کافی اچھا شخص ثابت ہوا تھا۔

”بہت بہت شکریہ!“ منزل پر پہنچنے ہی ان کے حواس اور اعتماد بحال ہو گیا۔

”اس اوکے۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں“ وہ جانے لگا پھر جاتے جاتے جانے کیا یاد آیا کہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور وہ جو آگے بڑھنے لگی تھیں اس لیے رک کر اپنی جانب دیکھتا پا کر رک گئیں۔

”میں نے یہ کہنا تھا کہ یہ آپ کے ہمسایہ میں میرا ڈیپارٹمنٹ ہے۔ کسی بھی پریشانی میں آپ بلا جھجک مجھ سے کنسلٹ کر سکتی ہیں۔“ وہ یہ کہہ کر انہیں آگے بڑھ گیا مسرت جہاں بھی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ باقی کا دن کافی سکون سے گزرا۔ تین بیویوں کے ساتھ باقی دن فری گزر گیا۔ مسرت جہاں کے لیے یہ دنیا انوکھی سی تھی۔ رنگین اور شاید کسی حد تک پراسرار بھی۔ وہ اپنی فطری سادگی اور معصومیت کے باعث کسی سے زیادہ کھلی ملی تو نہیں تھیں لیکن انہیں یہ ماحول کچھ عجیب سا ضرور محسوس ہوا تھا۔ کہاں ان کا گھر انہیں خیمہ پوش خواتین جو بازار جاتے کو بھی گناہ تصور کرتی تھیں۔ اور کہاں یہ فیش زدہ مغربیت کی دلداد لڑکیاں جو بڑوں جیسے ڈر ہر زب تن کیے بالوں کو آزادی کے نام پر کٹوا کر عجیب و غریب ہیئت بنائے ہوئے تھیں۔ آزادانہ لڑکوں سے میل جول اور دوستیاں گانٹھ رہی تھیں۔ ”شاید اسی لیے ابامیاں مجھے اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وہ تو مرد ہیں ناں باہر کی دنیا سے اچھی طرح واقف شاید انہیں یہ خدشہ ہو کہ میں بھی ان لڑکیوں جیسی ہو جاؤں گی!“ اپنی اس سوچ پر وہ خود ہی ہنس پڑیں۔

”اب ایسی بھی گئی گزری نہیں ہوں جو یوں اوٹ پناٹگ حرکتیں کرنے لگ جاؤں۔ ابامیاں کا خدشہ بے بنیاد تھا میں یہ ضرور ثابت کروں گی۔“ انہوں نے گویا دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔ کالج آف ہو چکا تھا۔ انہیں درخت کے نیچے کھڑے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ لیکن شاکر حسین کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔ فرجادیلیک پر سوار ان کے پاس رک کر انہیں آفر دینے کے بعد جا چکا تھا۔ کالج بھی تقریباً خالی ہو چکا

تھا۔ پہلا ہی دن اور ایسا عجیب و غریب انہیں شاکر حسین پر غصہ آنے لگا تھا۔

”آجائیں ایک دفعہ میں کسی طرح گھر پہنچ جاؤں پھر دیکھنا اماں بی سے دس جوتے نہ پڑوائے تو۔“ سڑک تقریباً سنسان ہو چکی تھی اور اب مارے خوف کے ان کی جان آدھی ہو رہی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین کا بوسہ لینے کو لپکتیں سامنے سے آتے شاکر حسین کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آگئی۔ شاکر حسین نے ان کے بالکل سامنے بانگ روکی۔

”اے! فوت تو نہیں ہوئیں ڈر کے مارے۔“ انہیں خاموش کھڑا دیکھ کر شاکر حسین ان کا کندھا ہلا کر بولا۔ جواب میں انہوں نے ڈبڈباتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ارے ارے! تم تو رونے لگ گئیں۔ سوری بہنا! وقت کا صحیح پتا نہیں تھا۔ میں تو دیکھو ٹھیک ایک بجے پہنچ آیا ہوں اچھے کیا پتا کہ کالج ساڑھے بارہ بجے آف ہو جائیگا۔ اگر کالج جلدی آف ہو جایا کرے تو وزیٹرز لابی میں میرا انتظار کیا کرنا یہاں نہیں۔“ انہیں بہلا پھلانا کر بانگ پر بٹھا کر شاکر حسین گھر لے آیا۔ لیکن ان کا موڈ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ سونے سرپیت کر پڑی رہیں۔ شاید انہیں اس بات کا غصہ تھا کہ پہلا ہی دن گزرا تھا کالج کا اور پریشانیوں میں گھری رہی تھیں۔ مستقبل میں کیا ہونا تھا۔ شام کو سو کر اٹھنے پر البتہ طبیعت بحال تھی۔ نہاد کو کفر فزیش ہو کر وہ باہر صحن میں آگئیں جہاں گھر کی خواتین بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ موضوع گفتگو زائدہ بھابی تھیں جو چند روز سے اپنے میکے میں مقیم تھیں۔ باہر بھابی جتنے متحمل اور بردبار تھے زائدہ بھابی اسی قدر تیز مزاج تھیں۔ اماں بی اور ابامیاں کے ساتھ تو انہوں نے کبھی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ نہ ہی گھر کے دیگر افراد کو ان سے کوئی شکایت تھی۔ لے وے کے بچے تھے باہر بھابی تو ان کے پاس شکوے شکایات کے دفتر کھلے تھے۔ جانے کیا بات تھی دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ پاتے تھے۔ زائدہ بھابی جھوٹی سی بات پر بھڑک اٹھتی تھیں۔ جھگڑا ہمیشہ ان کی وجہ سے طول پکڑتا تھا۔ پھر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد بیچ بچاؤ کر دیتا تھا۔ لیکن اس بار شاید معاملہ کچھ سنگین نوعیت کا تھا جو وہ نواد اور مہوش کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اور باہر بھابی بھی اس بار کچھ زیادہ ہی خاموش اور بے پرواہ سے بنے پھر رہے تھے۔

”اماں بی!۔۔۔۔۔!“ مسرت جہاں صحن میں آکر اماں بی کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”کیا بات ہے؟ زائدہ بھابی کہاں ہیں؟ کیا پھر روٹھ کر گئی ہوئی ہیں؟“

”ارے بنا! جانتی تو ہو مزاج کی تیز ہے دل کی بری نہیں پر یہ بات باہر کو کون سمجھائے۔ روٹھ کر میکے جا بیٹھی ہے لاکھ کہا بیٹا جا کر لے آؤ۔ اسی مان سامن میں گئی ہوگی کہ میاں منا کر واپس لے آئے گا۔ مگر یہ بھی رٹ لگائے بیٹھا ہے کہ جیسے گئی ہے اسی طرح واپس آجائے میں لینے نہیں جاؤں گا۔ اور میرا فہدی کے بغیر دل نہیں لگ رہا۔“ اماں بی افسردہ سی تھیں۔

”تو اماں بی! آپ خود جا کر لے آئیں۔“

”ہاں شاید اب مجھے ہی جانا پڑے گا۔ پتہ نہیں زادہ میرے ساتھ آتی بھی ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں جاؤں اور وہاں سے خالی ہاتھ بھیج دی جاؤں۔ یہ باعزت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔“

ایسا نہ ہو کہ میں جاؤں اور وہاں سے خالی ہاتھ بھیج دی جاؤں۔ یہ بے عزتی مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔“

”ارے نہیں اماں بی! زادہ کم سے کم آپ کے ساتھ ایسا رویہ نہیں رکھے گی۔ مجھے یقین ہے۔“
 ہینا بھابی عصر کی نماز سے فارغ ہو کر یہیں آ بیٹھی تھیں ان کی بات سن کر اماں بی نے پُر سوت انداز میں سر ہلا دیا۔ مسرت جہاں جوشا کر حسین کی شکایت کرنے آئی تھیں۔ گھر لو پریشانی میں بھول بھال گئیں۔



”ویسے بھابی فیضی..... آپ نے دیکھی ہے وہ لڑکی جو دو تین دنوں سے یہاں آئی ہوئی ہے یا شاید لائی گئی ہے۔“ حدیقہ کا انداز تسخرانہ تھا۔ فیضی چچی اظہر چچا کے لیے ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھیں۔

”ارے حدیقہ! ہمیں کیا کوئی کچھ کرتا پھرے۔ ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ پھر بڑی اماں نے اسے قبول کر لیا۔ بھابی ہینا الگ اس کی طرفدار ہیں۔ بھابی مقسوم کی بھی ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ پھر دیکھنے میں وہ کسی اچھے خاندان کی لڑکی لگتی ہے۔ سلی بھی ہوئی باوقار سی۔“ فیضی چچی نے گویا بات ختم کرنا چاہی۔

”ارے کیوں کوئی کچھ کرتا پھرے۔ بھر پڑے گھر میں ایسے غلط اقدام کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہوتا ہے کیا نکل سکتا ہے۔ گھر میں بچیاں بھی ہیں کل کو ان کے ذہنوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ لگتا ہے اس گھر کے کمینوں کے لیے پہلا جھنکا تا کافی تھا۔ ماضی میں پیش آنے والے سانچے سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا ان لوگوں نے۔“ حدیقہ کی زبان زہرا گل رسی تھی اس کی کچن کے دروازے کی جانب پشت تھی۔ سو وہ جان نہ سکیں کہ ان کا کہا ہوا سن کر اندرائی اماں بی کا چہرہ کیسے دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ وہ لڑتے قدموں سے واپس چلیں۔ دیوار کا سہارا لیا۔ حادثہ زمانہ نے ان کے وجود کو ریت کی دیوار سے بھی زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ اپنے کمرے میں آ گئیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبائے لگیں۔

”الہی! عمر کی نقدی ختم ہونے میں کیوں نہیں آتی۔ شبیر حسین آپ مجھ سے زیادہ نیک تھے۔ پر بیزار متی تھے۔ سو اوپر والے نے ذلت کی زندگی سے عزت کی موت دینی بہتر جانی تھی اور میرے لیے اس دنیا میں بس خار زدہ سانس رہ گئے ہیں۔ ہر آتی جاتی سانس حلق میں نیزے کی انی کی طرح چھتی ہے۔ زخم زخم وجود لیے کب تک جیوں گی میں۔“ وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ کیا ایسا اسم اعظم تھا جو انہیں

اس اذیت سے نجات دلا دیتا۔ ماضی کے دھندلکے ان کی آنکھوں کی پٹیوں پر کالج کے باریک ذروں کی مانند چھ رہے تھے۔ اکھڑی اکھڑی سانس لیتی وہ اپنے بستر پر نیم جاں سی ڈھیر ہو گئیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی مسافر خار دار راستوں پر آبلہ پا چلتا ہوا اذیت کا بحر بیکراں عبور کر کے جب منزل پر پہنچے تو اسے پتا چلے کہ اس کی تو ساری مسافت رائیگاں گئی۔ یہ منزل اس کے لیے تو نہیں تھی۔ اماں بی کی حالت بھی اس وقت ایسے ہی لئے ہوئے مسافر جیسی تھی۔ اپنے تخت، تخت دل کو سنبھالے، زبان پر خاموشی کا قفل لگائے، آنکھیں بند کیے وہ ماضی کی راکھ تخیل کے ہاتھوں سے نونے لگیں۔ یقیناً کوئی چنگاری تھی جس کی حدت وہ اپنی سوچوں میں محسوس کرتی تھیں۔



موسلا دھار بارش ہو رہی تھی سورج کی نارنجی شعاعوں پر بادل اپنے وجود کی سیاہی طاری کیے جیسے اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔ پھول پودے نکھر گئے تھے۔ ان کی گھاس تر و تازہ ہو کر پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ گھر میں آریان، اہیقہ، روبیہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ زادہ چچی کی خالہ جو ایک طویل عرصے سے بستر علالت پر تھیں۔ ان کے فوت ہو جانے کی اطلاع پر گھر کے تمام افراد ان کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ وہ پشاور کے قریبی شہر نوشہرہ میں سکونت پذیر تھیں۔ اس لیے روبیہ کا خیال تھا کہ سب کی واپسی کل شام سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ البتہ ڈاکٹر نواد ایک ضروری کیس کے سلسلے میں ٹھیک چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ سو وہ گھر پر ہی رہ گئے۔ یوں بھی کسی نہ کسی مرد کا گھر پر رہنا ضروری تھا۔ روبیہ اپنی جاب سے چھٹی نہیں کر سکتی تھی اور اہیقہ کے لیے اب یوں سال کے آخر میں کالج سے فارغ نقصان دہ تھا۔

”آریان آپی! ایسا کرتے ہیں آج ماما کی راج دھانی میں تخریب کاری کرتے ہیں۔“ اہیقہ بڑے پُر جوش انداز میں بولی۔ وہ تینوں اس وقت روبیہ، اہیقہ کے مشترکہ کمرے میں براجمان تھیں۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ ڈاکٹر نواد کلینک جا چکے تھے۔ ماما گھر بھر کی صفائی کر کے اور برتن دھو کر جاپی تھی۔ اہیقہ، روبیہ اور آریان نے تمام بستر وغیرہ تہہ کیے تھے اور کمروں میں پھیلی چیزوں کو ٹھکانے لگا کر اب اطمینان سے بیٹھی کاجوڑوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

”کیا مطلب!“ آریان نے سوال کیا۔ روبیہ نے بھی بھنویں اچکا کر اہیقہ کی طرف دیکھا۔
 ”مطلب یہ کہ اس قدر بورڈن یوں بیٹھے بیٹھے گزرے گا نہیں۔ کتابیں پڑھنے کا ابھی وقت نہیں ہوا۔ سو کچن میں جا کر کوئی نیا نوٹیا، انوکھا، اچھوتا سا کام کیا جائے۔ کوئی اسٹائلش سی ڈش تیار کی جائے۔“
 ”لچ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور وقت بھی گزر جائے گا۔“ اہیقہ نے گویا ایک قیمتی اور مفت مشورہ شیئر کیا۔
 ”پہلی بات تو یہ ڈیزائنر کے پڑھنے کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا۔ اور جس قسم کی اسٹائلش ڈش آپ بنائیں گی۔ اگر لچ میں اس سے استفادہ کیا گیا تو نتائج کی ہولناکی کا تصور ہی لڑا دینے کے لیے

کافی ہے۔ اور آخری بات یہ کہ ماما کہہ گئی ہیں۔ فریز میں چکن چیز مصالحہ لگا کر رکھے ہوئے ہیں دل چاہے تو وہ تیار کر لینا یا پھر کباب تل لینا۔ روٹی وہ صبح جاتے ہوئے بنا گئی ہیں۔" روبیہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولتی ہوئی گویا ایقہ کے خانسامی جذبات کا تیا پانچہ کر گئی۔

"کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ گھر ترقی کر جائے۔ جس گھر میں مس روبیہ جیسے ڈکٹیشنر ہوں وہاں جمہوریت بے چاری کیا مجال جو دم بھی مار سکے۔" ایقہ کوفت بھرے لہجے میں بولی۔ آریان اب تک خاموش بیٹھی ان کی باہمی گفتگو پر محض مسکرانے پر اکتفا کر رہی تھی لیکن لگ رہا تھا جیسے حسب معمول امن عامہ کے متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

"روبیہ کیا ہرج ہے؟ کوشش کرنے دو اسے۔ کرے گی تو سیکھ سکے گی۔" آریان نے ایقہ کی طرف داری کی تو روبیہ خاموش ہو گئی۔ غالباً آریان کی سلجھی ہوئی طبیعت کے باعث اس نے اس سے اختلاف کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپلی تم بہتی ہو تو مان لیتے ہیں لیکن ان موصوفہ سے یہ ضرور کہہ دو کہ کچن کا کباڑ انہیں ہونا چاہئے۔ جو چیز جہاں سے اٹھائے۔ استعمال کے بعد وہیں رکھ دے۔ کیونکہ کام والی ماسی جا چکی ہے اور کٹھ کباڑ پھیلا کر سینے کی عادت نہیں ہے ان محترمہ میں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آریان آپلی میرے ساتھ ہی تو ہو گئی کچن میں۔ میں پھیلاتی جاؤں گی یہ سیمتی جائیں گی۔ کیوں آپلی.....؟" ایقہ شرارت بھرے لہجے میں آریان سے مخاطب ہوئی تو وہ مسکرا دی۔ وہ تینوں ہی کچن میں آگئیں۔ ایقہ نے کچن کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ سارے کیبنٹ کھنگال ڈالے اور طے یہ پایا کہ چکن جنجر ایقہ تیار کرے گی۔ سلاد اور جیلی بنانے کی ذمہ داری روبیہ کی ٹھہری اور سویت ڈش آریان نے اپنے ذمے لے لی۔ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد جب انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پر اپنی اپنی تیار کی ہوئی ڈشیں رکھیں تو تینوں ہی کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ تینوں میز کے گرد بیٹھ گئیں۔

"کتنا اچھا۔ جو فواد بھائی بھی آجائیں۔" ایقہ پلیٹ اپنے آگے رکھتے ہوئے بولی۔

"تھنک آف داؤ بول اینڈ داؤ بول از ہینر۔" ڈرائنگ روم کے دروازے سے ڈاکٹر فواد نے جھانکا۔ وہ شاید ابھی آئے تھے اور گھر میں اپنی فیملی کی عدم موجودگی کے باعث ہینا پھپھو کے پورشن کی طرف آگئے تھے۔

"آئیے بھائی۔" ایقہ کے بلانے پر وہ اندر آگئے اور آگے بڑھ کر ایقہ کے دائیں طرف رکھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"لگتا ہے آج کچن کو کسی انازی کے ہاتھ لگے ہیں۔" خوبصورت سی جی سجائی ٹیبل کو دیکھ کر انہوں

نے ستائش اور شرارت کا ملا جلا انداز اپنایا۔

"بھائی! یہ ماڈل ہے ابھی آپ نے کوئی ایک ڈش بھی نہیں چکھی۔ رائے کھانے سے پہلے نہیں۔ بعد میں دی جاتی ہے۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ صرف ایک ہاتھ کا کمال ہے۔" ایقہ بولی۔ "نہیں خیر ہمارے گھر میں ابھی کوئی اس قدر پریکٹیکل بھی نہیں ہوا کہ اتنا کام تنہا ہی نٹالے۔ ویسے تو میں بھی جانتا ہوں کہ اس ٹیبل پر موجود سب سے مشکل ڈش تم نے ہی بنائی ہوگی۔" فواد ہنوز اسی انداز میں گویا ہوئے۔

"کون سی.....؟" ایقہ کا تجسس اور اشتیاق دیدنی تھا۔

"یہی..... جیلی....." فواد نے جیلی کے باؤل کی طرف اشارہ کیا۔ ایقہ نے ہار انگلی سے ان کی طرف دیکھا۔

"کاش بھائی! آپ مجھ سے چند دن چھوٹے ہوتے۔" وہ دانت کچکپاتے ہوئے بولی۔ "ہوں..... تاکہ ڈرائنگ روم میں رکھے سارے کٹن اور گھر میں موجود سارے جتنے میرے سر مبارک کی مزاج پر سی کر رہے ہوتے۔" انہوں نے چکن جنجر پلیٹ میں نکالتے ہوئے شوخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"روبیہ..... آپ دونوں نے کیا چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے؟" فواد اب روبیہ اور آریان سے مخاطب تھے۔ ان کی بات سن کر آریان نے قدرے شینا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی مخاطب تو روبیہ کو ہی کیا تھا لیکن ان کی کالی گھور شرارت بھری آنکھیں آریان کے صبح رخساروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ نوالہ جیسے اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔ اس نے سامنے پڑا پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ "روبیہ! تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟" فواد، آریان کو مزید بوکھلانے کی بجائے روبیہ سے بات چیت کرنے لگے۔

"ایکدم فرسٹ کلاس....." اس نے جواب دیا۔

وہ روبیہ اور ایقہ کے ساتھ خوش گپیوں کے درمیان کھانا کھاتے رہے۔ آریان کو انہوں نے مخاطب نہیں کیا۔ اس نے بھی چند نوالوں کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اور سر جھکائے بظاہر اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کا جائزہ لے رہی تھی لیکن اس کی توجہ انہی کی باتوں کی طرف تھی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر رک کر ڈاکٹر فواد تو کھینک چلے گئے۔ جبکہ ایقہ اپنی بیالوجی کی بک اٹھا کر سنڈی روم سدھا رہی۔ روبیہ اور آریان نے مل کر کچن صاف کیا اور کمرے میں آگئیں۔

"رینی! تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" روبیہ اور وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ روبیہ کے پوچھنے پر آریان کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ معدوم ہوئی۔ جانے کتنے جتنوں سے تو وہ اس مصنوعی

مسکراہٹ کو ہونٹوں پر سجائے خود کو جبراً خوش ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

”کیا بتاؤں اپنے بارے میں..... بہت سادہ سی کہانی ہے۔ ماں باپ کو دیکھا نہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی رشتے کی ایک خالہ کے گھر میں خود کو پایا۔ خالہ نے سگی ماں سے بڑھ کر پیار کیا۔ اور آج سے چند دنوں پہلے محبت اور خلوص کا وہ واحد سہارا بھی مجھ سے چھین گیا۔ اس بے اماں دنیا میں اپنی زندگی کی چند سانسیں بچانے کی تک وہ دکر رہی ہوں اور بس..... اتنی سی داستان ہے میری۔“

”تو کیا خالہ کا اور کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا؟“

”کیوں نہیں تھے۔ بہت سے رشتے داری کے دعویدار پیدا ہو گئے ان کے مر جانے کے بعد۔ اس لیے کہ خالہ کی ساری زندگی کی کمائی تین کروڑ کا وہ گھر ہے جو مرتے مرتے وہ میرے نام کر گئیں۔ وہ لوگ اس گھر کی خاطر کسی بھی انتہا تک جاسکتے تھے۔ یہاں تک میری جان تک لے سکتے تھے۔“

آریان کی بات سن کر روبیہ نے حیرت سے دیکھا۔

”کیا مطلب.....؟ کیا انسانی جان اتنی بے وقعت ہوتی ہے۔“

”اس سے بھی کہیں زیادہ..... ہم انسان مہذب دنیا کے باسی۔ اپنے اندر کے حیوان کو سلائے شرافت کا لبادہ پہنے خود کو پارسیا بنانے اور ظاہر کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں لیکن جب بھی اندر کا سویا ہوا حیوان جاگ جائے تو یہ مہذب دنیا جنگل کے قانون اور تہذیب سے بھی بے بہرہ لگنے لگتی ہے۔ ایک طرف کسی مرتے ہوئے کو خون دے کر بچایا جاتا ہے تو دوسری طرف چند سو روپوں کی خاطر، تھوڑی سی زمین کی خاطر کسی کا خون بہایا جاتا ہے۔“ آریان کے لہجے میں تلخیوں کا زہر گھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہم عمر تھیں لیکن تجربے میں آریان اس سے کہیں آگے تھی۔ اس نے ٹھوکریں سہی تھیں۔ تلخ حالات کے تجھیرے برداشت کیے تھے۔ جذبات و احساسات کا خون ہوتے دیکھا تھا۔ جبکہ روبیہ جو ماں کی نرم گرم آغوش میں دبی ہوئی تھی وہ دنیا کی تلخ اور خنجر حقیقتوں کا مشاہدہ کیسے کر سکتی تھی۔ اس کی سوچ اس گھر، اس گھر کے یکینوں، اپنے سکول اور اپنی جاب سے آگے ہی نہیں جاپاتی تھی۔ سو وہ حیرت کا بت بنی آریان کی باتیں سن رہی تھی۔

”رینی! پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ اب کیا کرتا ہے؟“

”میں سوچا ہے کہ کسی خواتین کی فلاح و بہبود کے ادارے سے رابطہ کروں۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لوں گی۔ زندگی کسی نہ کسی طرح تو گزاری ہی ہے۔“ آریان کے افسردہ لہجے میں محرومیاں چنچ رہی تھیں۔

”پاگل ہو گئی ہو کیا؟ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ بڑی اماں ماما ہم دونوں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے۔ اس گھر میں جہاں پہلے سے اتنے افراد بس رہے ہیں کیا تمہارا حصہ لیے جگہ نہیں نکل پائے

گی۔“ روبیہ جذباتی انداز میں بولی تو آریان بھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

”روبی! میں کسی کے لیے بوجھ بننا گوارا نہیں کر سکتی۔ یقین کرو تم سب لوگ بے حد اچھے اور مخلص ہو لیکن میں کیا کروں میرا دل نہیں مانتا کہ میری وجہ سے کسی کو بے جا تکلیف ہو۔“

”رینی! تم نے کیا تکلیف دی ہے ہمیں؟ رینی بات بوجھ بننے کی تو اگر تم زیادہ محسوس کرتی ہو تو میرے ساتھ سکول میں جاب کر لو۔ اچھی سیکری ملے گی۔ تمہارا بہت اچھا گزارا ہو سکے گا۔ لیکن پلیز آئندہ یہ گھر چھوڑنے کی بات مت کرنا۔“ روبیہ کے خلوص پر آریان کی پلکیں نم ہو گئیں۔ اسے لگا جیسے اوپر والے نے اس کی خاطر کہیں پڑاؤ کا مقام چن لیا ہے۔ اس کی آبلہ زدہ روح کو قیام کا اذن مل گیا ہے۔

”ٹھیک ہے روبی! میں سوچوں گی۔“ وہ کسی گہری سوچ کے زیر اثر ہوئی۔

وقت نے اسے کتنا بے اماں کر دیا تھا۔ کتنا بے وقعت کر دیا تھا۔ اس کی ذات تو اب اس کی نظروں میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے زرد خشک پتے سے بھی کہیں زیادہ بے مول ہو گئی تھی۔ زندگی ایک بوجھ کی صورت اس کی دھڑکنوں پر مسلط تھی۔ اور اسے یہ بوجھ اٹھانا تھا۔



پھر روبیہ نے نئی اسے اپنی پرنسپل مسز افسیاء اور سکول کے فیجنٹ ڈائریکٹر سر آفاق سے ملایا۔ ایک مختصر سے انٹرویو سے نیا ان دونوں نے آریان کی قابلیت کا اندازہ لگا لیا۔ ان دنوں میٹھ کی ٹیچر چھٹی پر تھی سو آریان کو ایذا سے کیشیول ٹیچر پائٹ کر لیا گیا۔ آریان کو سکول کا ماحول بہت اچھا لگا۔ ننھے سنے بچے، پڑھتے لکھتے کھیلتے کودتے دل کو بھلے لگتے ہیں۔ آریان نے سوچا۔ کسی نے کتنا سچ کہا ہے۔

”جب دنیا تمہیں بد صورت لگنے لگے تو کسی بچے کو آکس کریم کھاتے ہوئے دیکھ لو۔“

ان معصوم، زمانہ نا آشنا چہروں کا حسن ہی دنیا کی بد صورتی کو کم کر سکتا ہے۔ اسے پلے گروپ کا انچارج بنایا گیا۔ بڑی کلاسز میں میٹھ کے تین چار پیریڈ لینے کے علاوہ باقی کا تمام وقت پلے گروپ کے ساتھ گزارتا تھا۔ اصل میں روبیہ بھی پہلے پلے گروپ کی ہی ٹیچر تھی اور اس نے کہہ کر اسے اپنے ساتھ لگوا دیا تھا۔ آریان کو پرنسپل اور اسٹاف بھی بے حد اچھا لگا۔

”زندگی اب کچھ سہل ہو جائے گی۔“ اس نے سوچا۔

پھر آنے والے دنوں میں اسے لگا کہ اس کی یہ سوچ کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ دن کا آدھا حصہ سکول میں گزارنے کے بعد گھر پر وہ شینا پھینک کا ہاتھ بناتی۔ باقی ماندہ وقت وہ بڑی اماں کے سنگ گزارتی۔ ایقہ کی طرح بڑی اماں اس کی بھی بہت گہری دوست بن گئیں۔ اسے یہاں رہتے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہونے کو تھا لیکن جو اسے یہاں تک لانے کا سبب بنا تھا اس نے تو جیسے بھلائی دیا تھا۔ چند ایک بار کے علاوہ اس نے اس کا حال تک دریافت نہیں کیا تھا۔ شاید وہ مطمئن تھا کہ آریان محفوظ ہاتھوں

میں ہے۔



آج سکول کی چھٹی تھی سوروبیہ، ایقہ اور آریان تینوں ہینا پھسوکے ساتھ کام میں لگی ہوئی تھیں۔ ہینا پھسوکے اپنا بیت بھر روپے نے کچھ ہی عرصے میں آریان کو ان کے بہت قریب کر دیا تھا۔ جاب کے معاملے میں بھی وہ کافی حد تک مطمئن ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی اس بے اماں زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ شاید اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کی حیثیت خشک زرد خزاں رسیدہ پتے جیسی تھی جانے حالات کے پھینرے اسے کہاں سے کہاں لے جائیں۔ ابھی کچھ طوفان تھا اس کے پاؤں زمین پر نکلے ہوئے تھے۔ نگاہ اٹھاتی تو نیلا چھار فلک بھی نظر آتا تھا۔ اور یہی غنیمت تھا۔ اسے زیادہ کی طلب بھی نہیں تھی۔ چند مہربان مگر نا آشنا چہروں کے بچ واپسوں کی بے حسی کو بھلانے کی تگ و دو میں تھی۔

”رینی! آج بازار چلو گی میرے ساتھ؟“ روبیہ دھلے ہوئے کپڑے چھت پر پھیلا کر نیچے آئی تو ان میں اسے سبزی بناتے دیکھ کر ادھر ہی آگئی۔

”کیوں؟ کچھ خاص شاپنگ کرنی ہے۔“ آریان نے پوچھا۔ ابھی دو چار دن پہلے ہی تو ہینا پھسوکے شہرہ سے واپسی پر ان تینوں کے لیے کافی کچھ خرید کر لائی تھیں۔

”یار! کل تنخواہ ملی ہے اور جب تک تنخواہ میرے پرس میں پڑی رہے گی مجھے چین نہیں آتا۔ مجھے ایک ہی دن میں ساری ساری خرچ کر کے مزہ آتا ہے۔“

”کمال ہے پورے مہینے کی محنت ایک ہی دن میں اکارت۔ افسوس نہیں ہوتا کیا؟“ آریان کو اس کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

”ارے یہی تو عیاشی ہے۔ باقی کا سارا خرچ ماما کے ذمے۔ ان پیسوں سے صرف میں اپنے مشاغل کی تسکین کرتی ہوں۔ مثلاً ڈانسس، بکس، سمسٹس وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال کیا تم نے نہیں چلنا؟ ممکن ہے بازار جا کر تمہیں بھی کچھ نہ کچھ یاد آجائے خریدنے کے لیے۔“

”ہاں چند ایک چیزیں لینی ہیں میں نے ٹھیک ہے شام میں چلے چلیں گے۔“ آریان کا جواب سن کر روبیہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

مالی لحاظ سے مستحکم ہونے کے باوجود ہینا پھسوکے زیادہ تر کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ خاص طور پر کوئنگ۔ جبکہ آریان نے دیکھا تھا کہ باقی چچیاں ہر کام ماسیوں کے سپرد کر کے سارا دن فارغ رہتی ہیں۔ خاص طور پر اسے حدیقہ چچی کے مشاغل بہت عجیب لگتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بالکل نظر انداز کر کے وہ کسی پنڈولم کی طرح بازار، سٹریٹ، سفر یا بیوٹی پارلر کے درمیان چکراتی رہتی تھیں۔ شولڈر کٹ سٹکی بالوں کے ساتھ خوب فربہ مائل پھیکے شلجم جیسی رنگت، الی حدیقہ چچی اسے تو بالکل متاثر نہ کر سکی

تھیں۔ خاص طور پر ان کا دیکھنے کا سٹائل ایسا ہوتا تھا۔ جیسے ان کے سوا ساری دنیا بے وقعت و حقیر ہے۔ آریان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ان سے اس کا سامنا کم ہو۔ بلکہ ہو ہی نہ تو زیادہ بہتر ہے۔



بازار کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ روبیہ اور وہ دونوں اس وقت فیضان آرکیڈ میں موجود تھیں۔ روبیہ زور شور سے دکاندار کے ساتھ بھاؤ تاؤ میں مصروف تھی۔ آریان وہاں کھڑی بوریٹ محسوس کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں ارد گرد بکھرے انسانوں کے چہروں کو منٹو لے لگیں۔

”کیا یہ سب بے فکر ہے، مست انسان اسی دنیا میں آباد ہیں۔ یہ جن کے چہروں پر خوشیاں رنگوں کی صورت نکھری ہوئی تھیں۔ جن کی آنکھیں ہر روز نئے خوابوں کی تعبیریں پا کر آسودہ اور مطمئن نظر آ رہی ہیں۔ یہ دھانی آنچلوں والی الہامی سی لڑکیاں مجھ سے چھوٹی، کچھ بڑی اور کچھ ہم عمر ان کے گھر ہوتے ہوں گے۔ گھروں میں بسنے والے ہر رشتے کی آسودگی اور سکون انہیں میسر ہوگا۔ ہر آرزو کام جانا ان کے لیے کوئی مشکل یا ناممکن نہیں تو تو پھر اسے اللہ! تیری اس اتنی بڑی دنیا میں میں کس لیے اٹھتی ہوں۔ میری آنکھیں خواب دیکھنے سے کیوں ڈرتی ہیں۔ میں خوشیوں کا لمس کیوں نہیں پاسکتی۔“ وہ روبیہ کے نزدیک ہی کھڑی تھی لیکن خیالوں کی دنیا میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔ اسے کچھ ہٹا نہیں چلا روبیہ نے کیا خریدا۔ لیکن اچانک اس کی کھوئی ہوئی آنکھوں میں دوہوے سے کسی نشتر کی طرح چبھے تھے اور وہ ہوش کی دنیا میں آگئی۔ بڑے سے گلاس ڈور کے باہر

کے نزدیک کھڑے وہ دو آدمی اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھے۔ گھنی مونچھوں اور سیاہ کالی۔ سیوں والے وہ دونوں بھاری بھر کم شخص اپنے حلیے اور انداز سے ہی کچھ اور دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے قدموں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ اس نے اپنے لرزرتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنی چادر کا ایک کونا غیر محسوس انداز میں اپنے چہرے کے آگے کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے روبیہ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ روبیہ نے اس کے ہاتھ کے بغیر ہٹس کو محسوس کرتے ہوئے اس کی جانب نظر اٹھائی۔ اس کی آنکھیں کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح بھی ہوئی تھیں۔ اور زنگ بلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

”رینی! کیا بات ہے؟“ روبیہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ وہ مم۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ بس چلو یہاں سے۔“ وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں بولی۔ ان چہروں سے بچ کر چھپ کر کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح ڈوبتی پھر رہی تھی وہ اور وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آ گئے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے تم باہر چلو میں پے منٹ کر کے آتی ہوں۔“ روبیہ کو وہ واقعی اس وقت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

”نن... نہیں... تم میرے ساتھ ہی چلو...“ آریان نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اس کی بے قرار نگاہیں ایک بار پھر گلاس ڈور کے باہر جھانکنے کو پھٹکیں۔

”او کے... او کے ٹھیک ہے۔ پھر کبھی سہی...“ روبیہ نے مزید شاپنگ کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے دکاندار کو پے منٹ کی۔ وہ دونوں شخصیں سڑکیاں اتر کر بازار کی شمالی جانب جا رہے تھے۔ آریان کے سینے میں دلی سانس جیسے بہت دیر بعد باہر نکلنے کا راستہ پاسکی۔ وہ دونوں بھی باہر نکل آئیں۔

”کیا خیال ہے ربی... ایک ایک کپ آکس کریم ہو جائے۔“ روبیہ فریش لہجے میں بولی۔ حقیقتاً تو وہ اس کی موجودہ کیفیت سے کچھ کھٹک سی گئی تھی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ آریان وہاں موجود کسی شخص کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ اس نے آریان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھنا بھی چاہا لیکن اسے کوئی مشکوک شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔ بہر حال اس وقت تو وہ بس یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح آریان کی طبیعت بحال ہو جائے۔ باقی باتیں بعد میں بھی پوچھی جاسکتی تھیں۔

”نہیں رو بی! بس اب گھر چلو۔“ آریان ہنوز بوکھلائی ہوئی تھی۔ روبیہ نے اس کی بات مان لی اور گاڑی گھر کی طرف جانے والے روڈ پر موڑ لی۔ آریان فرنٹ سیٹ پر اس کے قریب خاموش بیٹھی اپنی گود میں دھڑے ہاتھوں پر نگاہیں جمائے جانے کس سوچ میں گم تھی۔ روبیہ نے بغور اس کی طرف دیکھا لیکن اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی طرح خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی ہوئی گھر پہنچ گئی۔ آریان تمام راستے خاموش رہی تھی اور اب بھی خاموشی سے گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ روبیہ کچھ نہیں پاری تھی کہ آخر ایسی کون سی بات تھی جس نے ربی کو اس قدر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ بہت زیادہ بات تو یہ پہلے بھی نہیں تھی لیکن جو خوف جو وحشت اس نے آج اس کی ذات میں محسوس کی تھی۔ اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔

”بہر حال جو بھی ہے بہت جلد سامنے آ جائے گا۔“ روبیہ سوچنے لگی۔



کالج کا گیٹ عبور کر کے مسرت جہاں فوزیہ کے ہمراہ لان کی طرف بڑھیں۔ آجکل پڑھائی زوروں پر تھی اور وجہ تھی فرسٹ سسٹر کی تیاری۔ اس لیے تقریباً تمام سٹوڈنٹس ہی غیر حاضری سے اجتناب کر رہے تھے۔ وہ بھی نہایت دلچسپی اور توجہ کے ساتھ اپنے تعلیمی مراحل طے کرنا چاہتی تھی۔ ذہن کو صرف ایک مقام پر مرکوز کر کے وہ اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانا چاہتی تھیں۔ فوزیہ سے ایک دو قدم آگے چلتے ہوئے جونکی وہ لان کے بائیں جانب مزیں ان کی نظر سامنے بیٹھے ہوئے فرجاد سے جا کرائی۔ جوان سے قدرے فاصلے پر اپنے دوستوں کے ہمراہ گھاس پر براجمان تھا۔ انہیں فوزیہ کے سنگ دیکھ کر ایک طمانیت بھری مسکراہٹ اس کے عنبائی لبوں پر ابھر کر معدوم ہو گئی۔ ایک پل کو انہیں یہی لگا تھا جیسے

اس کی منتظر نگاہیں ان کو دیکھتے ہی ہڈ سکون ہو گئی تھیں اور اب ان آنکھوں میں انتظار کی بجائے شوق، تجسس اور جانے کون کون سے جذبوں کی پر جھانپیاں رقصاں تھیں۔ وہ ایک پل کو نروس ہو گئیں۔ تیزی سے اٹھتے قدم یوں ہلکے پڑ گئے۔ جیسے وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ انہوں نے بس ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر نگاہوں کا زواہ بدل لیا تھا لیکن دل ہی دل میں کتنی سوچوں نے یکدم سر اٹھارا۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ اس شخص کی معنی خیز نظروں کا سامنا کر رہی تھیں۔ کلاس میں کلاس سے باہر، لان میں، کھنکھن میں ہر جگہ جہاں کہیں وہ اس کے سامنے آ جاتیں اس کی نگاہوں کا مرکز بن جاتیں۔ وہ انہیں یوں کھنکھاتی باندھ کر دیکھتا جیسے پلک جھپکے گا تو مسرت جہاں کسی الوٹن کی طرح غائب ہو جائیں گی۔ اور اس سے وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز ہو جاتا۔ وہ بھول جاتا کہ وہ اس وقت تنہا نہیں ہے۔ اس کے ارد گرد بہت سے لوگ موجود ہیں مختلف کاموں میں مصروف لوگ لیکن جن کی نظروں سے کچھ چھپ جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ لیکن اگر وہ اسی طرح اپنے موجودہ رویے پر قائم رہا تو مسرت جہاں کے لیے اس کا لُج میں اپنی ریپوٹیشن برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گی۔ اس سوچ کے ذہن میں ابھرتے ہی مسرت جہاں جیسے حواسوں کی دنیا میں آ گئیں۔

”انہیں اس شخص کی حد درجہ حوصلہ شکنی کرنی ہوگی۔ صرف اسی طرح وہ سکون کے ساتھ اپنا تعلیمی کیریئر بنا سکیں گی۔“

انہوں فوزیہ کی طرف دیکھا۔ اپنی سوچوں میں مگن وہ یونہی چلتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیوں تک آ پہنچی تھیں۔ جبکہ فوزیہ کافی فاصلے پر اپنی مشرکہ کلاس فیلو سہیہ سے باتوں میں مصروف تھی۔ وہ رکت گئیں اور پلٹ کر فوزیہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ سہیہ سے ایک دو منٹ ہاتھ کرنے کے بعد فوزیہ ان کی طرف بڑھی۔

”تو بے مسرت! کیا کوئی بھوت دیکھ لیا تھا؟“ فوزیہ ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔

”کیوں...“

”تم تو یوں آگے ہی آگے جا رہی تھی جیسے کوئی تمہارے پیچھے لگا ہوا سہیہ کی آواز دینے پر بھی نہیں رکیں۔ خیر تو ہے ناں۔“ فوزیہ گہری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”وہ... وہ اصل میں سرایاز کا پیرے شروع ہونے میں صرف دو چار منٹ ہی رہ گئے ہیں ان کا پتا تو ہے تمہیں کہ دیر سے آہنے پر سٹوڈنٹ کو کلاس میں گھسنے نہیں دیتے۔“ مسرت جہاں کو جیسے اپنی غائب دماغی اور گھبراہٹ کا معقول جواز مل گیا۔

”سہیہ یہی تو بتا رہی تھی کہ سرایاز تین دن کی لیو پر ہیں۔ سو آج کا سارا دن بے کار گیا اور تمہاری اتنی جگت بھی بے کار گئی۔“

”تو پھر میرا خیال ہے کہ کلاس روم میں جانے سے بہتر ہے یہیں لان میں بیٹھا جائے۔“ مسرت جہاں نے کہا تو فوزیہ بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ قدم سے قدم ملائی لان کے نسبتاً الگ تھلگ گوشے کی طرف بڑھ گئی۔ کتابیں گھاس پر ڈھیر کرنے کے بعد وہ دونوں خود بھی بیٹھ گئیں۔

”مسرت میں چند دنوں سے تم میں کوئی تبدیلی دیکھ رہی ہوں۔ یہ تو میں نہیں جانتی کہ وہ تبدیلی مثبت ہے یا منفی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تمہیں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کر رہی ہے۔“ فوزیہ بچپن سے لے کر اب تک ان کی واحد دوست تھی اور دوست بھی ایسی جسے مزاج آشنا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور اس کا یہ تجزیہ بھی کسی حد تک درست تھا کہ وہ چند دنوں سے واقعی ڈسٹرب تھیں۔

”نہیں۔“ مسرت جہاں نے مختصر جواب دیا۔ آج نہیں تو کل یہ بات اس کے علم میں آ ہی جانی تھی۔ پھر اب۔۔۔ اس وقت جبکہ یہ موضوع چھڑی گیا تھا تو مسرت جہاں نے یہی مناسب سمجھا کہ فوزیہ کو اپنی پریشانی کے بارے میں بتادیں۔

”کیا وہ پریشانی تم میرے ساتھ شیئر کرو گی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اس طرح میں تمہاری پریشانی دور کروں گی۔ ہاں شاید اس طرح تم کچھ نہ سکون ہو سکو۔“

”فوزیہ! مجھے فر جاؤ ملک کا دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔“ انہوں نے مصومیت سے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔ ”کیا مطلب؟“ ”یاد وہ خصوصی حور پر تمہیں دیکھتا ہے؟“ فوزیہ مسکراتے لہجے میں بولی۔

”شاید یہ میری غلط فہمی ہو لیکن اس کا مستقل دیکھنا مجھے بہت برا لگتا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کس طرح روکوں۔ یہ کانٹ ہے یہاں ہم پڑھنے کے لیے آتے ہیں لیکن عجیب بات ہے سٹوڈنٹس نے کانٹ کو بھی میری ہال سمجھ لیا ہے۔“ مسرت جہاں کے ایک ایک لفظ سے جھنجھلاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ غالباً وہ فر جاؤ ملک کے اوٹ پناگ روپے سے تنگ آ چکی تھی۔

”ارے مسرت! کئی ہونم۔ جانتی ہو فر جاؤ ملک کانٹ کی لڑکیوں کے لیے ہاٹ ٹیک ہے کتنی ہی لڑکیاں اس کی چاہت کا دم بھرتی ہیں۔ اس کی ایک نظریانے کو جانے کیا جتن کرتی ہیں اور وہ شخص جو اپنا دامن بچاتا رہا ہے زندگی میں شاید پہلی بار کسی کی طرف جھکا ہے۔“

”یعنی تمہارا خیال ہے کہ میں اس کی حوصلہ افزائی کروں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں کہ وہ مجھے اس اسکینڈلائز کرنے پر مل گیا ہے۔ شکرانے کے نفل ادا کروں اپنی متوقع بدنامی پر۔“ مسرت جہاں جلدے ہوئے انداز میں گویا ہوئیں۔

”کیا بہت برا لگتا ہے تمہیں وہ۔۔۔؟“

”میرا اس سے ایسا کوئی رشتہ نہیں کہ وہ مجھے اچھا یا برے لگے۔ میرے لیے محض وہ ایکس۔وائی۔ زیٹ ہے۔ مجھے چڑھوتی ہے اس طرح کے لوگوں سے جنہیں اپنے سوا کسی کا خیال نہیں ہوتا۔“

”کیا اس نے کوئی بد تمیزی کی ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”کیا کبھی اس نے تمہارا راستہ روکا؟“

”ارے نہیں بھئی۔۔۔۔۔“

”کیا تمہاری ذات میں بے جا انوائمنٹ کی کوشش کی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”تو پھر کس لیے تم اس کی اتنی مخالف ہو۔۔۔۔۔“

”میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا ہے کہ بس مجھے اس کا دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔“

”اس کے اس طرح دیکھنے سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ میری صحت متاثر ہوتی ہے لیکن اس طرح میری پوزیشن آکوز ہو جائے گی اور مجھے اپنی عزت بہت عزیز ہے۔“ مسرت جہاں گھاس کی پٹیاں توپتے ہوئے اپنے سگے انداز میں بولیں۔ ”پتہ نہیں مسرت! کیا وجہ ہے جو وہ تمہاری طرف متوجہ ہوا۔ وہ ایک مہذب اور شائستہ اطوار کا مالک لڑکا ہے۔ کم سے کم اس سے اوجھی حرکتوں کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بہر حال تم اسے ایوانڈ کرنے کی کوشش کرو۔“

”تمہارا کیا خیال ہے میرے ایوانڈ کرنے سے کیا وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے گا۔ نہیں فوزیہ اس کی آنکھوں کا حتمی انداز نہیں دیکھا تم نے۔ یوں دیکھتا ہے جیسے ساری کائنات کو مسخر کر چکا ہو۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ مسرت جہاں اپنی بات مکمل نہ کر سکیں اور اس کی وجہ وہ چیخ تھی جو چند قدم دور بیٹھی لڑکیوں کے گروپ میں سے بلند ہوئی تھی۔ وہ چاروں لڑکیاں سانپ سانپ چلائی ہوئی تیزی سے اٹھ کر ادھر ادھر کو بھاگیں۔ مسرت جہاں اور فوزیہ بھی اضطرابی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ارگرد کھڑے دوسرے لوگ بھی اس طرح متوجہ ہو گئے۔ سیاہ کوبرا پتنگتے ہوئے لان کے بالکل وسط میں آ گیا تھا۔ اس کے پتنگتے میں ایک اضطراب پایا جاتا تھا۔ جیسے وہ کسی ممنوعہ جگہ آ گیا ہو۔ جس طرف آگے بڑھتا وہاں موجود انسانوں کو دیکھ کر اپنا رخ بدل لیتا۔ ابھی تک اس کی کسی حرکت سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی کو نقصان پہنچائے گا لیکن جب اسے کسی طرح جانے کا راستہ نہ ملا تو پھر وہ گھاس پر پھن کر بیٹھ گیا۔ وہاں موجود لڑکیوں کے چہروں پر خوف و ہراس کے سائے لرزاں تھے۔ ایک بلی کو ماحول پر سکوت سا طاری ہو گیا۔ پھر لڑکوں کی مردانگی جیسے جوش میں آ گئی۔ کوئی ڈنڈا پکڑنے دوڑا تو کوئی اینٹ اٹھا لیا لیکن کسی میں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتا۔ سانپ کا ہڈ بیٹ وجود دیکھ کر سب کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ فر جاؤ نے ایک نظر ان سب کی طرف دیکھا اور آگے بڑھا۔

”ارے فرجاد کو یار... کیا کر رہے ہو۔“ عامر اس کی طرف لپکا۔ فرجاد نے خاموشی سے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا لیکن خود جیسے قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔

”فرجاد بغیر کوئی چیز ہاتھ میں لیے یوں آگے مت بڑھو انتہائی خطرناک سانپ ہے ڈس لے گا۔“ یہ روہینہ کی تنکڑ آواز تھی جو فرجاد کی صرف کلاس فیلو ہی نہیں تھی بلکہ اس کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات بھی رکھتی تھی لیکن فرجاد کو جیسے ان سب کی آوازیں سنائی ہی نہیں دے رہی تھیں۔ اس کی ساری توجہ اس سیاہ ناگ پر مرکوز تھی جو اب اس سے محض چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ناگ کو بھی شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ فرجاد اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا چوڑا پھن پھول اور پچک رہا تھا۔ چنگدار آنکھیں فرجاد پر جمی ہوئی تھیں اور اب آہستہ آہستہ اس کا وجود انہیں بائیں حرکت کرنے لگا۔ یوں جیسے وہ اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو۔ سب کی نظریں فرجاد اور سانپ پر تھیں اور سانسیں سینے کے اندر سہم کر جیسے قہقہہ مچتی تھیں۔ سرست جہاں کی نظریں میں خوف تھا اور دھڑکنیں کچھ مضطرب سی ہو گئی تھیں۔ فرجاد رک گیا اس کی نظریں ناگ کے چوڑے پھن کو تک رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا لیے۔ پہلے دایاں ہاتھ متحرک ہوا تو سانپ کی پوری توجہ اس کے دائیں ہاتھ کی طرف ہو گئی اس کا پھن گھوم گیا تھا۔ فرجاد نے بہت دیر سے اپنے جسم کو حرکت دی اور اب بایاں ہاتھ سانپ کے قریب سے گزرا۔ سانپ کا رخ ایک بار پھر بدل گیا۔ فرجاد اس کی توجہ اپنے ہاتھوں کی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہاتھ کی حرکت کے ساتھ سانپ بھی تیزی سے رخ بدل رہا تھا۔ اور پھر یکدم ایک کوند سا لپکا تھا۔ ایک ٹانے کا کھیل تھا جو دیکھنے والے کے احاطہ بصارت میں بھی نہ آسکا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس کا دہتا ہاتھ حرکت میں آیا اور سانپ کا پھن اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ سانپ کا بقیہ جسم تھلکاتے ٹل کھاتے ہوئے کبھی اس کے بازو سے لپٹ رہا تھا اور کبھی نیچے کو لٹک جاتا تھا۔ فرجاد نے ایک نظر اپنے ارگرد سناکت کھڑے افراد پر ڈالی۔ مسکراتے ہوئے اس نے سانپ کے سر کو ہلکا سا سہلایا اور پھر اسے اسی جگہ چھوڑ دیا جہاں سے پڑا تھا۔ لڑکیوں کی کھٹی کھٹی جھپٹیں سنائی دی تھیں لیکن یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے تھے کہ سانپ نے فرجاد کو ڈسنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ رینگتا ہوا کالج کی باؤنڈری کی طرف بڑھ گیا تھا۔ سب کے چہروں پر اطمینان پھیل گیا۔ سینوں میں دبی سہمی ہوئی سانسیں سکون آور ہوا کے لمس سے آشنا ہوئیں۔ فرجاد مسکراتے ہوئے عامر کی جانب آ گیا۔

”یار فرجاد! تم نے تو آج حیران کر کے رکھ دیا لیکن یا اس قدر خوفناک قسم کا کوبرا تھا۔ اگر وہ تمہیں ڈس لیتا۔“ عامر کی بات سن کر فرجاد مسکراتے لگا۔ ایک ترجمی سی نظر سرست جہاں پر ڈالتے ہوئے گویا ہوا۔

”ڈسنا اس کی فطرت ہے اس سے مفر نہیں لیکن محبت میں اتنی طاقت ہے کہ اس کے آگے کبھی نہ کبھی گھٹنے ٹیکنے پڑ جاتے ہیں۔ وہ مجھے کیوں ڈستا جبکہ میرے ہاتھ کے محبت بھرے لمس سے آشنا ہو چکا

تھا۔“ ایک معنی خیز مسکراہٹ اور اپنی طرف اس کا یوں دیکھنا سرست جہاں کو ایک بار پھر چڑا گیا۔

”یہ شخص مجھے سخت رو پیے پر مجبور کر کے رہے گا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی فوزیہ کے ساتھ کلاس روم کی طرف چل دیں۔ باقی کا سارا دن فرجاد ملک انہیں دوبارہ نہیں دکھائی دیا تھا غالباً وہ کالج میں تھا ہی نہیں۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔

اگلے دن کالج میں آتے ہی غیر ارادی طور پر ان کی متلاشی نگاہوں نے وہاں کا جائزہ لیا تھا جہاں وہ ہر روز اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھتا تھا لیکن آج وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ پہلے دو بیڑیز کے بعد باقی کا سارا دن بیکار تھا۔ آج فوزیہ بھی نہیں آئی تھی وہ اکیلی تھیں اور شا کر بھائی نے اپنے ناظم پر آنا تھا۔ سو بوریت سے بچنے کے لیے انہوں نے سوچا کہ لائبریری میں وقت گزار لیا جائے۔

اس وقت بیشتر سٹوڈنٹس کلاس رومز میں تھے جو فوری تھے وہ لان میں جا بجا ٹولیاں بنائے گئیں ہانک رہے تھے۔ وہ نظریں جھکائے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر لائبریری میں داخل ہو گئیں۔ وسیع و عریض لائبریری اس وقت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ صرف لائبریرین سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں لیکن وہ کافی فاصلے پر تھیں۔ سرست جہاں ابھی ان کی طرف بڑھنے لگی تھی کہ سامنے رکھے ایک ریک کے عقب سے وہ نکل کر ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ ایک لمبے کوتو وہ اسے اپنے سامنے پا کر بدحواس ہو گئیں۔ گھبرائی ہوئی نظریں سے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی گہری خاموش نگاہیں ان کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہی بے باک نہ محبت آنکھیں جن سے سرست جہاں پچھا چھڑانا چاہتی تھیں۔ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی تھیں اور نہ ہی اسے کرنا چاہتی تھیں۔ وہ محبت جیسی گھڑی افورڈ نہیں کر سکتی تھیں اور یہ شخص اپنی آنکھوں سے جانے کیا کیا پیغام دینے لگا تھا۔ اور آج ان کی مسلسل خاموشی سے ہبہ پا کر وہ ان کا راستہ روکنے کی ہمت بھی کر چکا تھا۔ اگر وہ اسے روک نہ پائیں تو آنے والا کل کس قدر بے یار و مددگار حقیقتیں لے کر آنے والا تھا وہ اس سوچ سے بھی لرزنا لگی تھیں۔

”رستہ چھوڑیں ہمارا۔“ ایک سرسراتی ہوئی آواز ان کے حلق سے برآمد ہوئی۔ حقیقتاً فرجاد ملک انہیں بہت پریشان کر رہا تھا۔ ان کی بات کے جواب میں بھی فرجاد ملک لُس سے مس نہیں ہوا۔

”ہم... ہمیں جانے دیں پلیز... آپ کیوں پریشان کر رہے ہیں۔“

”سرست جہاں میں... میں آپ کو پریشان کر رہا ہوں... میں آپ کو پریشان کیوں کروں گا۔ مجھے تو بس آپ کے قیمتی وقت میں سے چند لمحے درکار ہیں۔“

”کس لیے...؟“

”کچھ ڈسکس کرنا ہے آپ سے...“ فرجاد ملک ہنوز مطمئن لہجے میں بولا۔

”میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی براہ کرم میرا راستہ چھوڑیں۔“ مسرت جہاں نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

”لیکن میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جو احساس آپ سے متعلق میرے دل کے اندر پنپ رہا ہے اس سے آپ کو آگاہ کروں۔ میں نے آج تک کبھی کسی کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا اور شاید اسی لیے خودداری اور ناتوامی مجروح ہونے کے خیال سے میں نے اتنے دن خود کو روکا لیکن..... جذباتوں پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا تاں۔“

”یلمیز فرجاد صاحب! لفظوں کی حرمت کو ضائع مت کیجئے گا کوئی ایسا مطالبہ کوئی ایسی امید وابستہ مت کیجئے گا جس کا اختیار میرے پاس نہ ہو۔“ مسرت جہاں فرجاد ملک کے رویہ بول پڑیں۔ وہ کچھ کچھ جان گئی تھیں کہ فرجاد ملک کے اگلے جملے کیا ہوں گے۔ اسی لیے انہوں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا لیکن شاید فرجاد ملک کے لیے اپنے محسوسات پر بند باندھنا ناممکن ہو گیا تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ جذباتوں کو مستحضر کرنا انہیں بے وقعت کر دینے کے مترادف ہے لیکن محبت کے آگے انسان ایک مقام پر اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ اسے جذباتوں کو بھی اظہار کی زبان دینی پڑتی ہے۔ اور آج آپ کے سامنے میں نے اپنے جذباتوں کو بھی اظہار کی زبان دے دی ہے۔ اب یہ آپ کے اختیار میں ہے خواہ ان جذباتوں کو اپنے دل میں **بے اعتبار** کر دیں۔ خواہ ٹھکرا کر بے توقیر کر دیں۔“ لفظ ساتھ چھوڑ گئے تھے یا پھر زبان فرجاد ملک خاموش ہو گیا۔ مسرت جہاں کی ساکت آنکھیں فرجاد ملک کے وجہ چہرے پر کئی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں معصوم التجائیں اور محبت کا بچ امید بن کر چمک اٹھا تھا۔ مسرت جہاں کے لیے یہ لمحے جیسے حیرت کا ایک بحر بیکراں تھے ان کے لبوں پر خاموشی کا قفل لگا ہوا تھا اور آنکھیں تجاہل آمیز حیا سے پھٹکے نکلیں۔

”مسرت جہاں! آج آپ کا کانٹا میں پسلا دن ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ باج میں پڑنے کے لیے جاتے ہیں۔ دیگر سرزمینوں میں شمولیت ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ اسے آپ ہماری پہلی اور آخری نصیحت، تنبیہ یا پھر حکم سمجھ لیں کہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں ہماری عزت و حرمت کا خون مت شامل کیجئے گا۔ جس بے دانش پوشاک میں ملبوس ہیں آپ اس پر ہم ذلت کا کوئی چھینٹ نہیں برداشت کر پائیں گے۔“ ایک کوندتا ہوا لہجہ ان کی سماعت کے نہاں گوشوں سے نکلا اور ایک پل کے اندر اندران کا سارا وجود کسی ان دیکھے حصار میں مقید ہو گیا۔ ان کی جھکی ہوئی پلکیں انہیں تو فرجاد ملک ان آنکھوں میں ایک لمحہ نہ جھانک سکا۔ ان کی نرم آنکھیں عجیب سی سختی لیے ہوئے تھیں کہ فرجاد ملک کو لگا ان سنگسار چٹانوں جیسی سختی والی آنکھوں کے آگے ان کی آنکھوں میں سجنے والے خواب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ بے وقعت ذروں کی طرح ہیں۔

”نہیں فرجاد صاحب! جو راستہ آپ نے منتخب کیا ہے۔ میں اس رستے پر چلنا تو کیا اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی لیکن آپ سے استدعا ہے کہ میری راہ میں اس طرح حائل ہو کر بار بار میرے سامنے آ کر میری شخصیت کو مجروح مت کریں۔“ ان کا لہجہ سخت سی لیکن فرجاد ملک کو ان لفظوں کے پیچھے چھپا خوف نظر آ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بظاہر پتھر کی طرح سخت نظر آنے والی لڑکیاں موسم سے بھی کہیں زیادہ نرم و نازک ہوتی ہیں۔ حالات کی ہلکی سی تمازت انہیں پھلانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اور مسرت جہاں تو اس کے گلشن دل کا واحد گلاب تھیں۔ وہ یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ یہ گلاب مرجھا جائے۔

”مسرت جہاں! آپ یہ سوچ کر خوفزدہ مت ہوں کہ آپ کے انکار کی صورت میں کسی قسم کے اوجھے ہتھکنڈوں پر اتر آؤں گا۔ آپ کی عزت و حرمت مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ آپ کو اختیار حاصل ہے اقرار کا بھی، انکار کا بھی لیکن انکار کی صورت میں بس اتنی اجازت مجھے دیجئے گا کہ میں آپ کو دیکھ سکوں۔ یہ یاد رکھیے گا کہ کبھی آپ سے سامنا ہوا تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میری نظریں آپ کے چہرے کا طواف ضرور کریں گی۔ آپ مجھے اس سے مت روکنے گا۔ میں کبھی آپ کے رستے میں نہیں آؤں گا نہ ہی میرے کسی عمل سے آپ کو کسی قسم کی پریشانی ہوگی لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ جب میں آپ کے سامنے آؤں تو ان خوبصورت آنکھوں میں حقارت اور اس صبح پیشانی پر ناگواری کی غلٹیں نہ آنے دیجئے گا کہ محبت کرنے والوں کی خودداری مجروح ہوتی ہے۔“ فرجاد ملک اپنی بات کہہ کر رکا نہیں ہوا کہ جمونکے کی طرح لاہری کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ مسرت جہاں کی آنکھوں کے سامنے دروازے کا خالی فریم تھا۔ جہاں سے ابھی ابھی وہ گیا تھا۔ انہوں نے گلاس وال کے پیچھے بیٹھی لاہری پرین کی طرف دیکھا جو اپنے آفیشل کام میں مصروف تھیں وہ بے دم قدموں سے چلتی فرمیں کر رہی پر ڈھبے کی گئیں۔ کون سی کتاب اور کہاں کا مطالعہ دماغ کی ساری صلاحیتیں جیسے چوہا پٹ ہو کر رہ گئی تھیں۔ زندگی کا ایک انوکھا تجربہ ہوا تھا آج انہیں۔ ایک **فحش** ان سے شدید محبت کا دعویدار تھا۔ کیا حقیقی رشتوں کے علاوہ کوئی اجنبی بھی آپ سے اس قدر محبت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ فی الوقت وہ فرجاد ملک کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھیں۔



”بھابی! اندر آ جاؤں۔“ ہینا بھابی نے کتاب پر سے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔
”سرتی! تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پیش آگئی۔“ سرت جہاں مسکراتی ہوئی اندر آ گئیں۔

”کیا بات ہے آج نیند نہیں آرہی۔ کل چھٹی کرنے کا پروگرام تو نہیں؟“ ہینا بھابی نے پوچھا۔
”نہیں چھٹی تو نہیں کر سکتی ایگزامز بالکل سر پر ہیں۔ بس ویسے ہی آپ کے پاس بیٹھنے کو جی چاہ رہا تھا۔“ سرت جہاں ان کے قریب ہلنگ پر بیٹھ گئیں۔

”یہ عارب بھائی کہاں ہیں؟“
”پتا نہیں سرتی! آجکل رات کو بہت دیر سے آنے لگے ہیں۔ کوئی پتا نہیں کہاں جاتے ہیں۔“
ہینا بھابی آزدہ لہجہ میں بولیں۔

”بھابی! عارب بھائی ایسے کیوں ہو گئے ہیں۔ پہلے تو نہیں تھے وہ اس طرح کے۔“
”ارے چھوڑو تم کیا موضوع لے کر بیٹھ گئیں۔ یہ بتاؤ اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں تمہاری؟“
”بالکل ٹھیک۔“

”سرت! جانتی ہو تمہارے بھائی نے کتنی مخالفت کی ہے تمہارے کانچ جانے کی۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ ان کی ایسی سوچ کیوں ہے؟“

”بس بھابی! اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ ابامیاں نے بھی بہت مشکل سے اجازت دی ہے۔ اسی لیے تو میری بی بی کوشش رہتی ہے کہ انہیں کبھی بھی شکایت کا موقع نہ ملے۔“

”بالکل ٹھیک! تمہارے اس قدم کے بعد اس خاندان کی ساری بیٹیوں کے لیے علم کے راستے کھل جائیں گے۔ تمہارا قابل فخر کردار ہی ان کے راستوں کے کانٹے پٹے گا۔ اور سرتی! یقین کرو کہ میں سب سے زیادہ تمہارے حق میں تھی کہ مزید تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ عورت محض فرد واحد نہیں ہوتی نسلوں کی امین ہوتی ہے۔ عورت علم کی روشنی سے بہرہ ور ہوگی تو نسلیں سنور جائیں گی۔“ ہینا بھابی لبرل سوچ کی مالک تھیں۔ عارب بھائی سے یکسر مختلف اور کہیں زیادہ اچھی۔ سرت جہاں کو اپنے گھر میں اماں بی اور ابامیاں کے بعد ہینا بھابی ہی زیادہ اہم محبت و تکریم لگتی تھیں۔ ابھی سرت جہاں ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے لگی تھیں کہ بیرونی دروازہ کھول کر عارب بھائی اندر داخل ہوئے۔ سرت جہاں عارب بھائی کے سامنے زیادہ نہیں ہوتی تھیں کچھ ان کی غصیلی طبیعت اور سخت گیری کے باعث ان سے خائف رہتی تھیں۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سلام کیا اور باہر کو قدم بڑھائے۔

”سرت بیٹا! بیٹھو ناں کدھر جارہی ہو۔“ انہوں نے جیسے رسوا پوچھا تھا۔
”بس بھائی! میں اب جانے ہی والی تھی ایک شٹ کی تیاری کرنا ہے بھابی کے کمرے کی لائٹ

رات قدرے خنکی لیے ہوئے تھی سب ہی اپنے اپنے کمروں میں دیکے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک نظر اماں بی کے کمرے میں جھانکا وہ انہیں عشاء کی نماز میں مشغول دکھائی دیں۔ ابامیاں تین چار دنوں سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے مال بردار نرک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور کافی نقصان بھی ہوا تھا۔ اس لیے وہ اور باہر بھائی دونوں گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں جانا چاہتی تھیں۔ تنہائی اس وقت انہیں کسی عفریت کی طرح لگ رہی تھی کہ اگر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں تو شاید وہ عفریت انہیں نگل ہی نہ جائے۔ انہوں نے چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر وسیع و عریض صحن میں آ گئیں۔ وہ صحن جو دن بھر رونقوں سے بھرپور رہتا تھا اس وقت انتہائی خاموشی اور سناٹے کے باعث ویران سا لگ رہا تھا۔ ان کی نظریں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ اکا دکا بادلوں نے کہیں کہیں ستاروں کے چمکتے چہروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ چاند کی زردی مائل چاندنی کسی مریض کی پھمکی مسکراہٹ کی طرح آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ خنک ہوائ نے انہیں زیادہ دیر تک صحن میں رکھنے نہ دیا۔ بھابی مقوم اور شفقت بھائی جلد سونے کے عادی تھے اس لیے ان کے پورشن میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ زاہدہ بھابی گھر پر موجود نہیں تھیں اور جہاں ہینا بھابی تو ان کے معمولات ہی عجیب تھے۔ سارا دن سوائے اوقات نماز کے وہ کسی نہ کسی گھریلو کام میں مصروف رہتیں اور رات کو بھی دیر تک انہیں مطالعے کی عادت تھی حالانکہ عارب بھائی ان کی اس عادت کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اللہ جانے کیا بات تھی عارب بھابی کی مرضی سے ان کی شادی ہوئی تھی لیکن شادی کے ابتدائی دو سال کے بعد ہینا بھابی کی طرف سے ان کی توجہ بالکل ہٹ گئی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بھابی مقوم تو تھیں ہی بے اولاد اب ہینا بھابی کے ہاں بھی بھی تک کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دی تھی۔ اور کہتے ہیں کہ مرد کو باندھنے والی صرف ایک زنجیر ہوتی ہے اور وہ ہے اولاد۔ اولاد کی خاطر مرد دل سے اتر جانے والی عورت کو بھی برداشت کرتا رہتا ہے۔ سرت جہاں نے ایک نظر ہینا بھابی کے روشن کمرے کی طرف دیکھا اور پھر بلا ارادہ ان کے قدم ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

جلتی دیکھ کر ادھر آگئی۔ "وہ جیسے وہاں اپنی موجودگی کا جواز بتا رہی تھیں۔

"ہاں تمہاری بھابی کو کتابوں، رسالوں کی دنیا زیادہ پسند ہے۔ زندہ انسانوں کی نسبت۔" طنزیہ سالبجہ بیک وقت مسرت جہاں اور شینا بھابی کو چھتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بولا نہیں۔ شینا بھابی بستر سے اٹھ گئی تھیں۔ غالباً عارب بھائی کے لیے کھانا لینے اور مسرت جہاں بھی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئیں تو کافی دیر پہلے کی کیفیت ایک بار پھر وارد ہو گئی۔ کمرے کی ہر چیز اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔ اکیلا پن جیسے پوری شدتوں سے ان پر آن وارد ہوا۔ کوئی شبیہ تھی جو ہولے ہولے پکوں کے درمختل رہی تھی۔ مسرت جہاں کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ صرف چہچہان تھی۔ نارسائی کی چہچہان۔ بے بسی کی چہچہان۔ انہوں نے بارہا اپنے ذہن کے گوشوں سے اسے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی پوری شان سے ان کے ذہن و دل میں براجمان ہو رہا تھا۔

کیا تم نہیں جانتے کبھی کبھی ڈوبنے والے کو سہارا دینے والے خود بھی ڈوب جایا کرتے ہیں۔ یہ محبت۔ یہ جذبہ جو کھلے ہوئے دلوں کو مرجھا دیتا ہے۔ جو سکون میں ڈوبی آنکھوں سے نیندیں غارت کر دیتا ہے۔ کیا نہیں جانتے کہ خواب جب تک آنکھوں کے اندر سجے رہیں سکھ دیتے ہیں لیکن جب ٹوٹتے ہیں تو ان کے بکھرے ہوئے ریزے آنکھوں میں نشتر کی طرح اتر کر بیٹائی چہچہان لیا کرتے ہیں۔ سکون اچھا نہیں لگتا تمہیں۔ کیوں خود بھی اس خارزار میں الجھتے ہو اور میری روح کو بھی اس میں گھسیٹ کر زخمی کرنا چاہتا ہو۔

مسرت جہاں کی بند آنکھوں کے سامنے وہ چہرہ روز روشن کی طرح اپنی آب و تاب لیے ہوئے تھا۔ وہ جتنا اس تصور کو جھٹک رہی تھیں۔ وہ اسی قدر ان کی سوچوں پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ محبت کے بحر بیکراں میں ان کی کشتی جاں ڈول رہی تھی۔ وہ ڈوبنا نہیں چاہتی تھیں لیکن یوں لگتا تھا جیسے ان کے پیروں کے ساتھ منوں وزنی پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ جو انہیں نیچے ہی نیچے پاتال کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ شاید محبت کے اس نادیہ لمس نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ جن محسوسات سے ان کا معصوم دل آج تک نا آشنا تھا۔ صرف چند لمحوں کی ملاقات میں فرجاد ملک نے انہیں ان محسوسات کی حدت سے روشناس کرا دیا تھا۔

"مسرت جہاں! جس اجلی پوشاک میں آپ ملبوس ہیں ہم اس پر ذلت کا چھینٹا برداشت نہیں کریں گے۔" نڈھال و جنگ لب و لہجہ جیسے بازگشت بن کر ان کے چاروں طرف گونجا۔ سماعت شکن الفاظ ان کی روح تک کو لرزائے۔

"لیکن..... لیکن اگر کوئی ہم سے خاموش محبت کرتا ہے تو اس سے ہماری ذلت کیسے ممکن ہے۔" انہوں نے کمزور سادفہ کیا تھا پتا نہیں اپنا یا فرجاد ملک کا۔

کیا تم جانتی نہیں مسرت جہاں کہ محبت کی دھیمی دھیمی آج جو فرجاد ملک کے دل میں دھک رہی ہے اس کی بہت ہلکی سی حرارت تمہارے دل کو بھی تو چھو رہی ہے۔ کیا تم نہیں جانتی کہ جب چنگاری خشک جھار یوں پڑ گرتی ہے تو کیسے بھانجڑ جلتے ہیں۔ ایسے کہ صرف جھار یاں ہی نہیں ارد گرد موجود ہر درخت اور گھاس بھی اس کی لپیٹ میں آ جایا کرتی ہے۔ پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ محض فرجاد ملک کی محبت تمہارے لیے ذات کا باعث نہیں بن سکتی۔ دماغ کے الفاظ کسی کوڑے کی طرح ان کی روح پر پڑے تھے۔ وہ تڑپ گئیں۔ پھر پھر اب میں کیا کروں۔ کیا فرجاد ملک کو سمجھاؤں۔ اسے روکوں کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ ٹھیک نہیں۔

کیا وہ تمہاری مانے گا؟ تمہارے کہنے سے رک جائے گا؟ اسے پگلی یہ محبت ہے کوئی دو چار منٹ کا سفر نہیں تمام زندگی کی مسافت ہے۔ جب تم اس کی محبت پر ایمان لے آئی ہو تو پھر اقرار کیوں نہیں کرتی۔ کیوں نہیں کہتی کہ تم بھی اسے پسند کرتی ہو۔ دل کا اپنا ہی فیصلہ تھا۔ مسرت جہاں سنانے میں آ گئیں۔

نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے یہ غلط ہے۔ وہ جیسے اپنے آپ سے لڑنے لگیں۔ دل اور دماغ کی مسلسل جنگ کا کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں بننے لگی تھیں۔ پونے دو آلودہ ہو چکے تھے لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

کیا میں کالج چھوڑ دوں۔؟ انہوں نے خود سے سوال کیا۔ لیکن درحقیقت وہ ایسا چاہتی نہیں تھیں۔ "کیوں؟ کالج کیوں چھوڑ دو بس اسے نظر انداز کر دو۔ اس کی طرف دیکھنا بھی مت۔ اگر سامنا ہو تو کترا کر گزر جاتا یہ سمجھ کر کہ وہ ایک اجنبی ہے محض اجنبی تم اسے جانتی ہی نہیں۔"

"لیکن کیا نظر انداز کر سکو گی تم اسے۔ کیا بھول سکو گی اس شخص کو جس نے پہلی بار زندگی میں پہلی بار تمہارے درول پر دستک دی ہے؟" مسرت جہاں کے دل نے ان سے سوال کیا۔

"نہیں۔ شاید شاید میں اسے بھول نہیں سکوں گی۔" ان کا کنوارا دل محبت کی تال پر رقصاں تھا۔ دھڑکنیں بے ترتیب مگر خوبصورت انداز میں رواں تھیں۔ دماغ جیسے ان کے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ ان کی نگاہوں کے سامنے باب عشق کھلا ہوا تھا۔ خود بخود ان کی نظریں اس دہلیز پر جھک گئیں۔ فرجاد ملک کی بے پایاں محبت کے سامنے ان کے دل و دماغ نے ہتھیار ڈال دیئے تھے ہر سوچ، ہر مسئلہ پس پشت ڈال کر سوچوں سے خواب بننے لگیں۔

مسرت جہاں ساری رات سو نہیں سکی تھیں شاید یہی وجہ تھی کہ صبح جب وہ کالج کے لیے تیار ہوئیں تو ان کی طبیعت میں عجیب سا بوجھل پن تھا۔ شینا بھابی بھی ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ متورم آنکھیں، جن کے گوشے ہلکا گلابی بن لئے ہوئے تھے اور کچھ پتھر بھیکے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"مسرتی کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ تشویش بھرے انداز میں بولیں۔ "بس بھابی! سر کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔"

”خدا خواستہ بخار تو نہیں۔“

”نہیں۔“ انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

”مسرتی! مجھے تو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بہتر تھا آج چھٹی کر لیتی۔“ ہنسنے بھابی ایسی ہی تھیں ہر ایک کے لیے ہر لمحہ متشکر اور محبت بھرا دل رکھنے والی۔

”نہیں بھابی! آج ٹیسٹ ہے بہت ضروری۔ اس لیے جانا پڑے گا۔“ گھر میں بھی تو سکون نہیں ملے گا ناں۔ انہوں نے دل میں سوچا لیکن کہا نہیں۔ شاکر بھائی تیار ہو کر آئے تو ان کے ساتھ کالج آگئیں۔ آج کل فوزیہ بھی نہیں آ رہی تھی۔ کالج میں داخل ہوتے ہی تھوڑا فاصلے پر فرجاد ان کو نظر آ گیا۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے تنہا کھڑا تھا اور اس کی نظریں بڑی بے قراری سے گیت پر جمی ہوئی تھیں۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ جیسے پُر سکون ہو گیا تھا۔ مسرت جہاں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر حسب معمول سر جھکائے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھنے لگیں۔

”مسرت ایک منٹ بات سنئے۔“ بہت دھیمے انداز میں وہ بولا تھا۔ انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ ان کے بہت نزدیک کھڑا تھا۔ ایک نظر چاروں طرف ڈالی انہیں یہی لگا جیسے ارد گرد موجود سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہیں سب لوگوں کی نگاہوں میں ان کے لیے تسخیر ہے طفر ہے۔ ذومعنی نظریں انہیں اپنے چہرے پر چھٹی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن کل کی طرح آج وہ اسے انور نہ کر سکیں۔ شاید دل میں کوئی چور بیٹھا تھا۔ جو حکم چلا رہا تھا اور وہ اس کی بات مان کر کچھ نہ بولیں بس ایک لفظ ”جی“ ان کے حلق سے برآمد ہوا۔

”مسرت! آپ۔۔۔ آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا بات ہے؟“

اس کے لہجے میں اپنے لیے پریشانی محسوس کر کے وہ پہلی بار اس کے سامنے مسکرائی تھیں۔ اور فرجاد ملک دھوپ چھاؤں کا یہ روپ دیکھ کر جیسے بالکل ہی دیوانہ ہوا اٹھا تھا۔ گیلی گیلی جھیل سی آنکھیں اور کلیوں جیسے نازک ہونٹ، آنسوؤں اور مسکراہٹ کا ملا جلا استخراج۔

”نہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔“ انہوں نے مختصر سا جواب دے کر قدم آگے بڑھانے چاہے۔

”مسرت جہاں! کیا آج۔۔۔ آپ میرے ساتھ ایک کپ کافی پیئیں گی۔“ ان کی مسکراہٹ اور جواب سے اس کی ہمت بڑھی تھی۔

”کیا اس وقت۔۔۔؟“ وہ کچھ حیرانگی سے بولیں۔

”نہیں۔۔۔ آپ جس وقت کہیں۔“ فرجاد سر جھکا کر بولا۔ مسرت جہاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بے ریا، نہ غلوں، محبت بھرا یہ چہرہ، کیا اس کا باطن بھی اتنا ہی بے ریا اور محبت بھرا ہے۔ وہ سر جھکائے ان کے جواب کا منتظر تھا اور وہ اس کے متعلق سوچ رہی تھیں۔

”آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔“ اس نے استفسار کیا۔

”پہلے دوپیر یڈز کے بعد میرے پاس کچھ ناٹم ہے۔ آف ناٹم کے بعد میں کہیں نہیں جاسکتی۔“

وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔ دوپیر یڈز کرنے کے بعد جب وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلیں تو فرجاد ملک انہیں اپنا منتظر ملا۔ مسرت جہاں نے چادر سے اچھی طرح اپنا وجود چھپا رکھا تھا۔ اس کے پیچھے بانٹک پر بیٹھتے ہوئے مسرت جہاں کے دماغ نے ایک بار پھر احتجاج کیا تھا لیکن دل کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی۔ فرجاد ملک بانٹک چلا رہا تھا لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ ہوائوں میں اڑ رہا ہے۔ جس چہرے کے خال و خد نے گچھلی بہت سی راتوں کو اسے فینڈے محروم کر رکھا تھا وہ بقیہ شام

ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کر جہن کے لیے روتے ہیں

وہ اپنے شہتال میں آرام سے سوتے ہیں

کی تصویر بن گیا تھا۔ جس چکر کو تراشتے تراشتے اس کی سوچیں اس کا تخیل لہو لہو ہو گیا تھا۔ اس کے بالکل قریب براجمان تھا۔ اس کے وجود کی جیسی جیسی آج آج فرجاد ملک کے وجود و روح میں مسرتوں کی ہر طرف پکھلا رہی تھی۔ محبت کی حرارت مل رہی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے صدیوں سے وہ غارتوں کے سردخانوں میں کرلا رہا تھا لیکن محبت نے کبھی مجھ تک نہ دیکھا تھا اور آج آج محبت خود چل کر اس کے پاس آگئی تھی۔ ساری خشکیوں کا ساری ریاضتوں کا ثمر آج اسے مل گیا تھا پہلے جذبے اس کے من مندر میں جاگے تھے۔ ایک دیوی تھی جس کے چہرے میں پجاری کی طرح وہ محبت کے قبول و ان کرتا رہا تھا۔ اسے لگا اس کی بھینٹ قبول ہوئی تھی۔ اس سوچ کے ساتھ ہی من میں طلب جاگ اٹھی تھی۔ جس سے محبت کی جاتی ہے اس کو پانے کی آرزو، خود، خودوں میں جنم لے لیتی ہے۔ اور آج جب وہ حسین بیکر اس کے انتہائی قریب تھا اس کا دل چاہا یہ سننا **سنا رہی تھی** پر محیط ہو جانے۔ یہ مانوس خوشبو جو اس وجود سے اٹھ رہی ہے تمام عمر میں اسی خوشبو کے حصار میں رہوں۔ دھڑکنیں رک جائیں وقت ختم جائے۔ کائنات ختم ہو جائے لیکن یہ خوشبو مجھ سے دور نہ ہو۔ اور مسرت جہاں! ان کی سوچیں ایک الگ ہی منظر میں ابھی ہوئی تھیں۔ جس شخص کے سگ، ہمدرد، ہمسفر رہنے کا انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ان کے خاندان کے لیے قابل قبول ہوگا۔ پہلے تو انہوں نے ہر طرح خود کو اس راہ پر چھنے سے روکا تھا۔ اور جب وہ اس راہ پر چل پڑی تھیں تو اب جو بھی ہو جاتا انہوں نے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ بانٹک لگتی تو وہ بھی جیسے سوچوں کے بھنور سے نکل آئیں۔ وہ دونوں ایک بہت بڑے ریسورٹ کے سامنے کھڑے تھے۔

”آئیے مسرت۔ میرا خیال ہے یہاں قدرے سکون ہے ساتھ ایک کپ کافی پی جاسکتی ہے۔“ فرجاد ملک مسکراتے لہجے میں بولا۔ پتا نہیں کیا بات تھی آج اسے اپنی روح پر اذیت ہو رہی تھی۔ آزاد لگ رہی تھی۔ وہ سبک روئی سے مسرت جہاں کے قدم سے قدم ملائے ریسورٹ میں داخل ہوا۔

محبت کا مسافر ہونا انسان کو کتنا معتبر اور خود اعتماد بنادیتا ہے یہ کوئی اس وقت فرجاد ملک کے حسرت آشنا دل سے پوچھتا۔

نسبتاً تاریک گوشے میں رکھے ٹیبل پر وہ دونوں آسنے سانسے بیٹھ گئے۔ فرجاد محبت پاش نظروں سے مسرت جہاں کے صبحی چہرے کو دیکھ رہا تھا اور مسرت جہاں کے رخسار شدت حیا سے متاثر رہے تھے۔ ایک انوکھی کنگ، انوکھی لذت خی انہیں اپنے رگ دپے میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ انجانے خدشوں اور واہموں سے ان کا کمزور سادل گھبرا بھی رہا تھا۔

”مسرت کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن کی ادائیگی میرے جذباتوں کے اظہار کو طمانیت بخش سکے۔ تمام الفاظ محض عامیانہ اور سطحی سے لگ رہے ہیں۔ بہر حال میں نہ تو خود الجھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی آپ کو الجھانا چاہتا ہوں۔ محبت کے رستوں پر سفر کرنے والوں کو زندگی کا ساتھی بن جانا چاہئے یہ میرا خیال ہے کیا آپ اس سے اتفاق کرتی ہیں؟“

فرجاد مسرت جہاں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا جو سرائے اس کی بات بہت توجہ سے سن رہی تھیں۔ محبت کو قبول کرنے کا فیصلہ تو سراسر ان کا ذاتی تھا لیکن شریہ۔۔۔ گی چٹنے کا اختیار ان کے والدین نے انہیں نہیں دیا تھا۔ یہ حق اماں بی اور بابا میاں کا تھا۔

”میں اس بات کا فیصلہ تنہا کیسے کر سکتی ہوں۔ میری زندگی کا فیصلہ اماں بی اور بابا میاں کریں گے۔“ وہ بڑے سوچ انداز میں بولیں۔

”مسرت جہاں! رشتے زندگی کی خوبصورتی ضرور ہیں لیکن انہیں کمزوری نہیں بنانا چاہئے۔ آپ کی زندگی صرف آپ کی ذاتی ہوتی ہے۔ دوسرے جس طرح اپنی اپنی زندگی جی رہے ہوتے ہیں۔ آپ کو بھی اس کا مکمل اختیار ہونا چاہئے۔ میرا نہیں خیال کہ اپنے بارے میں آپ سے بہتر کوئی آپ کے لیے سوچ سکتا ہے۔“

”لیکن ہمارے ماں باپ بھی تو ہمارے لیے برا نہیں سوچتے۔ انہیں زندگی گزارنے کے بعد ایک مستند تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ جہاندیدہ ہوتے ہیں۔ پھر وہ ہمیں پال پوس کر بڑا کرتے ہیں محبت، توجہ، سبوتیں فراہم کرتے ہیں۔ کیا ان کا اتنا بھی حق نہیں ہوتا کہ وہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ خود کریں۔“

”مسرت جہاں! شاید اس مسئلے میں آپ سے بحث نہ کر سکوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان رشتوں کا مان، اعتبار، محبت میرے دامن میں نہیں ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں یہ بات آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ الحمد للہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی ان کیوں کا احساس بھی نہیں ہوا۔ میں سیلف میڈ انسان ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری قوت فیصلہ آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ رشتوں کی محبتیں انسان کو نہایت بزدل اور کمزور بنادیتی ہیں۔ انسان ان محبتوں کے کھوجانے کے ذریعے

اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا کیے رکھتا ہے لیکن ان رشتوں کی چھاؤں میں رہنا پسند کرتا ہے۔“ فرجاد ان رشتوں سے ناواقف ضرور تھا لیکن ان سے خسلک جذباتوں اور احساسات سے عاری نہیں تھا۔ مسرت جہاں کے سامنے اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ بولا تھا کہ وہ سیلف میڈ ہے اس کی زندگی کا کوئی گوشہ کسی اپنے کے زیر بار نہیں ہے۔

”آپ اکیلے ہیں ماں لیا لیکن کیا کبھی آپ کو احساس نہیں ہوا کہ اس دنیا میں آپ کے بھی چند اپنے ہوتے۔“ مسرت جہاں کے لہجے میں اس کے لیے عجیب سی نرمی اور مناس در آئی تھی۔

”نہیں۔۔۔ یقین کیجئے مسرت جہاں کہ میں نے زندگی کو سکتے دیکھا ہے۔ ایک روٹی کی خاطر آنتوں کی طرح جھگڑتے انسانیت کے علمبردار دیکھے ہیں۔ میرا بچپن فٹ پاتھ کو ماں کی گود سمجھ کر دیں روتے سوتے جاگتے گزرا۔ پتھر کی سل پر سر رکھ کر ماں کی نرم گرم آغوش کا تصور کرنا بھی ایک عیاشی ہے۔ لوگوں کے جوتے صاف کرتے ہوئے جھڑکیاں کھاتے ہوئے کبھی ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ آخر میرا کوئی اپنا کیوں نہیں۔ ہاں ذہن میں یہ تصور ابھرتا تھا کہ مجھے بغیر سہارے کے زندگی سمجھ کر جینا ہے۔ اور آج دیکھ لیں۔ آپ کے سامنے ہوں۔ تین کمروں کا فلیٹ میرا ذاتی ہے۔ بہت اعلیٰ نہ سہی لیکن زندگی کی ہر سہولت سے آراستہ ہے۔ میں نے تعلیم بھی اپنے بل بوتے پر حاصل کی اور آج اس قابل ہوں کہ پریکٹیکل لائف میں قدم رکھ سکوں۔“ فرجاد کا لہجہ بہت ٹھہرا ہوا اور کسی جھیل کی سطح کی طرح ہلے سکون تھا۔ مسرت جہاں دم بخود اس کی داستان حیات سن رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے کی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کہیں اڑ چھو ہو چکی تھی۔

”ہاں لیکن اب۔۔۔ اب احساس ہوتا ہے کسی بہت بڑی کمی کا۔ اب دل چاہتا ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں ایک، صرف ایک میرا اپنا ہو۔ جسے پانے کے بعد کوئی درد کوئی محرومی میرے قریب نہ آ سکے۔“ فرجاد ملک کی لودجی آنکھیں مسرت جہاں کو تک رہی تھیں اور پہلی بار انہوں نے اپنے اوپر ناز کیا تھا۔ فرجاد ملک جیسی شخصیت اس جیسا انسان ان کی ہمراہی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا تھا ان میں ایسا جو اس کی نظروں کو بھا گیا اور وہ اس کے دل میں اتر گئیں۔ محض کچھ عرصہ ہی تو ہوا تھا انہیں ایک دوسرے سے ملے اور اتنی جلدی محبت اور پھر محبت کے حصول کی خواہش۔

”مسرت جہاں! آپ بھی تو کچھ بولیں اتنی دیر سے میں ہی بولے جا رہا ہوں۔ آپ نے ابھی تک کسی قسم کی رائے نہیں دی۔ کوئی تفصیلی بات نہیں کی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ فرجاد ملک کو جیسے احساس ہوا کہ اتنی دیر سے وہ بس خاموشی سے اس کی باتیں سنے جا رہی تھیں۔

”میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ جس پتھر ملی راہ حیات سے گزر کر آپ یہاں اس مقام تک پہنچے ہیں میں اس راستے سے انجان ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک محض محبتیں ہی مجھتیں دیکھی ہیں میں

نے۔ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کی وجہ سے گھر بھرنے لگا اٹھائے ہیں میرے۔ شاید اسی لیے محرومیوں سے ناواقف ہوں۔" مسرت جہاں کی نرم نرم آواز فرجاد کی سماعت کو سہلارہی تھی۔ یہ آواز کیا ساری زندگی اس کے ارد گرد مندر کی گھنٹیوں کی طرح بجے گی۔ کیا یہ حسن کی دیوی عشق کے حضور سجدہ ریز ہوگی۔ جس نے تمام عمر صرف محبتوں کی رفاقت دیکھی ہو جس کے نرم پیچ مٹھلیں قالیوں پر بھی چھل جاتے ہوں۔ جسے کبھی گرم ہوا اس خیال سے نہ چھو پائی ہو کہ کہیں یہ مہکتا پھول مر جھانڈ جائے۔ اس کے سنگ پتھر ملی زمین پر چل پائے گی۔ اتنی محبتوں کی محور و مرکز محض اس کی محبت پر قناعت کر پائے گی۔ کہیں اس کا اجلا وجود گدانا نہ ہو جائے۔ اس کے مہکتے نقوش حوادث زمانہ سے نہ گز جائیں۔ وہ کھوسا گیا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں۔" مسرت جہاں بولیں تو جیسے وہ ہوش میں آ گیا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس یونہی ایک خیال آ گیا تھا کہ کیا اتنی سہل زندگی گزارنے والی بڑی میرے ساتھ گزارا کر پائے گی۔ میں خود ترسی کا شکار نہیں ہوں۔ خود پر بھروسہ ہے مجھے کہ میں زندگی کا ہر لمحہ دے سکتا ہوں تمہیں۔ لیکن اس کے لیے کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔" فرجاد ملک اچانک آپ سے تم پر آ گیا اجنبیت کی ایک اور دیوار محبت کی طرح بھر بھری ہو کر ڈھسے گئی۔

"میں نے بھی زندگی کو ان مادی چیزوں کی احتیاجات سے پس منظر میں نہیں دیکھا۔ نہ ہی یہ میری کمزوری ہیں۔ میں زندگی کو بہت سادگی سے گزارنے کی قائل ہوں۔" مسرت جہاں کی بات سن کر فرجاد ملک مسکرا دیا۔ کس خوبصورتی سے انہوں نے اس کے ساتھ کا اقرار کیا تھا کہ انہیں زندگی میں بہت زیادہ کی طلب نہیں ہے۔ وہ مادیت پرست نہیں محبت پرست ہیں اور زندگی گزارنے کی ترجیحات ان کی اپنے ہمعصروں سے مختلف ہیں۔ ویٹ نیبل پر کافی رکھ کر جا چکا تھا۔

"مسرت کافی لے لیں۔" فرجاد نے ایک کپ ان کے آگے رکھا اور دوسرا اپنے ہاتھ میں تھا لیا۔

"میرا خیال ہے بہت دیر ہوگئی ہے اب چنا چاہئے۔" مسرت جہاں نے گدڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے بارہ بج رہی تھی۔ صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا کافی آف ہونے میں۔ شاید بھائی کا سوچ کر وہ گھبرا گئیں۔

"کیا بات ہے۔ یوں اچانک؟" ابھی کافی آف ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے آپ فرماند مست ہوں میں نام پر آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔ سکون سے بیٹھ کر کافی پیئیں۔" فرجاد اطمینان سے بولا۔

"فرجاد! آپ نہیں جانتے کہ"

"ایک منٹ۔" فرجاد نے مسرت جہاں کی بات کاٹ دی۔ "ایک بار پھر کہیں پہلی بار آپ کے ہونٹوں سے میرا نام نکلا ہے۔ پلیز ایک بار پھر کہیں۔"

مسرت جہاں فرجاد کے اس طرح کہنے پر کچھ جھینپ سی گئیں۔ چہرے پر پھیلی شفقت کی سرخی نے

انہیں اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ فرجاد بڑی دلچسپی کے ساتھ ان کے چہرے کے خال و خدو کچھ رہا تھا۔

ہر سہرے کا ایک ساحل ہے
ہجر کی رات کا کنارہ نہیں
ہو سکے تو نگاہ کر لینا
تم پر کچھ زور تو ہمارا نہیں
گھمبیر لہجے میں خوبصورت لفظ ادا کرتا مسرت جہاں کو وہ بہت اپنا سا لگا۔

کیا یہ محبت۔۔۔ یہ ہماری محبت روایتوں کی بھیئت چڑھ جائے گی۔ یہ شخص جس کے دامن میں کچھ بھی نہیں سوائے ان الوہی جذبوں کے۔ کیا یہ جذبے بھی اس سے چھن جائیں گے۔؟ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ یہ نکھر جائے گا۔ مسرت جہاں کچھ بھی ہو جائے اس شخص کو نکھرنا نہیں چاہئے۔

"مسرت! آپ جو کچھ سوچ رہی ہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہر خدشہ ذہن سے نکال دیں۔ فرجاد ملک ایسا ضرور ہے لیکن کمزور نہیں۔ میرے جذبے بودے نہیں ہیں کہ صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔ میں نے آپ کو اپنا کہا ہے تو زندگی کی آخری سانسوں تک میری وفا میں میرے احساسات صرف آپ کے لیے ہی رہیں گے۔" فرجاد ملک انہیں خاموش بیٹھے دیکھ کر جانے کیا سمجھا۔

"نہیں مجھے آپ کی محبت پر کوئی شک نہیں لیکن میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر اس معاملے کی بھٹک بھی ابا میاں یا میرے بھائیوں کو پڑ گئی تو کس قدر خوفناک اور بھیانک صورتحال پیش آئے گی۔ ایک قیامت آجائے گی۔" مسرت جہاں جیسے جھر جھری لے کر رک گئیں۔

"مسرت! کیا قیامت آجائے گی ایسی باتیں مت سوچیں۔ جب اس راہ پر چل پڑے ہیں تو ہر تکلیف برداشت مل کر کہیں گے۔ ہر طوفان کا مقابلہ کریں گے اس یقین کے ساتھ کہ بالآخر جیت محبت کی ہوتی ہے۔"

"فرجاد مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں اماں بی اور ابا میاں سے اجازت لیے بغیر گھر سے باہر کہیں نکلی ہوں۔"

"اب گھبراہٹ بھول جائیں۔ کبھی کبھی یوں تنہائی میں ملا کریں گے۔ کالج میں تو وقت نہیں ملتا اور چہلو گلیوں کا بھی نشانہ بننا پڑتا ہے۔"

"لیکن فرجاد میرے لیے روز روز آنا ممکن نہیں۔ ہماری فیملی شہر کی معروف فیملیز میں سے ہے۔ سینکڑوں جاننے والے ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔" مسرت جہاں کی سوتی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"مسرت! یہ سب ایک نہ ایک دن ہوتا ہی ہے۔ آپ کے گھر والوں کو علم نہیں ہوگا تو ہم ایک

دوسرے کے کیسے ہو سکیں گے؟ بولیں۔“ فرجاد نے کہا۔ مسرت جہاں کی نظریں ٹھیل کی صاف شفاف سطح پر جمی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے وہ مجھے کاٹکار دکھائی دے رہی تھیں۔

”مسرت! بھروسہ کیا ہے تو اب یقین بھی رکھیں کہ یہ شخص جو آپ کے سامنے کھڑا ہے کم مایہ سہی کم حیثیت سہی لیکن کمتر نہیں ہے۔ اسے اپنے لفظوں کا پاس رکھنا آتا ہے اور اب میرا خیال ہے چلنا چاہئے۔ دیر ہوگئی تو کہیں آپ کے خدشات پہلے ہی دن حقیقت کا روپ نہ دھار لیں۔“ آخری بات اس نے مسکراتے ہوئے کہی تھی۔ مسرت جہاں بھی مسکرا دیں وہ انہیں کانچ کے گیسٹ پر ڈراپ کر کے چلا گیا تھا۔ کانچ میں داخل ہو کر وہ وزیٹرز لابی میں جا کر بیٹھ گئیں۔ چند منٹ ہی تو رہ گئے تھے کانچ آف ہونے میں۔ ان کا دل گھبرایا ہوا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ جب شا کر حسین آئے تو ان سے نگاہیں نہ ملا پائی تھیں۔ شا کر حسین نے کہا بھی کہ کیا بات ہے بی جمالو! لیکن وہ پھر بھی خاموش رہی تھیں۔ درحقیقت دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ خوف اور وحشت کے لئے جلتے استزاج نے ان کے چہرے کو بہت پریشان حال سا بنا دیا تھا۔ اور وہ اپنی کیفیت پر چاہنے کے باوجود قابو نہیں پاسکتی تھیں۔ اور گھر آ کر بھی وہ سب سے یونہی کترائی کترائی پھرتی رہیں لیکن گھر میں کسی کی نظر میں آنا اس لیے بھی مشکل تھا کہ وہ پڑھائی کا بہانا کر کے اپنے کمرے میں پناہ گزین ہوگئی تھیں۔



ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان کے صاف و شفاف چہرے پر سورج کی الوداعی کرتوں نے ایک نظر نواز سرفی پھیلا دی تھی۔ پرندوں کے غول کے غول ادھر سے ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ دھوپ اب سادات نگر کی دیواروں پر پہنچ چکی تھی۔ حسب معمول لان میں کرسیاں بچھائے گھر کی تمام خواتین خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ تمام دن میں یہ وقت ایسا ہوتا تھا جب وزراء خانہ داری وہ گھریلو امور بالکل فارغ ہوتی تھیں۔ اکثر شینا پھپھو چائے کا اہتمام کر لیتی تھیں کیونکہ کوکنگ میں وہ گھر بھر کی استاد تھیں۔ مگر بڑی اماں کے بعد۔ یہ اور بات ہے کہ طویل عرصہ ہوا بڑی اماں نے اس عہدے سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔

آج بھی شینا پھپھو چائے کے ساتھ قمر بھرے سمو سے بنا کر لائی ہوئی تھیں روہیہ اور اہیہ بھی اپنی عادت کے خواتین کے مجمع میں بیٹھی ہوئی تھیں اور آریان کو بھی ساتھ ہی گھسیٹ لیا تھا۔ موضوع ذکر اکثر فواد کی بہن مہوش کی شادی کا تھا۔ جس کے لیے زاہدہ چچی کے بھائی مسعود علی کے لندن پلٹ بیٹے کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ زاہدہ چچی تو بغیر کہے سنے ہائی بھر لیتیں اگر باہر بچا کا ڈرنہ ہوتا۔ انہوں نے فی الحال چپ سا دمچی ہوئی تھی۔

”اری زاہدہ! وہ تمہارا بھتیجا بھلا لندن میں کیا کرتا ہے۔“ بڑی اماں نے اپنے دائیں جانب بیٹھی زاہدہ چچی کو مخاطب کیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ حدیقہ چچی اس گھر کے سب افراد کو ناپسند کرنے کے باوجود ان کے ساتھ مل بیٹھتیں تھیں اور اس وقت بھی وہ وہیں موجود تھیں۔

”اماں بی! خیر سے بہت بڑی ڈگری لے رکھی ہے اس نے۔ وہیں لندن میں ہی کسی اچھی نوکری پر لگا ہوا ہے۔ شادی کے بعد اپنی مہوش کو بھی ساتھ لے جانے کا خیال ہے اس کا۔“ زاہدہ چچی کا جواب سن کر حدیقہ چچی کی آنکھوں میں مسخرمٹ آیا۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے اللہ نصیب اچھے کرے۔“ شینا پھپھو نے خلوص لہجے میں بولیں۔

”بھابی! خیر سے ہمارے فواد میاں بھی تو جوان ہیں ان کے بارے میں کیا سوچا آپ نے؟“ حدیقہ چچی نے عجیب سی نظروں سے آریان کی طرف دیکھ کر زاہدہ چچی سے سوال کیا۔

”اس کے بارے میں“ میں نے نہیں سوچا“ اس نے خود سوچنا ہے۔ جب بہتر سمجھے گا کہ وہ گاہ۔ مسئلہ بیٹیوں کا ہوتا ہے۔ خدا عزت پر دے کے ساتھ انہیں اپنے گھر کا کرے۔“

”بالکل! وگرنہ بیٹیاں جب منہ کو آتی ہیں تو خاندان کی عزت خاک میں مل جایا کرتی ہے۔“ حدیقہ چچی کا یہ جملہ ایک لمحے کے لیے ساری محفل کو خاموش کر گیا۔ اماں بی کے ہاتھوں میں تھالی تسبیح کے دانے حرکت کرنا بھول گئے۔ ماحول میں یکدم کشیدگی درآئی تھی۔

”چچی یہ بھی عجیب کہا آپ نے منہ کو آنے سے عزت کیسے خاک میں مل جاتی ہے۔ ویسے روہیہ کہتے ہیں آدمی کے چہرے پر عزت صرف ناک ہوتی ہے۔ یعنی جب لڑکیوں کے منہ میں دانت آجائیں اور وہ مقابل کو ناک پر کانٹے لگ جائیں تو عزت تو خاک میں مل ہی گئی ناں۔“ اہیہ کی بے توقع بات نے جیسے سب کی توجہ مبذول کروادی تھی۔ چچی حدیقہ پچ دتا ب کھا کر رہ گئیں لیکن بولیں کچھ نہیں۔

”اہیہ! بدتمیزی نہیں۔“ شینا پھپھو نے سرزنش کی۔

”اوہو ماماں میں بدتمیزی کی کیا بات بھلا۔ اماں بی دیکھیں ماماں نے ڈانٹ دی ہیں۔“ اہیہ اماں بی کی پشت سے ان کے گلے کے گرد بازو حائل کر کے اپنا چہرہ ان کے چہرے کے قریب لا کر لڑاؤ سے بولی۔

”ارے شینا بیٹا! ایک ہی تو چپکتی پہل ہے ہمارے گھر کی اس کو تو نہ روکا کرو۔ یہ بچیاں گھر میں موجود نہ ہوں تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔“ اماں بی بھی سنبھل گئی تھیں۔

”اماں آپ کے لاڈ پیار نے اس لڑکی کو تو شتر بے مہار کر کے رکھ دیا ہے۔ مجال ہے جو کوئی کل سیدھی ہو اس کی۔“ شینا پھپھو بظاہر اس کی شکایت کر رہی تھیں لیکن درحقیقت ان کے ایک ایک لفظ میں محبت کا رچاؤ محسوس کر کے اہیہ مسکرانے لگی۔ اسی پل گیسٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ سب کی نظریں اس سمت اٹھ گئیں۔ سیاہ کرولا بہت دھیمی رفتار سے پورچ میں آ کر رکھی تھی۔

”جس فواد اس وقت“ زائدہ چچی نے بندہ آواز میں خود کلامی کی۔ باقی سب بھی قدرے حیران ہوئے۔ ذاکر فواد پچھلے تین چار سال سے کلینک چلا رہے تھے لیکن اس وقت وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور فواد باہر نکلے۔ انہیں دیکھ کر ایک لمحے کو وہاں موجود سب ہی کے دل دھک سے رو گئے۔ پیشانی پر جینڈا تاج اور سفید براق شرٹ پر جامی خون کے دھبے۔ سب کو ان میں بیٹھا دیکھ کر وہ بھی ان کی طرف آنے لگے۔ زائدہ چچی آگے بڑھ کر ان سے استفسار کرنا چاہتی تھیں لیکن ان کے چہرے پر پچھلے تاثرات نے انہیں قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک پتھر جی چپ جیسے ٹکڑا کر روئی تھی۔ چنانچہ جیختی اور بھینچے ہوئے ہونٹوں نے ان کے چہرے کے جاذب نظر نقوش کو بگاڑ دیا تھا۔ ان کی نظروں کا مرکز آریان تھی۔ وہ ایک ملک اس کی طرف دیکھے جا رہے تھے یہ خیال کیے بغیر۔ ان کے ارد گرد بہت سے اور افراد بھی موجود ہیں۔ ان کا ناقابل فہم رویہ سب کو ہی کھٹک رہا تھا۔

”کیا بات ہے فہدی! یہ کیا ہوا؟“ زائدہ چچی کی بے قرار متاخمہ نہ سکی۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ فواد جب اس درجہ شدید کیفیت میں ہوتا ہے تو پھر کسی کی نہیں سنتا۔ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے وہ انتہائی کول مائنڈ اور محتاط، ریزہ اور سنجھی ہوئی شخصیت تھی ان کی۔ شافو وادرنی انہیں غصہ آتا تھا اور جب انہیں غصہ آتا تھا تو اس کا رد عمل اس قدر شدید ہوتا تھا کہ گھر کے سب ہی فواد کو کیا رو دو یا رکت کر زانختے تھے اور ان کی اس وقت کی کبھی ہوئی بات کوئی ماننے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی زائدہ چچی کے پوچھنے کے باوجود نہ تو انہوں نے نظروں کا زاویہ بدلا تھا اور نہ ہی ان کے سوال کا جواب دیا تھا۔ البتہ وہاں موجود سب ہی افراد نے ان کی نظروں کا محور دیکھ لیا تھا۔ آریان اس سچویشن سے گھبرا گئی اور اضطراری انداز میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ ہمت کر کے اس نے پوچھ ہی لیا کہ اس وقت اسے اپنی پوزیشن انتہائی آکورد محسوس ہو رہی تھی۔ فواد کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اور رستگی محسوس کر کے وہ اپنے اندر جیسے کٹ کر رہ گئی تھی۔ لیکن انہیں تو جیسے احساس تک نہیں تھا کہ اتنا سخت رویہ وہ کتنی بے ضروری ترکی کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہیں۔ فواد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکا کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر یوں کھڑی تھی جیسے اس سے جانے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ پھر اچانک ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ کوئی سمجھ ہی نہ پایا کہ کیا ہوا۔ فواد نے آگے بڑھ کر آریان کو گلانی سے پکڑا اور تقریباً آٹھینے والے انداز میں پچھو شینا کے پورشن کی طرف بڑھے۔

”ارے، ارے فہدی ایک منٹ ٹھہر و کیا کر رہے ہو“ زائدہ چچی تیزی سے اس کے پیچھے پھیں۔ ”زائدہ! رک جاؤ۔“ اماں بی واحد ایسی ہستی تھیں جو اس عجیب و غریب سچویشن میں بھی حواس برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ شینا پچھو، تائی مقسوم، روبیہ، انیقہ حتی کہ صدیقہ چچی بھی حق دق کھڑی کی کھڑی

روئی تھیں۔

”جانتی ہوں کہ غصے کی اس کیفیت اس دورے کے دوران اسے کسی کی تمیز نہیں رہتی۔ مجرورہ رکھوا اپنے دودھ پر اور سادات کے خون پر۔ ضرور کچھ غیر معمولی ہوا ہے جو بچے اتنے سخت رویے سے پیش آیا۔ انتظار کرو ابھی پتا چل جائے گا۔“

”اماں بی اسے اتنا خیال نہیں آیا یوں سب کے درمیان سے ایک اجنبی لڑکی کو“ زائدہ چچی بات مکمل نہ کر سکیں۔ ان کی آنکھوں میں تذبذب کے احساس سے آنسو آگئے تھے کہ جس بیٹے کے کردار کی قسمیں کھاتی رہی تھیں آج اس نے بھری محفل میں انہیں شرمندہ کر دیا تھا۔

”نہیں زائدہ! کوئی غلط اندازہ مت لگاتا۔ کردار کوئی اتنی معمولی چیز نہیں جسے یوں بے بھر میں پرکھ کر فیصلہ صادر کر دیا جائے۔ فہدی میرا خون ہے۔ میرا ایسا بچہ ہے جو بجا طور پر الاؤ فخر ہے۔“ اماں بی کے چہرے پر اطمینان تھا لیکن وہاں موجود باقی سب خواتین اس غیر متوقع صورتحال سے کسی حد تک برا فروخت ہو رہی تھیں۔

فواد نے کمرے میں داخل ہو کر آریان کو ایک جھٹکے سے سامنے بند کی سمت دھکیلا اور دروازہ بند کر کے چھنی چڑھا دی۔ آریان کے لیے ان کا یہ رویہ ناقابل فہم اور کسی حد تک ناقابل برداشت تھا۔ وہ بیٹہ پٹنھی ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے یوں تن کے کھڑے تھے جیسے وہ جاننے کا ارادہ رکھتی ہو۔

”کون ہو تم؟ کس خاندان سے تعلق ہے تمہارا؟“ بولو سچ جتاؤ مجھے! کون ہو تم؟“ ایک ایک لفظ چہا چہا کر ادا کرتے ہوئے ان کی وحشت بھری آنکھیں اس کے چہرے کے خال و خد کو ٹول رہی تھیں۔

میں میں نے بتایا تو تھا کہ“ بولکھا ہٹ میں وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ ”دیکھو یہ کہانی انہی کے سامنے دہرائی جن کو پہلے تم یہ کہانی سنا چکی ہو اور جنہوں نے تمہاری اس احمقانہ منطق کو تسلیم کر لیا ہے۔ سچ کیا ہے؟ تمہاری اصلیت کیا ہے! میں جان چکا ہوں لیکن تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں میرے سامنے اب جھوٹ مت بولنا۔“ ”میرا یقین کریں کہ“

”تمہارا یقین کروں یا ان دونوں حرام کے جنوں کا یقین کروں جو آج میرے کھینک پر آئے تھے۔“ فواد نے اس کی بات کا نٹے ہوئے سخت ترش لہجے میں کہا۔

”گگ گگ کیا مطلب؟ کون؟“ آریان بے جان لہجے میں بولی۔ ”وہ تمہارے یار جو تمہیں اپنی ملکیت گردانتے ہیں۔ تم روبیہ کے ساتھ بازار گئی تھی وہاں سے وہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں ہمارے گھر تک آ پہنچے۔ اور یہاں سے میرے کھینک کا پتا کر کے آج

وہاں جا پہنچے۔ جانتی ہوں حرام زادوں نے کیا کہا۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہیں خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا جائے نہیں تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے ہمارے لیے۔ دھمکیاں دی ہیں انہوں نے مجھے۔ یہ دیکھ رہی ہو۔“ فواد نے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔

”فلینک میں توڑ پھوڑ کی ہے انہوں نے۔ میرے سٹاف کے سامنے میری عزت و کوڑی کی کر کے رکھ دی۔ انہوں نے تمہاری قیمت ادا کی ہوئی ہے۔ تو کیسے چھوڑ دیں تمہیں؟ اب بتاؤ کس کا یقین کروں۔ تم نے آج تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن آج تمہیں بتانا ہوگا۔ کون ہو تم؟ کیا اصلیت ہے تمہاری؟ کیا؟ کیا حقیقت کیا ہے تمہاری۔ کوئی بکاؤ چیز ہو تم کہ کوئی بھی تمہاری بولی لگا تا پھرے۔ جیسے ان دونوں نے تمہاری قیمت دی ہوئی ہے۔ کیا؟ کیا قیمت ہے تمہاری بولو؟“

آریان کسی بت کی طرح ساکت بیٹھی ان کے لہجے کی سنگ بازی اپنی جان ناتواں پر سہ رہی تھی اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنسا ہوا تھا اور آنکھیں یکدم شہرِ شوشاں کی طرح دیران اور بے صدا نظر آنے لگی تھیں۔

”اب خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ کیا صفائی نہیں روگی۔ کیا رشتہ ہے تمہارا ان دونوں سے۔ کس قسم کے تعلقات رہے ہیں تمہارے ماضی میں ان سے۔؟“ انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ زہر خند نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

”اب یوں سر جھکا کر کیا سوچ رہی ہو۔ کیا اس طرح تم اپنی پاک دامنی کا اپنی پارسائی کا یقین دلانا چاہتی ہو؟ کیا اس طرح یقین آجائے گا مجھے؟ دیکھو مجھے سب کچھ سچ بتا دو۔“ فواد کے اصرار کے باوجود جواب میں خاموشی ہی رہی۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ کیا حقیقت ہے تمہاری؟ کون ہیں وہ؟ کس لیے قیمت ادا کی ہے انہوں نے تمہاری؟“ جواب میں پھر خاموشی۔ فواد اس کی مسلسل خاموشی سے بری طرح جھنجھلا گئے۔

”دیکھو۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بتاؤ مجھے۔ اپنی اصلیت بتا دو۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں کہ تم عورت ہو۔ اس سے پہلے کہ تم پر میرا ہاتھ اٹھ جائے۔ سب کچھ بتا دو مجھے۔ میں عورت پر ہاتھ اٹھانا اپنی مردانگی کی تذلیل سمجھتا ہوں۔“ اس بار بھی اس نے نہ سراٹھا کر دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی جواب دیا تھا۔ فواد کا پارہ انتہا درجے کو چھوٹنے لگا۔

”بھوکو۔“ بکو اس کروا اگر اب بھی تم نہ بولیں تو پھر میں ہر لحاظ بھول جاؤں گا۔ میں اپنے گھر میں تمہارا غلیظ وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ تمہارے وجود کی سیاہی میرے خاندان کے اہلے وامن کو انداز کر دے میں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں دفن کر دوں گا۔“ ڈاکٹر فواد غصے کی انتہائی کیفیت میں تھے ان کی اس بات کے اختتام پر آریان نے سراٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اف خدا یا اس وقت اس

کی آنکھوں کا لہو لہو رنگ، اس کی بیٹھی ہوئی منھیاں اور شدت ضبط سے سرخ پڑتا چہرہ۔ وہ تقریباً چھ پڑی۔

”آؤ۔۔۔ آگے بڑھو۔۔۔ گلا گھونٹو میرا۔۔۔ دیکھ کس بات کی ہے؟۔۔۔ کس چیز کا انتظار ہے؟ میں بھی تو دیکھوں ایک مرد کے ہاتھوں میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ میری اصلیت پوچھتے ہو۔ اپنی اصلیت تو جان لو۔ کتنے چہرے ہیں تم مردوں کے، کتنے روپ ہیں، کتنے پرت ہیں تم مردوں کی ذات کے۔ ایک وہ مرد تھا وہ شریف زادہ جس کا گندا خون میری رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔ اور وہ بھی مرد ہیں جو کسی بکاؤ چیز کی طرح میری قیمت لگا رہے ہیں مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔ اور اور تم بھی تو مرد ہو جو میرا گلا گھونٹنے کو تیار کھڑے ہو۔ آؤ گھونٹو میرا گلا۔ ختم کر دو مجھے۔ میں تو خود اس زندگی سے تنگ ہوں۔ کب جینا چاہتی ہوں میں تمہارے اس معاشرے میں۔ اس گندے معاشرے میں۔ غلاطت کے ڈھیر پر زندگی گزارنا گوارا نہیں ہے مجھے۔ خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کی زندگی کے اس ناگوار بوجھ سے چھٹکارا پا چکی ہوتی۔ مجبور ہوں زندہ رہنے پر۔ میرے ساتھ ساتھ میری اس مجبوری کا بھی خاتمہ کر دو۔ نجات دلادو مجھے اس عذاب خانے سے۔“ وہ ہذیبانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کے منہ سے الفاظ نہیں آگے کے انکارے جھڑپے تھے۔

”کیا سمجھتے ہو تم مرد لوگ۔ کیا عزت، غیرت، انا، خودداری صرف تمہاری ہی میراث ہے؟ کیا سمجھتے ہو عورت کو کیا صرف نفسانی جذبات کی تسکین کے لیے بنایا گیا ایک کھلونا کبھی تم ایک شریف زادے کے روپ میں آتے ہو ایک معصوم اور کچے ذہن کی لڑکی کو اور غلاتے ہو پھر اسے چھوڑ کر جاتے ہو تو پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ جسے اکیلا چھوڑ آئے ہو وہ کس حال میں ہے۔ تمہارے ان چند لمحوں کی تسکین کے نتیجے میں مجھ جیسی سیاہ اور بکاؤ چیزیں دنیا میں آتی ہیں۔ پھر تم ایک نقاب اوڑھ کر آتے ہو۔ ایک تاجر ایک خریدار کے روپ میں اور ہماری بولی لگاتے ہو۔ پھر ایک نئے روپ میں آتے ہو ایک سلجھے ہوئے باشعور انسان کے روپ میں پھر کسی بھڑوے کی دو باتیں سن کر پل بھر میں کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہو اور ہمارا گلا گھونٹنے آ جاتے ہو۔ بتاؤ۔۔۔ پہلے اپنی اصلیت بتاؤ۔ ان میں سے تمہارا اصل روپ کون سا ہے؟ سن لو سید فواد علی شاہ کان کھول کر سن لو۔ میں کوئی بکاؤ چیز نہیں ہوں میری عزت اتنی سستی نہیں جس کی تم لوگ بولیاں لگاتے پھر دو۔ بہت بڑا نام بہت بڑے آدمی ہو تم۔ بہت پیسے تمہارے پاس مگر یہ اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ تم جیسے بیسیوں دولت کے شہنشاہ میری عزت کی بولی لگانے اٹھ کھڑے ہوں تو تمہاری سات پشیش تک نیلام ہو جائیں گی مگر میری عزت کی بولی نہیں لگا پاؤ گے۔ اپنی اصلیت تو تم جانتے نہیں۔ میں اپنی اصلیت جانتی ہوں تم بتاؤ تم کیا مننا چاہتے ہو۔ کیا بتاؤں تمہیں یہ کہ میری ماں کو محبت کی کیا سزا ملی؟ یا وہ کوٹھے کی زینت کیسے بنی؟ یا یہ کہ میں ایک طوائف زادی ہوں۔ ہاں! میں کوٹھے

پہ پیدا ہوئی ہوں۔۔۔۔۔ میں ہوں طوائف زادی میں طوائف زادی ہوں اپنی عزت بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ کر آئی ہوں اور دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اپنی عزت کو محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔ اگر خود کو نیلام ہو جانے دیا ہوتا۔ خود کو بدھوں کے حوالے کر دیتی تو آؤ مجھے نوچو کھسوٹو تو تم جیسے غیر مند اور عزت بردار میرے تلوے چاٹ رہے ہوتے۔ بات کرتے ہو عزت اور غیرت کی۔ ان لفظوں کے تقدس اور عظمت سے آشنائی بھی ہے تمہیں۔ فواد علی شاہ! تم ایک مرد ہو مگر زمانے کو میں نے تم سے زیادہ دیکھا ہے۔ حالات کے تھیزے اور وقت کی ٹھوکریں تم سے زیادہ کھائی ہیں۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جو آنکھوں پر بنیاد پرستی کا چشمہ لگا کر دنیا کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جن کے نزدیک حقیقت اور اصلیت اچھا اور برا وہی کچھ ہے۔ جو ماں باپ نے گھنی کی طرح تمہارے دماغ میں ڈالا ہے۔ یا اخلاق کی کتابوں میں پڑھا۔ مگر میں نے میں نے دنیا کو ورق ورق پڑھا ہے۔ وقت کو استر دانا ہے۔ اچھے برے اور صحیح غلط کی تمیز مجھے تم سے زیادہ ہے۔ تم مرد لوگ جو شہروں میں اپنے گلی کوچوں میں شرافت اور عزت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہو کوٹھے اور طوائف کے نام پر تو بہ کرتے ہوئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو۔ کبھی یہ جانتے یہ سوچنے کی کوشش کی ہے کہ آج تک کوٹھے کیوں آباد ہیں۔ صرف تم لوگوں کی وجہ سے۔ کوٹھوں کے درود یوار تم مردوں کو دعامیں دیتے ہیں جن کے دم قدم سے ان میں رونق رہتی ہے۔ کوٹھوں اور طوائفوں سے اتنی ہی نفرت ہے تو یہ سب ختم کر دینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ بتاؤ مجھے۔ بتاؤ مجھے کسی ایک ایسے مرد کا۔ جس نے کبھی اس نیت سے کسی طوائف کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بہن کہا ہو کہ میں اسے اس خلافت کی دلدل سے نکال کر اسے عزت بخشوں۔ کسی کو جینی کہا ہو یا بیوی بنا کر عزت کا سا بھانجھا ہو۔ جب ایسا نہیں ہوگا۔ تمام مرد اپنی ہوس کی بھوک منانے کے لیے کوٹھوں پر جائیں گے تو کوٹھے تو سدا آباد رہیں گے۔ کوئی اور مخلوق تو نہیں اترے گی۔ بتاؤ سید فواد علی۔ دنیا کی کونسی عورت ہے جو شوق سے کوٹھے پر بیٹھنا پسند کرے گی۔ دنیا میں ایسی ہے شمار عورتیں ہیں جن کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا جنہیں بھائی کا مان نہیں نصیب ہوتا۔ پیٹ کا ایندھن بھرنے کو انہیں گھر کی چار دیواری سے نکلنا پڑتا ہے۔ ان کی قابلیت کو بعد میں دیکھا جاتا ہے پہلے ان کے جسموں کو۔ دو ہزار کی نوکری دیتے ہوئے جان جاتی ہے مگر ایک رات کے بیس ہزار بھی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسی مجبور اور لاچار عورتوں کو تم جیسے عزت دار اور غیرت مند کوٹھوں کا رستہ دکھاتے ہیں۔ آریاں بولی تو جیسے صدیوں کے غبار کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا۔ لفظوں کی صورت جیسے زہر اگل رہی تھی۔ اسے خود احساس نہیں تھا کہ وحشت اور جنون کی اس کیفیت میں وہ کیا بولے جا رہی ہے۔ اور ڈاکٹر فواد تو جیسے من ہو کر رہ گئے تھے۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بلا سوچے سمجھے بغیر تصدیق کیے محض دوسروں کے منہ سے چند باتیں سن کر کس قدر ناروا رویہ انہوں نے آریاں کے ساتھ اپنایا۔ اور کیسے سخت

ترش الفاظ کہہ دیئے تھے۔ وہ اپنی جگہ ساکت و مبہوت کھڑے سن رہے تھے اور آریاں بے تکان بولے چلی جا رہی تھی۔

”کوٹھے بُرے گردانے جاتے ہیں شاہ صاحب! کوٹھے والوں کو بھی کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر ایسے اچھوں سے کوٹھے والے بہت اچھے بہت باعظمت ہوتے ہیں۔ آپ کی دنیا میں اخلاقیات اور آداب کے لپکھر چلتے ہیں مگر ان کی گردان کرنے والوں کو اخلاق و آداب کی تمیز نہیں ہوتی۔ یہ تو کب کبہم توڑ چکے ہیں اخلاق و آداب کی روایات کو صرف کوٹھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کوٹھے پر جا کر بے عزت بے غیرت بے حیا اور ان اخلاق باختہ لوگوں سے مل کر دیکھئے گا آپ کو پتا چلے گا کہ اخلاق کیا ہوتے ہیں؟ آداب کیا ہوتے ہیں؟ آپ کی دنیا میں بے شمار سفید پوشوں کے ایسے گھرانے ہیں جو کوٹھوں سے بدتر ہیں۔ کوٹھے والوں کے تو پھر بھی کچھ اصول کچھ ضابطے ہوتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں نے تو انسانیت کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ رشتوں کے تقدس کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ آریاں خاموش ہو گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو آبشار کی مانند رواں تھے۔ اسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ اتنی دیر میں کیا کچھ بول گئی تھی۔ بے ربط لفظ اس کے اندر سے کیا نکلے تھے جیسے اس کے سینے پر دھرا ہوا بوجھ کم ہو گیا تھا۔ وہ حواسوں میں آگئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا ڈاکٹر فواد بالکل ساکت کھڑے خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے محسوس کیا کہ پچھلے کئی لمحوں سے وہ اسی طرح اس کی بے لگنی باتیں خاموشی اور توجہ سے سن رہے تھے۔ ایک دوپل وہ خاموش رہی کہ شاید وہ کچھ بولیں لیکن وہ یونہی چپ رہے۔ اس نے سر جھکا کر اپنی گود میں دھڑے ہاتھوں پر نظریں مرکوز کر دیں اور پھر سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے نواتھا۔

”میں نے جب آنکھ کھولی تو ہر بچے کی طرح میرے کانوں میں اللہ اکبر کی صدا سنیں نہیں گونجی تھیں میری سماعت طفلے کی تھا پ اور گھٹنگھروں کی جھنکار سے مانوس ہوئی۔ مجھے آپ کی طرح پالنے میں لیٹ کر ماں کی لوری سن کر سونا نصیب نہیں ہوا۔ طفلے کی آوازیں میرے لیے لوری کا کام کرتی ہیں۔ میں بچپن میں کھلونوں سے نہیں کھیلی۔ کبھی کھلونے نصیب ہی نہیں ہوئے نوٹے ہوئے گھٹنگھروں کے ساتھ کھیتی تھی میں۔ پھر امی نے مجھے واجبی سی تعلیم خود دی اور پھر کوٹھا قبیعے سے ہر انسنگی مال لے کر مجھے اسکول میں داخل کروا دیا۔ اس لیے کہ میری ماں کوئی طوائف نہیں تھیں وہ بھی پڑھی لکھی سوئی خاندانی عورت تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں اس ماحول میں بس جاؤں سوانہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ گھٹنگھروں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ ماں مجھ سے مل نہیں سکتی تھی لیکن میرا خیال پھر بھی رکھا جاتا تھا۔ گھٹنگھروں نے ہمارے چند دن بعد آتے تو ماں کا خط بھی ان کے ہمراہ ہوتا۔ میری تمام ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ماں کے خط میں میرے لیے تسلی و تسفی ہوتی وہ مجھے ہمیشہ اپنی طرف سے مطمئن کرتی

تھیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں میں ان کی فکر نہ کروں اور خوب توجہ سے دل لگا کر پڑھوں لیکن میں جانتی تھی کہ امی دینی طور پر بہت پریشان رہتی ہوں گی۔ پھر بی۔ اے کے پھر دینے کے بعد ماں کی یاد شدت سے دل میں جاگی تو میں خود کو روک نہ پائی اور ان سے ملنے چلی گئی لیکن اس کے بعد مجھے کالج جانا نصیب نہیں ہوا۔ بڑی نائیکہ نے جو جانے کب سے مجھ پر نگاہ رکھے بیٹھی تھی۔ مجھے کوٹھے کے ماحول اور اس کے رنگ میں رگتنا چاہا۔ مجھے مجبور کیا جانے لگا اس غلیظ دھندے پر جس سے بچانے کی خاطر ماں نے میری جدائی کا بن باس کاٹا تھا۔ ہم دونوں کے انکار نے انہیں مشتعل کر دیا۔ مجھ سے زیادہ تشدد میری ماں نے خود پر سہا۔ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ لیکن نائیکہ نے چھپ کر میرا سودا کر دیا۔ میرے ساتھ دو اور لڑکیاں تھیں۔ ہمیں وہاں چھوڑنے کے لیے ان دو آدمیوں کے علاوہ جو آپ سے ملے گھٹکھرو بابا بھی ہمارے ساتھ جا رہے تھے اور موقع دیکھ کر انہوں نے مجھے بھگا دیا۔ اس دن میں انہی کے چنگل سے نکل کر بھاگی تھی اور آپ کی گاڑی کے سامنے آ گئی۔ میری بد قسمتی کہ میں بچ گئی کاش مر چکی ہوتی کم سے کم آپ کے لیے تو ذلت کا باعث نہ بنتی اور پھر میرے گھٹکھرو بابا۔ میں ان کی طرف سے بھی بہت فکر مند ہوں اگر یہ راز کھل گیا کہ مجھے انہوں نے فرار میں مدد دی ہے تو خدا جانے وہ بھیڑیے ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

”آریان دھیمے لہجے میں بولی۔ آنسو اب بھی اس کی پلکوں کی حدیں عبور کر کے اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ کمرے کی فضا میں ایک بوجھل سی خاموشی در آئی۔ ایسی بوجھل خاموشی ایسا سکوت جس کے نیچے دھڑکنیں بھی دبی دبی سہمی سہمی محسوس ہونے لگیں۔ وہ گھنٹوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ منتظر۔ ڈاکٹر فواد کی طرف سے کسی بات کی منتظر۔

”آریان... آئی ایم سوری۔ مجھے معاف کر دیں کہ میں نے بنا سوچے سمجھے آپ کے ساتھ اس قدر تلخ رویہ رکھا۔ آئی ایم ایکسٹریملی ویری سوری۔“ بہت دیر بعد خاموش فضا میں ڈاکٹر فواد کی جھجکتی ہوئی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔ آریان نے گھنٹوں پر سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ کیا کچھ تھا اس کی بے خواب نظروں میں رنج، ملال، شکوے، مان کے ٹوٹ جانے پر کرچی کرچی ہوتا یقین، توقعات کی ناکامی کا کرب۔ بس ایک نظر کے بعد اس نے پھر سر جھکا لیا تھا۔ لیکن وہ ایک نظر ڈاکٹر فواد کو ان کی اپنی نظروں میں شرمندہ کر گئی۔ ان کا دل اپنے گزشتہ رویے پر انہیں بری طرح ملامت کرنے لگا اور آریان! کوئی اس سے پوچھتا کہ کیا تھیں رکی سا ایک معذرتی لفظ ان زخموں کا مداوا کر سکتا ہے جو فواد کے کہے لفظوں سے اس کی روح پر نقش ہو گئے تھے۔

”میں جانتا ہوں کہ معذرت اور معافی کا یہ لفظ بہت رکی اور چھوٹا محسوس ہوتا ہے لیکن میں واقعی شرمندہ ہوں۔ آج تک میں نے جانے انجانے میں کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا لیکن آج اس گناہ کا مرتکب ہو گیا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جس بات سے دل کو دکھ پہنچنے انسان اسے کبھی نہیں بھول سکتا لیکن

میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہوگی اگر میرے کہے الفاظ پر مجھے معاف کر دیں۔“ ڈاکٹر فواد سخت شرمندہ تھے کہ بنا سوچے بنا تصدیق کیے انہوں نے اس کو اس حد تک ملامت کیا۔ اس کی نسو انیت کی توہین کر دی۔ ان کی باتوں کے جواب میں بھی اس نے سر اٹھا کر نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی بس آریان کی دھیمی دھیمی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اسے اپنے پیروں پر نرم گرم لمس محسوس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک پل کو جیسے اسے زوردار جھٹکا لگا اسے لگا جیسے بجلی کی ٹنگی تاریں اس کے پیروں سے چھو گئی ہوں۔ ڈاکٹر فواد کے ہاتھ اپنے پیروں پر دیکھ کر ایک جھٹکے سے وہ پیچھے ہٹ کر گئی تھی۔ آنکھوں میں حیرت تھی اور رویے میں ہچکچاہٹ۔

”یہ... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”میں جانتا ہوں آریان کہ میرا جرم بہت بڑا ہے ایک با عصمت اور مریم جیسی پاک دامن با کردار لڑکی کے لیے کس قدر ذلت کا باعث ہے کہ اس کی کردار کشی کی جائے لیکن پھر بھی میں معافی مانگتا ہوں۔ اگر ہو سکے تو میرا یہ جرم معاف کر دیں۔“

”نہیں فواد صاحب! آپ نے جو چہچہا۔ ٹھیک ہی کہا۔ مجھے جیسی لڑکی کو بھلا عزت دار گھرانے میں رہنا کہاں زیب دیتا ہے۔ میں تو بہت پہلے ہی یہاں سے جانا چاہتی تھی لیکن سب کے محبت بھرے رویے میرے زخمی پیروں کی زنجیر بن گئے۔ حرماں نصیب ہوں ناں۔ ترسی ہوئی ہوں محبت کو۔ سوچا چلو زندگی کے چاروں محبت کے گھونٹ مل رہے ہیں تو پانی لو۔ کچھ تنگی تو دور ہوگی۔ کچھ پیاس تو کم ہوگی۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے میرا وجود یہاں رہنے والوں کے لیے توہین کا باعث بنے۔ مگر یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ آریان نوٹے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔

”دیکھیے آریان! میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ آپ سے معافی کا خواستہ کار ہوں۔ پلیز مجھے اور شرمندہ مت کریں۔“ ڈاکٹر فواد کے چہرے پر پشیمانی کی تحریر واضح لکھی نظر آ رہی تھی۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھ جیسی لڑکی کے لیے آپ شرمندہ نہ ہوں آپ نے سوری کیا میں نے مان لیا لیکن میں اب یہاں رک نہیں سکتی۔“

”کیوں؟“ وہ اتنا ہی کہہ پائے۔

”اس لیے کہ میں مزید اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتی۔ اس سے بہتر یہی سمجھتی ہوں کہ چلی جاؤں۔“

”آریان! اس کا مطلب یہ ہے آپ نے دل سے مجھے معاف نہیں کیا۔“

”نہیں ایسی بات نہیں۔“

”تو پھر کیا وجہ ہے جو آپ یہاں سے جانا چاہتی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ یہاں سے مت جائیں۔“

”کیا کوئی اور بات رہ گئی ہے۔ کچھ باقی ہے ابھی۔“ آریان کی بھیگی آنکھوں کا سوال ڈاکٹر فواد کو

الجواب کر گیا۔

”میں یہاں رک کر سب کی نظروں سے گریبا نہیں چاہتی۔ جن آنکھوں میں کل تک میرے لیے جیارتا احترام تھا ان آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نہیں دیکھ پاؤں گی میں۔ میں اب مزید کسی عدالت کے آگے جواب دہ ہونا نہیں چاہتی۔“

”نہیں آریان! اگر میں یہ کہوں کہ آپ کو کسی سوال کا کسی تحقیر بھری نگاہ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا تو کیا تب بھی آپ کا یہی فیصلہ ہوگا جواب ہے؟“

”جتنے افراد کے درمیان سے آپ مجھے گھسیٹ کر لائے ہیں آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کی اس حرکت کو وہ شخص مذاق سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ نہیں فواد صاحب! ایسا نہیں ہوگا ان سب کے ذہنوں میں میرے لیے شکوک و شبہات آپ نے خود پیدا کر دیئے ہیں۔“

”آریان! یہ میرا ہیذک ہے۔ میں نے معاملے کو الجھایا ہے تو سلجھاؤں گا بھی میں خود ہی اور یہ میرا وعدہ ہاں کہ آپ سے نہ تو کوئی چمچ پوچھنے کا اور نہ ہی کسی کی نظروں میں آپ کے لیے حقارت یا ناپسندیدگی کا تاثر رہے گا لیکن آپ وعدہ کریں کہ آپ یہاں سے ٹک چکیں گی۔ اس سے کہ جب میں آپ کو اپنے کمرے لے کر آئے تھا تو اسی وقت آپ وایک ٹھریو فو کی حیثیت اور اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ اس گھر سے منسلک ہونے کی وجہ سے آپ سب کا ہی ہیں۔ بس یہی سبب تھی کہ سب ان دونوں نے آپ کے بارے میں سستی باتیں کی تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں آپ سے استفسار کرنے چلا آیا۔“ فواد فواد بہت اچھے سلجھے ہوئے انداز میں گویا تھے۔ کچھ دیر پہلے کی وحشت اور کڑھکی کا اب نام و نشان بھی نہ تھا۔ آریان کی چٹوں پر اس وقت بھی آنسو تھے ہوئے تھے۔

”آپ کی خاموشی کو میں کیا سمجھوں۔ آریان یا انکار؟“

”فی الحال مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع دیں۔ یہ سب گھر کے افراد کے رویوں پر منحصر ہے ممکن ہے میں یہاں رہ جاؤں۔“ اس کے سبب میں ہلکی سی خود اعتمادی اور فیصلے میں کچھ لچک پیدا ہوئی تھی۔ فواد فواد نے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے دو ہیڈ کے قریب چلے آئے۔

”آریان! ایک بات کہوں۔“

”جی۔“ آریان نے ان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

”اس قدر خوبصورت آنکھوں پر اتنا ظلم اچھا نہیں لگتا۔ یہ آنکھیں تو قدرت نے خواب بننے کو بنائی ہیں۔“ یہ کہہ کر دور کے نہیں تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

آریان کا دل دھک سے رہ گیا۔ ”کیا یہ الفاظ فواد فواد جیسے ریزرو بندے کے منہ سے نکلے تھے۔ وہ غیر یقینی سے سوچتی اپنے دل کی سب سے قیمتی چیزوں پر قصاں دھڑکنوں کو شمار کرنے لگی۔

ان میں موجود جیسی جیسی سرگوشیاں کرتی خواتین نے سر جھکائے اپنی طرف آتے فواد کو بڑے غور سے دیکھا تھا، ان کے چہرے پر موجود گہری شرمندگی کا تاثر بھی سب کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ بڑی اماں نے گہری سنجیدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ان کے قریب آ کر خاموشی سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ سبھی خواتین ان کے اس ناقابل فہم رویے کے متعلق جاننا چاہتی تھیں خاص طور پر ایتھ اور روبیہ کو انتہائی تجسس ہو رہا تھا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔

”فواد! یہ سب کیا تھا؟ کیا ضرورت تھی یہ؟ آج سے پہلے تم نے جو کچھ کیا کبھی تمہیں روکا تو کا نہیں گیا۔ سبھی جانتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم غصے میں یوں بے قابو ہو جاتے ہو لیکن آج جو کچھ تم نے کیا ہے اس کا کیا جواز ہے؟“ بڑی اماں کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سختی تھی۔

”بڑی اماں میں سخت شرمندہ ہوں کہ آج ضرورت سے زیادہ اگڑا ست ہو گیا یقیناً میرے اس رویے کی وجہ سے آپ سب کو بھی وقتی طور پر ٹینشن ہوئی ہوگی لیکن میں نے بلا جواز ایسا نہیں کیا۔ دوستوں نے آریان کے ماضی کے بارے میں کچھ باتیں ایسی کہیں کہ میں برداشت نہ کر پایا، ان سے بھی میرا جھگڑا ہوا اور یہ چوٹ بھی اسی وجہ سے لگی۔“ فواد نے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔

”کیسی باتیں۔ کیا کہا انہوں نے آریان کے متعلق؟“ بڑی اماں نے پوچھا۔

”میں وہ باتیں دہراتا نہیں چاہتا بس آپ سب کے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ سب بے بنیاد باتیں تھیں، جھوٹ پر مبنی۔ میرے رویے نے اسے سخت کبیدہ خاطر کر دیا ہے۔ اس کے سامنے مجھے بے حد شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس لیے آپ سب سے کہہ رہا ہوں کہ اس سے کسی قسم کی باز پرس مت کیجئے گا۔ میری اس حرکت کی وجہ سے وہ آپ سب کا سامنا کرنے سے کترائے گی اگر دوستانہ ماحول ملے گا تو شاید وہ سیٹل ہو جائے۔“

”ڈاکٹر فواد جیسے سوچ سوچ کر ایک ایک لفظ ادا کر رہے تھے پھر انہوں نے سب خواتین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی سبھی کی آنکھوں میں یقین روشن تھا۔ فطری سادگی کے باعث سب نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے سوائے حدیقہ چچی کے۔ ان کی آنکھوں میں پھیلتے شکوک و شبہات کے سائے ڈاکٹر فواد کی عمیق نظروں کی گرفت میں آ گئے۔

میں ایک بار پھر بہت پیار سے بہت نرمی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کے کسی رویے سے یہ تاثر نہیں ملنا چاہئے کہ اس گھر کا کوئی ایک فرد بھی اسے حقیر سمجھتا ہے۔ اسے پہلے کی طرح فریض ماحول ملنا چاہئے اور اگر اس کے برعکس ہوا تو یقیناً آپ سب بھی جانتے ہیں کہ جب میرے کئے کا الٹ ہوتا ہے تو اس کا رد عمل کیسا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ سمجھ چکے ہوں گے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔“ یہ باتیں جس پردہ صرف حدیقہ چچی کے لیے تھیں اور حدیقہ چچی فواد کے سامنے بس دانت چسکتی تھیں اور کچھ نہیں کر سکتی

تھیں۔ اس وقت بھی ان کے بظاہر نرم لیکن دھمکی آمیز الفاظ پر وہ دانت کچکا کر رہ گئیں۔

”اگر اپنی بہن کی خوشی عزیز نہ ہوتی تو میں دیکھتی کیسے بڑھ بڑھ کر بولتے ہوتی۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھیں۔ ان کی بہن ایک طویل عرصے سے ڈاکٹر فواد کے خواب دیکھ رہی تھی اور حدِ یقہ چچی بھی لاکھ زاہدہ چچی کی مخالف کسی لیکن ڈاکٹر فواد کے روشن اور تہناک مستقبل کو دیکھتے ہوئے انہیں بھی اذیت کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ڈاکٹر فواد اپنی بات کہہ کر اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئے۔ روبیہ اور اذیتہ سینا پچھو کے ہمراہ اس کمرے کی طرف بڑھ گئیں جہاں آریان موجود تھی یقیناً اس وقت ان تینوں کا مطمح نظر بس یہی تھا کہ کسی طرح آریان کے ذہن پر چھایا ہوا اداسی کا کبر اور کر سکیں کہ وہ جانتی تھیں اس جیسی حساس لڑکی کو ڈاکٹر فواد کے آج کے رویے نے توڑ ڈالا ہوگا۔



کالج کی فضاء ان دنوں ان دونوں کے لیے ہی بہت خوشگوار تھی شاید ہر محبت کرنے والا جوڑا ابتدا میں اسی خود فراموشی کی کیفیت سے گزرتا ہے کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی کہ گرد و پیش میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ مسرت جہاں نے چوٹی میں بل ڈالتے ہوئے سامنے آئینے میں دیکھا۔ صبح رخساروں کی چمک میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں ستارے سے جل اٹھے تھے۔ ہونٹ آپ ہی آپ مسکراتا، گنگناٹا سیکھ گئے تھے۔ یہ گزرے تین ماہ گویا ان کی ساری زندگی پر محیط تھے۔ زندگی بھر خوشیاں ان کے در کی باندی رہی تھیں لیکن جو سرخوشی انہیں اس محبت نے عطا کی تھی اس کے آگے وہ تمام خوشیاں بچ گئی تھیں۔ وہ بہت بدل گئی تھیں، سینے کی اٹھانوں پر دھراؤ پنا اکثر بے خیالی میں کندھوں پر جمو لئے لگا تھا۔ موقع بے موقع کلکھلا کر ہنسا جیسے ان کی عادت بن گیا تھا اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وقت بے وقت آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ خود کو جس ذوق و شوق سے دیکھتی تھیں اگر اس نوعیت کو کوئی اور محسوس کر لیتا تو انہیں پہلی فرصت میں پاگل قرار دے دیتا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی بڑی تبدیلی کسی کو محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بس چند بار انہیں بتا دو پٹے کے گھن میں گھومتے، گنگناٹے دیکھ کر اماں بی نے انہیں نوکا تھا کہ وہ یوں سر جھاڑ منہ پہاڑ پھرنے کو بہت برا سمجھتی تھیں۔ مسرت جہاں نے الوداعی نظر آئینے پر ڈالی اور کتابیں ہاتھ میں تھامے باہر آ گئیں۔

”اماں بی! دعا کیجئے گا آج بڑا مشکل ٹیسٹ ہے۔“

”ارے چند ایٹا! اماں کی دعائیں بھلا اولاد کے سوا کس کے لیے ہوتی ہیں، اپنی تو زندگی گزر گئی اولاد کے لیے سکھ اور شانتی مانگتے، پروردگار تمہیں کامیاب کرے۔“

اماں بی تخت پر بیٹھی قرآن مجید پڑھنے میں مصروف تھیں، انہیں خدا حافظ کہہ کر مسرت جہاں شاکر حسین کے ہمراہ کالج روانہ ہو گئیں۔

اماں بی آج کل مسرت جہاں کے لیے متکرم رہنے لگی تھیں۔ لاڈلی ہونے کے سبب ان کی اٹھان بھی ماشا، اللہ قابل رشک تھی، اپنی عمر سے دو چار سال بڑی بن گئی تھیں گو عمر اتنی نہیں تھی پھر کچھ دار بھی بہت تھیں۔ خاندان بھر میں ان کے جیسی لڑکی کوئی نہیں تھی۔ اماں بی کو تو بھرے خاندان، بھری برادری میں ان کے جوڑ کا کوئی لڑکا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سادات کا یہ بھی مسئلہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں خاندان برادری سے باہر بیاہی نہیں جاتیں۔ اسی لیے اماں بی کا لکھرا پنی جگہ بجا تھا۔ یوں بھی ان کا خیال تھا کہ جب لڑکی آئندہ دیکھنے لگ جائے، پھولوں، خوشبوؤں سے پیار کرنے لگے، خود کو سجاتے سنوارتے ہوئے ہونٹوں کی ہونٹوں میں گنگناٹے تو یہ علامتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ لڑکی کو فوراً اس کے گھر کا کر دینا چاہئے۔

مسرت جہاں کو کالج کے گیٹ پر اتار کر شاکر حسین آگے بڑھ گئے۔ فرجاد روزانہ کی طرح انہیں اپنا منتظر ملا۔ اب ان کے قدم ٹھکتے نہیں تھے بلکہ عجیب ثبات میں اٹھتے تھے۔

آنکھوں میں شوق کا ایک جہان آباد ہو جاتا تھا۔ انہوں نے دل سے اٹھنے والے ہر سوال کو رد کر دیا تھا۔ دماغ میں بننے والی ہر سوچ پر پہرے بٹھا دیے تھے اب ان کی آنکھیں خواب دیکھتی تھیں تو فرجاد کے، کان اس کی آواز سننے کو ترستے تھے اور دل اس کے قدموں کی آہٹ سننے کو بے چین رہتا تھا۔ دو کج کج قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی آئیں۔

”آج پورے تین منٹ لیٹ ہوتی۔“ اضطرابی انداز میں فرجاد نے کہا۔

”فرجاد! تھوڑی بہت دیر سو رہی ہو جاتی ہے۔“

”نہیں ہوتا چاہئے ایسا۔۔۔ تم نہیں جانتیں انتظار کی اذیت دنیا کی ہر اذیت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ امید اور ناامیدی کے درمیان چکراتا انسان کس قدر کرب سے گزرتا ہے تم نہیں جانتیں۔“

”چلیں ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھوں گی اور اب کیا ہمیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔“

”نہیں کینٹین چلتے ہیں، کچھ دیر بیٹھیں گے چائے پیئیں گے پھر اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ سہاراں گے۔“ فرجاد نے کہا پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ کینٹین کی طرف چل پڑے، دونوں کے کلاس فیلوز آج کل ان دونوں کی محبت کے برنگ اشو پر ڈسکس کرتے پھر رہے تھے۔ یہ بات بہت سے لوگوں کے علم میں آ چکی تھی لیکن انہیں تو جیسے کوئی خاص پردہ ہی نہیں تھی، کینٹین میں ٹیبل پر آئے سامنے بیٹھے وہ راز و نیاز میں لگے ہوئے تھے۔

”فرجاد! انتہائی احتیاط کے باوجود لوگ ہمارے متعلق جاننے لگے ہیں۔“

”تو اچھا ہے بقول شاعر ”بدنام جوہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔“ فرجاد نے ان کی بات فہمی میں ازادی۔

”کیا یہ کوئی فکر والی بات نہیں۔۔۔“ مسرت جہاں نے پوچھا تو فرجاد مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”نہیں یہ فکر والی بات ہرگز نہیں۔ خوش آئند بات ہے۔ دیکھو وہ جو شاعر نے کہا ہے ناں کہ مجھ سے پہلے اس گلی تک میرے افسانے گئے۔“

”تو ٹھیک ہے ہماری شہرت اور اس محبت کے چرچے جب تمہارے گھر تک پہنچیں گے تو ہمارا ملنا مشکل نہیں رہے گا وہ خود ہی تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں گے۔“

”اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے، وہ بدنامی کے باعث ہمیں قابلِ نفرت سمجھ کر گلیوں سے ازا بھی سکتے ہیں۔“ مسرت جہاں خوفزدہ لہجے میں بولیں حقیقتاً انہیں اب احساس ہو رہا تھا کہ آگے چل کر کتنی مشکلات ان کے لیے کھڑی ہونے والی تھیں۔

”مسرت! یہ دن، رفاقتوں کے یہ خوبصورت لمحے یوں خوف کی نذر مت کرو۔ دیکھو پہلی بار زندگی میں پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ زندگی میں میرے لیے بھی کوئی خوبصورتی، کوئی ایٹرکشن ہے۔ میرا فلیٹ تمہاری یادوں، تمہاری خوشبوؤں سے آباد ہو گیا ہے۔ مجھے اب تنہائی پری نہیں لگتی، اکیلے پن سے وحشت نہیں ہوتی مجھے۔ خیند میری آنکھوں سے دور نہیں بھاگتی۔ پلیز میرے ان محسوسات کو امر ہونے دو۔ میری زیست کے ویران رستوں میں میری ہم سفر بن جاؤ۔“ فرجاد کا ایک ایک لفظ محبت کے لمس میں گندھا ہوا تھا۔ اور مسرت جہاں کو لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑنے لگی ہوں۔ وہ سمندر سے جھوم کر اٹھنے والی گھٹائیں کر رہا تھا اور مسرت جہاں اس کے لہجے سے بھیگ بھیگ گئی تھیں۔

”تم مسرت! تمہیں میں نے خود سے بھی بڑھ کر چاہا ہے مجھے تم پر اپنی ذات سے بھی بڑھ کر یقین ہے اتنا کہ مجھے گمان ہونے لگا ہے اگر کبھی ساری دنیا بھی مل کر مجھے رد کرنے کی کوشش کرے تو تب بھی تم میری پشت پر ہوگی۔ میرے ہونے کی جنگ مجھ سے بھی زیادہ دل سے لڑو گی، تم مجھ سے بھی زیادہ مجھے چاہو گی، بولو؟ چاہو گی ناں!“

اس کا لہجہ شوخ ہو گیا تھا اور وہ شرمیلیں احساس تلے مسکرائے جا رہی تھیں۔ یہ اونچا لہجہ خود شخص تین چار ماہ میں انہیں کتنا عزیز ہو گیا تھا حالانکہ ابھی کسی کے ساتھ بہت سارا جیون گزار کر بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم اسے جانتے ہیں لیکن شاید مسرت جہاں اسے اتنا جاننے لگی تھیں جتنا اپنے آپ کو بھی نہیں۔ بہار کی اولین صبح کی طرے وہ ان کے دل میں اتر ا تھا، ان کا آئینہ دل اس کی محبت کی سرمئی دھوپ سے بھر گیا تھا، سائبان جیسا وجود ان پر تن گیا تھا اور محبت جب لفظوں میں سمجھ آنے کا روپ اختیار کرتی تو وہ روپ میں پورا کا پورا آن لیتا۔ محبت کیا ہے؟ صرف وہ!!!

”محبت کو دیکھو تو کیسی لگتی ہے بالکل اس کے چہرے، اس کی آنکھوں جیسی۔ محبت اگر مسکراہٹ ہے تو وہ مسکان صرف اس کے ہونٹوں پر جھتی ہے کہیں محبت روپ رکھتی ہے تو صرف اس کا بھیس ہے، صرف وہ ہے۔“ مسرت جہاں کے لیے وجہ سرخوشی، محبت، اعتماد اور یقین کا سہل تھا وہ زندگی انہیں بہت

خوبصورت لگنے لگی تھی۔

”مسرت۔۔۔ تم۔۔۔ تم بھی تو کچھ کہو کوئی ایسا لفظ یا چند ایسے حروف جو محبت کا سکون بن کر میرے اندر اتر جائیں۔“ فرجاد کے لہجے میں تشنگی اتر آئی۔ مسرت جہاں نے ایک نظر اس کے چہرے اور خطر آنکھوں کو دیکھا پھر سر جھکا کر بولیں۔

”مجھ کو اتنا کہنا ہے

پھول، بارش، خوشبو، چندا

مجھ کو اچھے لگتے تھے

اب تم اچھے لگتے ہو!!“

”شکر یہ مسرت! تمہارے، یہ لفظ کسی قیمتی متاع کی طرح میرے دل کے نہاں خانوں میں رہیں گے۔ جانتی ہو میں تمہاری آنکھوں کو کیا کہتا ہوں؟“

”کیا۔۔۔؟“

”سمندر۔۔۔ گہرا چپ سمندر اور میں تمہارے اندر سے ایک جذبے ایک پُر شور جذبے کی طرح اٹھ کر اس سمندر کی خاموش لہروں میں مستلاطم ہو کر نکھر جانا چاہتا ہوں، میں تمہارے دل میں ایک ردھم کی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ تمہاری محبت کے خوش گمان احساس کو سانسوں میں بھر لینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں دنیا میں جب میرا وجود نہ بھی ہو تب بھی لوگوں کو تم میں۔۔۔ میں دکھائی دوں۔“

”فرجاد! ایسی بات تو مت کریں۔۔۔ یہ سفر، یہ مسافت آپ کے سنگ کٹ پائے گی ورنہ میرے حوصلے میری ہمت اتنی مضبوط نہیں ہے۔“

”مسرت! محبت کا وجود اپنی جگہ مسلم سہی لیکن دنیا کی روایات ہمیں یوں ایک ساتھ بھی نہیں دیکھ پائیں گی۔ اس نازک سی ڈور کو ہمیں کسی مضبوط رشتے کی گرہ سے باندھنا ہوگا۔ مسرت! میں تمہارے بڑوں سے تمہارا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن فرجاد! میرے گھر کا کوئی فرد بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہوگا۔“

”کیوں۔۔۔ کیوں راضی نہیں ہوں گے؟ کیا ہمارے جذبے اتنے بے وقعت ہیں۔۔۔ کیا ہماری رائے کی کوئی اہمیت نہیں؟“

”فرجاد! میرا تعلق نجیب الطرفین سادات گھرانے سے ہے۔ ہمارے ہاں صرف نیدوں میں ہی رشتہ دیا جاتا ہے پھر آپ اکیلے ہیں۔“

”ان سب باتوں میں سے میرے اختیار میں کون سی بات ہے کیا بتا سکتی ہو؟“ فرجاد قدرے تلخ لہجے میں بولا۔ ”جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے اس میں کسی قسم کی خرابی ہو تو مجھے رد کیے جانے کا افسوس نہ ہوگا

لیکن جس چیز پر میرا اختیار ہی نہیں اس کی وجہ سے مجھے رنجیت کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔“ اس کے حتیٰ لچھے میں کہے گئے ایک ایک لفظ نے مسرت جہاں کے سامنے اندیشوں کا پنڈورا کس کھول دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اماں بی، ابامیاں، بھائیوں، بھابیوں کے چہرے گھوم رہے تھے، شکوہ، اعتماد اور بھروسے کا خون کرنے کا گھدہ... وہ لرز اٹھیں۔

یہ کون سی طلب جاگ اٹھی تھی ان کے دل میں... کس راہ پر چل پڑی تھیں وہ عجب دورا ہے پر آن پہنچی تھیں آگے جانے کا راستہ مل رہا تھا اور نہ پیچھے پلٹنے کا۔ شوریدہ قدموں نے اتنا غبار اڑا دیا تھا کہ واپسی کا راستہ لگا ہوں سے اوجھل ہو گیا تھا آگے جانے کے لیے پھر بھی فرجاد کا سہارا تو تھا اور انہوں نے اس کا کندھا تھام لیا۔

”لیکن فرجاد! یہ روایت ایسی ہے جو آج تک نہیں ٹوٹی، سید گھرانوں میں غیر سید لڑکیاں بیاہ کر آ سکتی ہیں لیکن سید لڑکیاں بیاہ کر باہر نہیں جاسکتیں۔“

”کیوں؟“ کہیں نہیں جاسکتیں۔ یہ سب ہم لوگوں کے اپنے بنائے ہوئے اصول ہیں، پروردگار نے تمام انسانوں کو برابری کی بنیاد پر تخلیق کیا ہے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی گئی سوائے تقوے کے۔ پھر وہ کون ہوتے ہیں... بھلاہ کسی وجہ کے بغیر مجھے ٹھکرا دیں۔“

”فرجاد! ان سب باتوں کے باوجود وہ نہیں مانیں گے میں انہیں جانتی ہوں۔ خاص طور پر اپا میاں کے غصے کا سوچ کر تو ابھی سے میری جان جا رہی ہے۔“

”مسرت! اس طرح میرے جیسے پست کرنے کی کوشش مت کرو، تم سب کچھ جانتی تھی ناں۔ میرے بارے میں بھی اور اپنے گھرانے کی اقدار کے بارے میں بھی۔“

”ہاں۔ جانتی تھی۔“

”میرے جذباتوں کو پذیرائی بخشنے وقت تمہارے دماغ نے یہ باریکیاں نہیں سوچیں۔ اس وقت ایک ایسے کو بھی ہمیں خیال نہیں آیا کہ انجام کار کیا ہونا ہے۔“

”میں بارگنی تھی آپ کے جذباتوں کے سامنے۔ دل و دماغ کی ہر سوچ، ہر خیال پر پابندی لگا دی تھی میں نے جو میرے قدم روکنے کو بڑھا۔“

”پھر... پھر مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم نے میرے جذباتوں کی پذیرائی کر کے ٹھیک نہیں کیا؟“

”یہ میں نے کب کہا؟“

”کیا میرے کردار، میری شخصیت میں کسی قسم کی کمی یا جھول دکھائی دیا تمہیں اتنے دنوں میں۔“

”یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔“

”مسرت، میں جو پوچھ رہا ہوں، پلیز اس کا جواب دو۔“

”نہیں... میں نے کوئی برائی نہیں دیکھی۔“ مسرت جہاں نے جواب دیا۔

مجھے یہ بتاؤ کہ کیا صرف سادات ہی بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی وارث ہے۔ کیا اچھائی صرف سیدوں تک محدود ہے؟ اگر ایسا ہے تو دنیا میں رہنے والے باقی سب لوگ تو گھٹیا اور حقیر ہوئے۔“ فرجاد کے لچھے میں تخی آگئی۔

”فرجاد! آپ کی خوبیاں، آپ کی شخصیت کی اچھائیاں کیا ہیں یہ تو میں جانتی ہوں ناں، انہیں تو اس بات کا علم نہیں اور میں نے دل میں آپ کو کیا مقام دیا ہے اسے لفظوں میں واضح کرنا ممکن نہیں۔“

”تو پھر مسرت! ایک بار مجھے اپنا ہاتھ مانگنے دو، میں تمہارے امی ابا سے خود بات کروں گا، یہ سید ہاراستہ ہے اور اسے اختیار کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔“

”فرجاد! میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ان کا جواب انکا۔ میں ہوگا۔ آپ لی کوئی دلیل انہیں قائل نہیں کر سکے گی۔ میرے ابامیاں انتہائی بنیاد پرست انسان ہیں۔ ایک تنہا شخص جس کے پاس کوئی رشتہ نہیں یوں ان کے سامنے جا کر ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگے وہ اس بات کو اپنی تو جین سمجھیں گے۔“ مسرت نے کہا تو فرجاد ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔

”ہوں...“ فرجاد نے ہنکارا بھرا۔ ”پھر کیا ہوگا؟“

”کیا مطلب؟“ اس کے بے موقع سوال پر مسرت جہاں اچنبھے سے بولیں۔

”مطلب یہ کہ ہر طرح سے ان کا جواب انکار میں ہوگا؟“

”ہاں۔“

”تو پھر... پھر کیا ہوگا؟“ اس کے سوال کے پیچھے چھپے ہوئے معنی مسرت جہاں کو ایک لمحے کے لیے لا جواب کر گئے۔

”پھر... پھر یہ ہوگا کہ میری پڑھائی چھڑا دی جائے گی، میرے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی جائے گی۔“

”پھر...“

”پھر جلد سے جلد میری شادی کرنے کی کوشش شروع ہو جائے گی۔“

”ہوں... اور آپ کسی دوسرے کی ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہو جائیں گی، ستر فیصد فلمی ہیروئنوں کی طرح مجبور ہو کر۔“

”آپ طنز کر رہے ہیں؟“ مسرت جہاں اس کے لہجہ کی کڑختی سے گھائل ہو کر بولیں۔

”نہیں... میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ تقدیر شروع سے میرے ساتھ یہی کھیل کھیلتی آئی ہے جس چیز کی طلب میں نے کی وہ مجھ سے چھن گئی، رشتوں کا خلوص اور مان تو مجھے شروع سے حاصل ہی

نہیں رہا۔ اب۔ اب تمہاری طرف قدم بڑھائے تو یہ سوچ کر کہ شاید یہاں میری خرمیاں نصیبی کا انتقام ہو جائے، چند خوشیاں اور سکون بھرے سانس مجھے بھی نصیب ہو جائیں لیکن یہاں تم مجبور ہو گئیں۔ تمہاری بے بسی تمہارے بڑوں کو ان کے فیصلے سے باز نہیں رکھ سکے گی اور یہ چاند کسی دوسرے آنگن میں روشنی بکھیرے گا۔ میرے آنگن میں کیا رہا، وہی اندھیرے جوازل سے میرا نصیب ہیں۔“ فرجاد کا لہجہ نکمرا ہوا تھا۔

”نہیں..... ایسا نہیں ہوگا..... میں، میں کسی اور کے نام کی مہندی ان ہاتھوں پر نہیں لگا سکتی۔“

”پھر..... پھر کیا کرو گی تم..... کیا بغاوت کرو گی۔“

”نہیں..... میں زہر کھالوں گی؟“

”واہ..... خوب رہی۔ زہر کھا لو گی۔ ذہن سماتا مسرت جہاں کے دروازے پر باراتی کھڑے ہیں اور ذہن صلب نے زہر کھا لیا۔ پھر جانتی ہو کتنی جگ ہنسائی ہو گی تمہاری اور تمہارے خاندان والوں کی..... تمہارا عزت دار گھرانہ لوگوں کی انشتی انگلیوں کا نشانہ بن جائے گا۔“

”تو پھر..... اس سے کیا فرق پڑے گا، میں تو نہیں ہوں گی ناں یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کو جب ان سب کو میری خوشی کی پرواہ نہیں تو پھر مجھے ان کا خیال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ مسرت جہاں کے لہجے میں فیصلہ کن سختی محسوس کر کے فرجاد کے لبوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اول تو سیدھا راستہ اختیار کریں گے، ہر ممکن کوشش کروں گا کہ وہ مان جائیں لیکن اگر پھر بھی ان کا جواب نفی میں ہو تو پھر سب کچھ ٹھکرا کر دنیا کے کسی ایسے گوشے میں چلے جائیں گے جہاں ہماری محبت کو گناہ نہ سمجھا جائے۔ جہاں ہماری خوشیاں صرف ہماری ذاتی ہوں گی۔ ایک دوسرے کی مکمل رفاقت کا احساس ہم دونوں کو ایک الونہ سکھ سے ہمکنار کر دے گا۔“ فرجاد کی آنکھیں گل کے روشن خوابوں کی چمک سے خمار آلود ہو گئیں۔ مسرت جہاں خاموش بیٹھی اس کی کہی ان کہی سن رہی تھیں۔ فرجاد جس سرزمین کا ذکر کر رہا تھا وہ تو خوابوں کی خیالوں کی سرزمین تھی، اس کی خوبصورت اس کے حسن سے مسرت جہاں کی آنکھیں چمکا چوند ہونے لگیں۔

”آؤ مسرت چلیں..... کافی دیر ہو گئی ہے۔ ہاں ایک بات یاد رکھنا یہاں سے اپنے ساتھ اس یقین کو ہمراہ لے کر چلنا کہ جذبے صادق ہوں تو منزل ضرور مل جایا کرتی ہے۔“ وہ دونوں کیفین سے نکل کر اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ وقتی طور پر الگ الگ راہ پر گامزن تھے لیکن دونوں کے دل اس یقین کے ساتھ دھڑک رہے تھے کہ بہت جلد وہ کبھی نہ جدا ہونے والے بندھن میں بندھ جائیں گے۔



ایک اینڈ والے دن اس گھر کے افراد کی پھرتیاں دیکھنے والی ہوتی تھیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح یہ سب دن چڑھے بستروں پر اٹھنے کی بجائے صبح سویرے ہی اٹھ جاتے تھے، سب سے اچھی عادت ان میں یہ تھی کہ نوجوان نسل ساری کی ساری بڑی اماں کے اندر ہونے کی وجہ سے نمازی تھی۔ ہاں تو ذکر ہو رہا تھا ایک اینڈ کا تو ایک اینڈ پر گھر کے بھی افراد کہیں نہ کہیں سدھار جاتے تھے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ کسی ایک اینڈ پر فواد بھی گھر پر دکھائی دے جائیں اور جب ایسا ہو جاتا تھا تو پھر پروگرام بھی بدل جاتا یعنی پھر سب گھر کے افراد نہیں بلکہ صرف ایک پارٹی کہیں نہ کہیں سیر کو نکل جاتی۔ آج فواد گھر پر ہی تھے لیکن دو تین دن پہلے آریان اور گھر والوں کے ساتھ ان کی جس قسم کی ڈسکشن ہوئی تھی اس کی وجہ سے بہت ریز رو سے ہو گئے تھے۔ رویہ اور ہیئت نے آریان کو بتا کر یہ اس کے ساتھ دہی دوستانہ رویہ رکھا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آریان ایک آدھ دن شرمندگی کے احساس کے باعث سب سے کتراتنی کتراتنی سی رہی لیکن جب کسی نے کچھ ظاہر ہی نہ کیا تو پھر وہ بھی دھیرے دھیرے سیٹ ہو گئی۔ صبح صبح نماز پڑھنے کے بعد فواد کے کمرے میں بنگامی میٹنگ بلائی گئی۔ ہر کارہ خصوصی سیونٹھ نکلاس کے سنوڈنٹ اعلیٰ پچا کے برخوردار طاہر تھے جنہوں نے ایقہ صلحہ کے حکم کے بموجب سب کے دروازے کھٹکنا کر انہیں مطلع کیا اور ٹھیک آٹھ بجے میٹنگ کے تمام اراکین فواد کے بیداروں میں موجود تھے۔ فواد تو اس ہنگامہ خیز جلوس کو دیکھ کر بے چارے حیران و ششدر رہ گئے۔ کوئی رائٹنگ ٹیبل پر چڑھا بیٹھا ہے تو کوئی فلور کشن پر۔ باصر صاحب جنہیں سب سے چھوٹے ہونے کا اعزاز حاصل تھا کچھ زیادہ فریٹک نہیں کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے کے پردے کے ساتھ جمبول رہے تھے۔ فواد نے بیڈ پر بڑھتے جوم کو دیکھتے ہوئے گھبرا کر اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔

”یاد یہ سب کیا ہے؟ میں رات کو بہت دیر سے سویا تھا اور ابھی میرا موڈ نہیں تھا اٹھنے کا۔“ دو جیسے جھنجھلائے۔

”دیکھئے جناب! نیند سے زیادہ ضروری بات ہے جو ہم ڈسکس کرنے آئے ہیں۔“ شاذ ان بکلیہ

گود میں رکھتے ہوئے بڑے اسٹائل سے بولا۔

”کیوں؟ کیا کشمیر کی آزادی کے لیے کوئی مجرب نسخہ ہاتھ لگ گیا ہے۔“ فواد نے ان سب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

”بھائی شکر پڑیاں چلیں۔۔۔۔۔“ انا کو شکر پڑیاں بہت پسند تھی۔

”کیوں کیا شوگر کروانی ہے۔“ طاہر نے مضحکہ اڑایا۔

”سب فیصلہ کر لیں کہ کہاں جانا ہے۔“

”چھتر پارک چلیں۔“ اہیہ نے اپنی ٹیوشن دی۔

”بھئی ہزار بار کی دیکھی ہوئی جگہوں کو پھر دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک تو ہم لوگ بھی بس لکیر کے فقیر ہی ہیں۔“ مہوش بیزادی سے بولی۔ وہ فطرتاً کچھ تک چڑھی اور مغرور سی تھی۔

”اگر میں ایک جگہ ڈیسا نیڈ کروں تو میرا خیال ہے وہ آپ سب کو ہی پسند آئے گی۔“ فواد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کون سی؟“ سبھی بیک وقت بولے۔

”مارگلہ ہلز۔“

”واہ۔۔۔۔۔ یہ ہوئی ناں بات۔۔۔۔۔“ شاذان چنکی بجاتے ہوئے بولا۔

”اصل میں پکنک سانس پر بے اعتبارش ہوتا ہے جس سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے سیر و تفریح کا مزہ دیں آتا ہے جہاں سکون ہو، خاموشی ہو۔“ فواد نے مارگلہ ہلز کو پسند کرنے کی وجہ بھی بتا دی۔

”بس ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ایگزیکٹ نو بجے ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔ اس وقت آٹھ بج کر ہیں منت ہیں، صنف نازک آپ کے پاس چالیس منٹ ہیں۔ اس دوران تیار ہو جائیں لیکن ایک اہم بات بتانا میں بھول گیا۔“

”کیا بات۔۔۔۔۔؟“ وہ سب جو بیرونی دروازے سے نکلنے لگے تھے رک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

”کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔

”لیکن کیوں؟“ اظہر نے احتجاجاً کہا۔

”اس لیے بیٹا جی! کہ کلینک پر دو انتہائی اہم کیمرز ہیں جو میں نے ذیل کرنے ہیں۔“

”تو بھائی کاشف کیا کلینک نہیں آ رہے؟“ حسنین نے فواد کے کو لیگ اور بہت اچھے دوست کا نام لیا جو اکثر ان کی غیر موجودگی میں کلینک کے سارے معاملات کو ہینڈل کرتا تھا۔

”آتا ہے لیکن ان کیمرز پر میں کام کر رہا ہوں۔“

”بھائی یہ فاول ہے! ہم نے آپ کی ڈیسا نیڈ کی ہوئی جگہ ایکسپٹ کر لی پھر۔۔۔۔۔ پھر آپ کیوں نہیں جا رہے۔ اتنے دنوں بعد آریان آپنی بھی ہمارے ساتھ جا رہی تھیں اور آپ نے سارا پروگرام ہی چوہٹ کر کے رکھ دیا۔“ اہیہ منہ پھلائے کہہ رہی تھی۔

فواد نے ایک پل کو خاموش کھڑی آریان پر ایک نگاہ ڈالی اس کی نظریں انہی کو دیکھ رہی تھیں۔ پتہ نہیں انہیں کیوں ایسا لگا جیسے آریان کو ان کے نہ جانے کا سن کر افسوس ہوا تھا۔

”چلو زیادہ منہ مت بسور و کہیں یہ سب ڈری نہ جائیں۔ اتنا اصرار کرتی ہو تو چلے چلے ہیں۔“ فواد بدستور آریان کی طرف دیکھتے ہوئے اہیہ سے مخاطب ہوئے۔ آریان کے لبوں پر غیر محسوس سا تبسم چلا تھا جو فواد کے سوا ہر کسی کی نگاہ سے پوشیدہ رہا۔ سبھی ایک بار پھر چپکے لگے اور جلدی جلدی اپنے اپنے کمروں کی طرف بھاگے۔ مبادا فواد پھر اپنا پروگرام بدل لیں۔ صابرہ کو چالیس منٹ کے شارٹ نوٹس پر لچ کا مینو بتا کر روبیہ اور اہیہ آریان کے ہمراہ اپنے پورشن میں آگئیں اور پھر جب وہ سب تیار ہو کر گاڑیوں میں بیٹھ کر سفر پر نکلے تو موسم بھی کچھ شرارتی سا ہونے لگا۔ بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑوں کی انکلیلیاں دیکھتے وہ مارگلہ ہلز پہنچ چکے تھے۔

”اوبلی بی۔۔۔۔۔ یہ بھی کوئی جگہ ہے بھلا پہاڑی پہاڑ، نہ رونق نہ مزہ۔“ صابرہ ان کے ساتھ ہی آئی تھی تاکہ کھانا دانا گرم کرنے، چائے بنانے میں انہیں پریشانی نہ ہو۔

”ارے بد ذوق! غور سے دیکھو قدرت کی صنایع، فطرت کے شاہکار، ایسا قدرتی حسن نہی پہلے دیکھا ہے۔“ اہیہ صابرہ سے مخاطب تھی۔

”رہنے دو بی بی! ہم تو جانیں زندگی رونقوں میں ہے ایسے ویرانوں میں نہیں۔“

”کنوئیں کے مینڈک کو کنواں ہی اچھا لگے گا۔“ اہیہ برا سامنے بنا کر بولی۔ روبیہ اور مہوش نے اپنے ساتھ لائی ہوئی درمی ہلز سے کے فرش پر بچھائی۔ انہوں نے اپنے لیے نسبتاً خاموش سا گوشہ چنا تھا اور گرد کسی قسم کی چہل پہل نہیں تھی۔ آریان، مہوش، فواد اور روبیہ درمی پر برا جملن ہو گئے، شاذان اور اہیہ بچہ پارٹی کو لے کر پارک کی سمت چلے گئے۔

”کتنی عجیب بات ہے آریان کو ہمارے ہاں رہتے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے لیکن میرا اس سے ابھی تک تفصیلی تعارف نہیں ہوا۔“ مہوش نے کہا۔ درحقیقت آریان کو مہوش کچھ تک چڑھی لگی تھی اس لیے اس نے خود کو اس کے معاملے میں ریزرو کر لیا تھا جبکہ روبیہ اور اہیہ اس کے ساتھ بہت فریگ تھیں۔

”اصل میں تم اپنی دنیا میں اتنا گمن رہتی ہو کہ گرد و پیش کی تمہیں ذرا کم ہی خبر ہوتی ہے۔“ فواد نے اسے احساس دلایا کہ وہ اپنے ارد گرد کو خاطر میں ہی کب لاتی ہے کہ اسے کچھ علم ہو کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

”اب ایسا بھی نہیں، میں ملی تو تھی آریان سے لیکن زیادہ گپ شپ نہیں لگائی۔ ویسے فواد بھائی آپ مجھ پر زیادہ مہترمت کیا کریں، میں اتنی بری بھی نہیں۔“ مہوش مہنویں چڑھا کر بولی۔

”ارے میری بہنا میں مہترمت کر رہا ہوں۔ چلو اس ٹاپک کو چھوڑو، کوئی اچھی سی بات کرو۔“

فواد کو لگ رہا تھا کہ مہوش حسب عادت ماحول کو کشیدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے سو موضوع بدل دیا۔ ابھی انہیں تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایقہ و فیرہ واپس آ گئے۔

”میں اچھی طرح جانتی تھی کہ بور لوگ خاموش بیٹھے ایک دوسرے کے منہ دیکھ رہے ہوں گے۔ ویسے شاذان یہ جو ہمارے بڑے ہیں انہوں نے کیا سنجیدگی کے سارے ریکارڈ توڑنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“

”ہاں لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے، دیکھو ناں ایک طرف تم ڈاکٹر کو بٹھا کر چلی گئیں اور دوسری طرف دو عدد نیچرز جبکہ تیسری طرف ایل ایل بی کی اسٹوڈنٹ براہمان ہیں، اب خود سوچو جن پر پوری قوم، پورے ملک کی سلامتی و ترقی کا دارومدار ہو رہا ہے کیا میری تمہاری طرح ہنستے پھرے گے۔ نہیں، حکومت پاکستان نے ان جیسے سنجیدہ لوگوں کے لیے ایک قومی چھٹی کا اعلان کیا ہے جس دن ان سب لوگوں کو دیوار تہجد کے سائے میں لے جایا جائے گا۔ پورے سال کی ہنسی کسی ڈیوٹی کی طرح یہ اسی دن ہنس لیا کریں گے تاکہ باقی کا پورا سال انہیں ہنسنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔“ شاذان ناانسانپ بولے جا رہا تھا۔

روبیہ اور مہوش کے ساتھ ساتھ فواد اور آریان بھی ہنس دیے تھے۔ آریان نے بہت دلچسپی سے اس چلبے سے لڑکے کو دیکھا تھا جو عمر میں ایقہ سے کچھ بڑا ہوگا اور عادت میں اسی کی طرح کانٹا کھڑا اور بدلتا رہے گا۔

”تمہاری اس اتنی لمبی بکواس کا مطلب کیا ہے؟“ فواد بولے۔

”بھائی لوگو! میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یار چھٹی ہے اسے انجوائے کرو، ہنسو بولو.....“

”تو بول تو رہے تھے.....“

”جی ہاں بالکل..... اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اراکین کی طرح سنگین سی سنجیدگی چہروں پر طاری کیے آپ بھی تو انجوائے کر رہے ہیں۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہئے.....؟“ فواد اس کی بکواس سے تنگ آ کر بولے۔

”تو پھر یہ کہ کوئی کھیل کھیلا جائے۔ بچے تو پارک میں مصروف ہیں اور میں اظہر میاں کو ان کا پاس بنا کر ان کی نگرانی پر چھوڑ آیا ہوں۔ پیچھے رہ گئے ہم تو ہم بھی تو بچے ہی ہیں اس لیے کھیل ہمارا حق ہے۔“

”ہوں..... تو تمہارا کیا خیال ہے آکھ مجھ کو کھلی جائے یا.....“

”اونہوں..... میں گھر سے ایک کھیل کی تیاری کر کے آیا ہوں اگر اجازت ہو تو مابعد دولت اسے شو کرے۔“

”جلدی کرو..... خواہ مخواہ اتنی دیر سے بوریت پھیلا رکھی ہے۔“ ایقہ نے بے صبری سے کہا۔

فواد، مہوش، آریان اور روبیہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”جی ہاں! تو کھیل ہے قرعہ اندازی، ان پرچیوں پر چند باتیں لکھی ہیں جس کے پاس جو پرچی آئے گی اسے وہ کر کے دکھانا ہوگا۔“ شاذان نے جیکٹ کی جیب سے کاغذ کی تہہ شدہ پرچیاں نکال کر سامنے درمی پڑھ کر دیں۔

”بھئی میں تو پہلے ہی اس کھیل سے دستبردار ہوتی ہوں، ہم کیا جانیں ان میں کیا لکھ رکھا ہے۔“

مہوش نے کہا تو شاذان نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ جیسی سڑیل بہن سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے۔ ان میں کوئی ایسا نام ممکن کام بھی نہیں لکھا جو آپ کر نہ سکیں۔ بہر حال ہم چار افراد ہیں سب سے پہلے بسم اللہ کون کرے گا۔“ شاذان نے کہا۔

”میرا خیال ہے ایقہ سب سے پہلے پرچی اٹھائے گی۔“ روبیہ نے ایقہ کو آگے کر دیا۔

”کیوں مجھے کیا قرعہ پانی کا بکرا سمجھ رکھا ہے۔“ ایقہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

”ارے تم۔ اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو، کھیل ہی تو ہے کوئی محاذ جنگ تو نہیں۔“ شاذان نے کہا۔

”چلو شاپاش ہمت کرو۔“

”ہمت کرو سے کیا مراد ہے تمہاری..... میں سمجھتی یقیناً اس میں کچھ ایسا ہے جو ٹھیک نہیں۔“

”یار کیا ہو گیا ہے، ایقہ کم سے کم تم جیسی بہادر لڑکی سے مجھے اتنی بزدلی کی توقع نہیں تھی۔“

”نہیں خیر اب بزدل کہہ کر مابعد دولت کے جلال کو آواز مت دو۔ ہم اٹھائے لیتے ہیں۔“ ایقہ نے ہاتھ بڑھا کر ایک پرچی اٹھائی اور بغیر کھولے شاذان کی طرف بڑھا دی۔ حاضرین مجلس عمل طور پر ان دونوں کی طرف متوجہ تھے۔ شاذان نے پرچی کھولی، پڑھی، ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کی مونچھوں تلے چلی۔ مسکراتی نگاہوں سے اس نے ایقہ کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں! پہلی پرچی جو مس ایقہ نے اٹھائی ہے اس پر لکھا ہے کوئی سے تین جانوروں کی آواز نکالیں۔“

”یعنی.....؟“ روبیہ نے ایک بار پھر یقین دہانی چاہی۔

”جی ہاں بالکل آپ حاضرین میں سے کوئی بھی ان جانوروں کے نام سلیکٹ کر کے ایقہ کے سامنے اپنی فرمائش رکھ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اس معاملے میں روبیہ کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔“

شاذان کی باتیں سن کر ایقہ دانت کچکا رہی تھی لیکن بولی کچھ نہیں۔

”ہاں تو روبیہ بتاؤ ان جانوروں کے نام۔“ روبیہ نے ایک نظر ایقہ کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں کچھ ہونق پن اور بے بسی نے عجیب سے نقش و نگار بنا رکھے تھے۔

”ایقہ سب سے پہلے ملی کی آواز نکالو۔“ روبیہ کے کہنے پر ایقہ نے ملی کی آواز نکالی۔

”پرفیکٹ..... بالکل ایسے نہیں لگ رہا، بھائی جیسے کوئی جنگلی بلی، چھپڑے دیکھ کر خوشی سے میاؤں میاؤں کر رہی ہو؟“ شاذان شرارتی لہجے میں بولا۔

فواد ہنس دیئے۔

”اب دوسری فرمائش۔“ شاذان نے سلسلہ آگے بڑھایا۔

”اب بکری کی آواز نکالو۔“

”بھئی یہ فاول ہے کوئی مشکل آواز بتاؤ۔ بلی اور بکری کی آواز تو بچے بھی نکال سکتے ہیں، اپنی بہن ہے اس لیے ایسی رعایت برتی جا رہی ہے۔“ شاذان احتجاج کرنے لگا۔

”اچھا اگلی بار سہی، اس وقت تو میں نے کہہ دیا ہے اور کھیل کی رو سے اب بیقہ کو ماننا ہوگا۔“ بکری کی آواز نکالنے کے بعد بیقہ کو پیاس لگنے لگی۔

”تم اب فرار حاصل کرنا چاہتی ہو۔ آجنگا ب تیسری فرمائش پوری کرنے سے پہلے کسی طور اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتیں۔“

”جلدی کہو.....؟“ بیقہ نے کہا۔

”چونکہ مس بیقہ بد تمیزی کی مرتکب ہوئی ہیں اس لیے سزا کے طور پر تیسری آواز گدھے کی نکالیں گی۔“ رو بہ بیقہ کے کوفت بھرے تاثرات دیکھ کر مسکراتے ہوئی بولی۔

”یہ کیا بات ہوئی، یہ کوئی کھیل ہے۔ میں نہیں، کھیلتی ایسا فضول سا کھیل۔“ بیقہ ناراضگی سے بولی۔

”نہیں بھئی! اب گیم میں شامل ہونے کے بعد کوئی قدم پیچھے نہیں ہٹائے گا۔“ فواد کے کہنے پر

بیقہ نے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

”تو ٹھیک ہے آپ نکالتے پھریں یہ عجیب و غریب آوازیں، میں تو نہیں نکالوں گی گدھے کی آواز۔“

”ارے بیقہ مذاق ہی تو ہے جسٹ فار انجوائے منٹ۔ چلو شاباش جلدی سے تیسری فرمائش پوری کر دو تاکہ ہم دوسرے قربانی کے بکروں کی درگت بنا سکیں۔“ شاذان کے اصرار کرنے پر اس کو ڈھینچوں ڈھینچوں کی ناپسندیدہ آواز نکالتے ہی بنی اور بعد میں وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

”میرا خیال ہے حاضرین کچھ خوفزدہ دکھائی دے رہے ہیں تو آپ سب کی اطلاع کے لیے عرض

ہے کہ صرف یہی پرچی قابل اعتراض تھی باقی سب بہت زبردست ہیں۔ اب یہ مس بیقہ کی قسمت کہ یہ پرچی ان کے ہاتھ میں آگئی حالانکہ فہد بھائی کے پاس جانی چاہئے تھی۔“ شاذان نے کہا۔

”اب آپ میں سے کون پرچی اٹھائے گا۔“

”اب فہدی بھائی آگے آئیں۔“ مہوش نے کہا۔ خلاف توقع خلاف عادت آج وہ اپنے کزنز

اور بھائیوں کی رفاقت کو انجوائے کر رہی تھی۔ فواد نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے ایک پرچی اٹھا

اگر شاذان کے ہاتھ میں تھمادی اور اس کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے اس کے ہاتھ میں ان کا نامہ اعمال ہو۔

”واہ..... واہ.....“ شاذان پرچی پڑھ کر جھوم اٹھا۔ ”کہاں غریب مریضوں کی چیر پھاڑ اور کہاں عشق کی واردات۔ واہ..... کیا کہی نیشن ہے۔ ڈاکٹر فواد علی شاہ اظہار عشق کر کے دکھائیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”یار بھائی! اپنی خیالی محبوبہ سے عشقیہ مکالمے بولیں ہمارے سامنے۔“

”نہیں بھئی یہ اپنے بس کی بات نہیں۔“

”ارے بھائی پر ٹیٹس کر لیں شاید غریب ایسا کوئی موقع آ جائے اور آپ بغلیں جھانکنے لگ جائیں ہماری ہونے والی بھابی کے سامنے۔“

”شاذان یار مشکل کام ہے۔“

”کیا محبت کرنا یا محبت بھرے جیلے بولنا۔“ فواد کوچہ کر شاذان کو مزہ آور ہاتھا۔

”دونوں ہی.....“

”چلیں وقت ضائع مت کریں۔ جلدی سے خیالی محبوبہ سے اظہار عشق کریں۔ یہ یاد رکھئے گا کہ پہلی بار عشق کا اظہار کرنا ہے۔“

”یعنی سیدھے سیدھے کہہ دوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ فواد مسکراتے ہوئے بولے۔

”اوہ نہ وہی ٹیٹیکل سڑک چھاپ، فٹ پاتھی عاشقوں والا جملہ۔ او بھائی میرے، کوئی جدت انہیں کوئی نیا پن۔ ہر انسان کے ذہن میں ایک خیالی پیکر ہوتا ہے اور جب وہ پیکر مجسم ہو کر سامنے آ جاتا ہے تو اس وقت اس کے کیا محسوسات ہوں گے۔ ان محسوسات کو زبان دینی ہے، کیا آپ کے ذہن میں کوئی خیالی پیکر نہیں ہے۔“

”اوں..... ہے تو سہی۔“ نکلیوں سے آریان کی سمت دیکھ کر وہ شرارت سے بولے۔

”برے..... تو پھر دیر کس بات کی۔ جلدی سے اس خیالی پیکر کو نگاہوں کے سامنے لائیں اور جلدی سے اظہار عشق کر ڈالیں۔ یہ نہ ہو وقت گزر جائے اور آپ پکھلتے رہ جائیں۔“ شاذان اپنی ہی

ہانکے جا رہا تھا۔ فواد نے نظر اٹھا کر آریان کی طرف دیکھا، وہ انہی کی جانب متوجہ تھی۔ ان کی آنکھوں کا عجیب گہرا سا تاثر دیکھ کر اس نے نگاہیں جھکا لیں، فواد بولنے لگے تو شاذان نے ٹوک دیا۔

”یوں نہیں کھڑے ہو کر۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر دو تین قدم پر سے ہٹ کر سامنے کی سمت رخ کر کے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک نظر سامنے یوں دیکھا جیسے ان کا تخیل کسی پیکر کے سانچے میں

دھل کر ان کی نگاہوں کے سامنے آ گیا ہو۔ ان سے بہت قریب۔ دھڑکنے ایک روحم سے دھڑکنے لگیں۔ ایک پل کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہونے ہی والے تھے کہ شاذان بول اٹھا۔

”ویسے اس خیالی محبوبہ کا کوئی نام بھی تو ہونا چاہئے۔“ روبیہ اور انیقہ نے بھی تائید کی۔
 ”ربیعہ کیسار ہے گا فواد بھائی.....“

”انتہائی بومس.....“ فواد شرارت سے آریان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ”دیکھو بھی چاند کو جس نام سے بھی پکارا جائے، چاند ہی رہے گا، پھول کو کسی نام سے پکاریں تب بھی اس کی خوشبو پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو پھر محبوبہ کو بھی جو مرضی نام دیا جائے۔“ فواد نے کہا
 ”چلیں ٹھیک ہے اب جلدی کریں بے چاری محبوبہ انتظار میں سوکھ رہی ہے۔“ شاذان نے کہا تو فواد نے چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے پہلے حاضرین کی طرف دیکھا۔ پھر ان کی آنکھیں ایک مقام پر رک گئیں۔

”ہم کسی کو اپنی مرضی سے چاہ تو سکتے ہیں رباب! لیکن کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو، محبت نے میرے دردل پر بہت دیر سے دستک دی لیکن تمہارا کہنا ٹھیک نہیں کہ یہ یکطرفہ محبت ہے۔ کسی دل سے کسی دوسرے دل کے لیے محبت کی شعاعیں حصار چھینتی ہیں تو دل کسی کی طرف مڑتا ہے۔ اس کا ہوتا ہے، محبت بے سمت ہوتی ہے نہ رائیگاں ایک نظم سنو۔“ فواد ایک پل کو رکے۔ سب کے سب بہت غور سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے حتیٰ کہ ظاہر جو کسی کام کے لیے ان کی طرف آیا تھا وہ بھی چپ کھڑا رہا تھا۔

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں
 اپنے نام کی تختی والی عمارت
 کتنے دکھوں کی اینٹیں جن کر گھر بنتی ہے
 پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو

میں نے بھی اک گھر ہے بنایا
 رنگوں، پھولوں، تصویروں سے اس کو سجایا
 دروازے کی لوح پر اپنا نام لکھوایا
 لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو!

”رباب! تمہیں پتہ ہے دکھوں کی ان اینٹوں کے درمیان تمہاری محبت..... تمہاری محبت کرنے کی لگن، سکون اور تسکین ہے، تم انتہائی پدمسرت خوشی جیسی ہو۔ میں..... اس خوشی سے اپنا دامن بھر لینا چاہتا ہوں۔“ فواد خاموش ہو گئے۔ تالیوں کی آواز پر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا شاید وہ بہت سنجیدہ اور خود فراموشی کی کیفیت میں چلے گئے تھے۔ آریان کی نظریں ان پر ٹکی ہوئی تھیں۔

”یہ لفظ..... یہ دھڑکتے لفظ تو تمہاری میراث تھے اور میں نے انہیں تقسیم کر دیا، تشہیر کر دی، ان

پاکیزہ ان چھوٹے جذبوں کی..... جن سے تم خود ابھی آگاہ نہیں ہو۔“ فواد کا دل یکدم ماحول سے اجاٹ سا ہو گیا۔

بھائی..... آپ تو ڈاکٹر کم شاعر زیادہ لگ رہے تھے۔“ شاذان ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 ”یہ لوگ، یہ جو میرے ارد گرد بیٹھے ہیں شاید ان لفظوں کو سمجھ نہیں پائے۔ مجھے اپنے رویے سے انہیں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہئے۔“ وہ سنہل گئے۔

”جی ہاں..... ابھی ابھی آپ نے پرانی پاکستانی فلم کا ایک ٹریلر دیکھا۔ نادیہ صبیحہ کے سامنے سنتوش صاحب کا اظہار عشق۔ تو اب باری ہے مس روبیہ کی کہ وہ بھی اس کا رخیر میں شریک ہو جائیں۔“ شاذان نے پرچیاں روبیہ کے آگے ڈھیر کر دیں۔ اس نے پہلے سب پر ایک نگاہ ڈالی۔

”میری بھی تو کوئی سن لے..... انا اور باصر لڑ رہے تھے آپس میں۔ اتنی دیر سے کہنے کی کوشش کر رہا تھا کوئی سننے کو تیار ہی نہیں۔“ طاہر تنگ آ کر چیخ پڑا۔

”کمال ہے..... اب بتا رہے ہو۔ شاذان جا کر بلالاؤ انہیں یہیں۔“ فواد نے شاذان کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ روبیہ نے پرچی اٹھا کر خود ہی پڑھی۔

”اپنے دائیں طرف بیٹھے شخص کو منہ چڑائیں۔“ روبیہ نے فرمائش پڑھ کر دائیں طرف دیکھا۔ دائیں طرف بیٹھا ہوا تو کوئی نہیں تھا البتہ اس طرف سے شاذان ادھر کو آ رہا تھا بعد بچوں کی ننھی فوج لیے۔ روبیہ نے اس کو منہ چڑایا تو وہ وہیں سے مصنوعی غصے سے بولا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے.....“

”تمہاری فرمائش پوری کی جا رہی ہے۔“ روبیہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

”میں نے کب کہا کہ میرا منہ چڑاؤ۔“ شاذان قریب آتے ہوئے بولا۔

”پرچی میں یہی لکھا ہوا تھا۔“ روبیہ نے کہا۔

”اچھا خیر! اب کون رہ گیا ہے؟“ شاذان نے پوچھا۔

”تم اور آریان.....“

”چلیں آریان۔ اٹھائیں پرچی.....“

”نہیں، میں تو نہیں کھیل رہی.....“ اس نے پہلو بچانا چاہا۔

”لیکن یہ آپ کو کھیل شروع کرنے سے پہلے بتانا چاہئے تھا، اب آپ کھیل میں شریک ہیں لہذا اصولاً آپ کو ہماری فرمائش پوری کرنی پڑے گی۔“

”پھر پہلے تم نکالو.....“ آریان نے اسے آگے کیا۔

”ٹھیک ہے، میں اٹھانے لگا ہوں لیکن آپ بھی مکرئیے گا مت۔“ شاذان نے پرچی اٹھا کر

با آواز بلند پڑھی۔

”مینڈک کی طرح کود کر دکھائیں۔“ برا سامنہ بنا کر اس نے سب کی طرف دیکھا۔ سب بچوں نے مل کر تالیاں بجائیں۔

”تم لوگوں کو کس بات کی خوشی ہو رہی ہے۔“

”شانی بھائی! ہم سوچ رہے ہیں آپ مینڈک کی طرح اچھلتے کیسے لگیں گے۔“

”کیوں تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت..... کبھی آئینہ نہیں دیکھا تم نے مینڈک کہیں کے۔“

شاذان نے اظہر کو جھاڑ لیکن غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا آخر اسے فرمائش پوری کرتے ہی بنی۔ ایتھہ کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ برتن وغیرہ سیٹ کروانے میں لگ گئی۔ لٹچ کا ٹائم ہو گیا تھا سو صابروہ نے اسٹوگاڑی سے نکال کر باہر رکھا اور لٹچ والا ہاٹ پاٹ نکال کر کھانا گرم کرنے میں لگ گئی۔

”اب اس کھیل کے آخری کھلاڑی کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ پرچی اٹھائیں اور فرمائش پوری کر کے اس کھیل کو خوشگوار اینڈ سے ہمکنار کریں۔“ شاذان نے خالصتاً کنٹینٹروں والے انداز میں کہا۔

آریان نے بے بسی سے فواد کی طرف دیکھا انہوں نے کندھے اچکا کر خود کو غیر جانبدار ظاہر کیا پھر اس کی نظریں روہیہ اور ایتھہ کی طرف انھیں۔

”یہ کیا آپ جمائیتوں کی تماش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہی ہیں۔ اس وقت ان میں سے کوئی آپ کی ہیلپ نہیں کرے گا۔“ شاذان نے اس کی چوری پکڑ لی۔

”بالکل آریان آپنی..... آپ کو بھی اب کچھ نہ کچھ کرتب دکھانا پڑے گا۔“ ایتھہ نے شاذان کا ساتھ دیا۔

”میں کیا سرکس سے بھاگی ہوئی لگتی ہوں کچھ نہ کچھ کرتب دکھاؤں۔“ آریان مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

”اونہوں..... کوئی عذر نہیں جلدی سے پرچی اٹھائیں۔“ شاذان کسی طور ٹلنے کو تیار نہ تھا آخر مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق اس نے پرچی اٹھا کر شاذان کے ہاتھ میں تھما دی۔ شاذان نے کھول کر پڑھی اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

”تم کیوں مراقبے میں پڑ گئے۔ کیا بہت مشکل فرمائش ہے۔“ آریان گھبرا کر بولی۔

”حاضرین و سامعین..... اب آپ کے سامنے تشریف لا رہی ہیں مس آریان نئی ابھرتی ہوئی گلوکارہ جو آپ کو بے حد خوبصورت گیت سنائیں گی۔“ شاذان نے جیسے کوئی اہم فریضہ سرانجام دیا۔

”ہمزے..... اب مزہ آئے گا۔“ ظاہر اور دیگر بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

”تم سب کس خوشی میں اچھل رہے ہو، وہ کیا تمہیں لوری سنانے لگی ہے۔“ روہیہ نے بچوں کو

اتار تو وہ بے چارے خاموش ہو گئے۔

”لیکن میں نے کبھی گانا نہیں گایا۔“ آریان نے ڈھکے چھپے لفظوں میں انکار کیا۔

”یہ کہاں لکھا ہے کہ جو کام زندگی میں نہ کیا وہ کبھی کرنا بھی نہیں چاہئے۔“ ایتھہ نے اس کا یہ عذر رد کر دیا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے شاعری سے تھوڑا بہت لگاؤ ہے لیکن میوزک سے بالکل نہیں ہے۔“

”جیسے شاعری پسند ہو وہ کبھی میوزک کو ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کو ہمیں گیت سنانا پڑے گا۔“ شاذان نے اصرار کیا تو آریان نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔

”آریان..... پلیز جلدی سے ہماری سماعت کو سکون بخشنے تاکہ ہم پھر پیٹ پوجا کی تیاری کریں۔ بھوک سے چوے لکڑی مٹی کھیلنے لگ گئے ہیں پیٹ میں۔“ شاذان نے باقاعدہ پیٹ پکڑ کر دہرا ہوتے ہوئے کہا۔

”چلیں گیت نہ سنی کوئی غزل ہی سنا دو۔“ مہوش بھی جیسے اصرار کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔

”یقین کیجئے آپ سب کی خواہش کو رد کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی کوئی گیت نہیں گایا نہ ہی سنا۔“ آریان بولی۔

”چلیں گیت اور غزل نہ سنی..... بچپن میں آپ کی امی نے آپ کو لوری تو سنائی ہوگی۔ وہ لوری ہی سنا دیں۔“ چمن..... چمن..... چمن..... وقت کی جھیل میں بڑا بے رحم پتھر گر ا تھا۔

اندر کہیں بہت پر شور طوفان اٹھا تھا، کہیں دور تھتھر دؤں کی جھنکار بلند ہوئی۔ طبلے پر تھاپ پڑی اور..... اکی سسکیاں ردھم کے ساتھ درد بھری لے پر گنتگنا نے لگیں۔

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے

عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری
سب ستارے سر خاشاک برس جائیں گے

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا بچھائے گا کوئی

بے وفا کی گھڑی ترک مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی

ترک دنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طور کے پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟

ہوا کی سسکیاں تھم چکی تھیں، گھنگھروؤں کی صدا اپنے ہونے کا احساس کو چکی تھی لیکن اس کے اندر مسلسل کوئی بین کر رہا تھا۔ سمندر جیسی گہری آنکھوں کے ساحل بھینگنے لگے۔ وہ سب تالیاں بجا رہے تھے۔ ہسکرا مسکرا کر داد دے رہے تھے لیکن اس کی بیگلی آنکھیں اور ان بھسکی آنکھوں کے پس پردہ اٹھتے سماطم صرف نوا کی نگاہیں دیکھ پائی تھیں۔ وہ سنبھل گئی، ہونٹ بھینچ کر سسکیوں کا گھا گھونٹ کر مسکرانے کی کوشش کرتی آریاں نوا کی مسند دل پر انتہائی تمکنت سے جلوہ افروز ہو گئی۔

ان نہ بننے والے آنسوؤں کی پاکیزگی نے نوا کے دل میں اگر کوئی ہلکا سا شک تھا بھی تو دھوڑا لایا تھا۔ وہ بھی سب کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لٹچ کرنے کے بعد بھی وہ کافی دیر وہاں ٹھہرے تھے لیکن آریاں کہیں کھو گئی تھی اس کا وجود ان سب کے درمیان تھا وہ جس بھی رہی تھی باتیں بھی کر رہی تھی لیکن ذہن کے گم نام گوشوں میں ماضی کے نشتر چرے لگا رہے تھے اور اس کی یہ کیفیت محسوس کر کے نوا نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ اس نے تشکر بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ حقیقتاً وہ اس وقت صرف تنہائی چاہتی تھی، اس کے وجود کے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ آخر یہ غبار اسے اکیلے تنہائی میں بیٹھ کر ہی نکالنا تھا۔ سب گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کی راہ پر غارم سفر ہو گئے لیکن ان سب میں دورانی ایسے تھے جنہوں نے آگے کا سفر شروع کر دیا تھا باقی سب نے تو چند لمحوں میں منزل پر پہنچ جانا تھا لیکن ان دورانیوں کی مسافت تو اب شروع ہوئی تھی۔



”میں نے پچھلے دنوں بھی آپ کو بتایا تھا کہ سعود بھائی زین کے لیے اپنی مہوش کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ آپ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔“ اس وقت رات کا کھانا کھا کر سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ باہر چچا کا موڈ بھی آج بہتری تھا سو زاہدہ چچی کو یہی وقت مناسب لگا کہ وہ بات چھیڑ دیں جو پچھلے کئی دنوں سے باہر چچا کے ساتھ ڈسکس نہ کرنے کی وجہ سے التواء میں پڑی ہوئی تھی۔

”کیا جواب دوں۔۔۔۔۔“ باہر چچا ہنوز اپنے سامنے موجود کتاب کی طرف متوجہ رہے۔

”یہ بھی اچھی رہی۔۔۔۔۔ بھئی جینی کا معاملہ ہے کوئی رائے تو دیں۔۔۔۔۔“

”کیسی رائے؟“ انہوں نے اب بھی کوئی خصوصی توجہ نہ دی۔

”یہ مولیٰ کتاب ایک طرف رکھ دیں اور میری بات توجہ سے سنیں تو ہوتا چلے۔“ وہ زچ ہو کر بولیں۔

”یہ لور کھدی کتاب۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔“ انہوں نے کتاب بند کر کے بینڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”میں کہہ رہی تھی کہ زین اچھا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا اچھی نوکری پر لگا ہوا ہے۔ ہماری بچی کو خوش رکھے گا۔“ زاہدہ چچی کے لہجے میں بھتیجے کی محبت محسوس کر کے باہر بھائی مسکرا دیے۔

”تمہیں بھتیجہ زیادہ پیارا ہے یا بیٹی۔“

”ہیں۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔۔۔۔۔؟“

”میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“

”ظاہری بات ہے اپنی بیٹی ہی پیاری ہے۔ پر بھتیجہ بھی تو بچھی کالا ڈلا ہوتا ہے۔“

”لیکن تمہیں کس نے بتا دیا کہ تمہارا وہ لاڈلا اچھا لڑکا ہے۔“ باہر چچا بولے تو چچی کو تو جیسے مر جیسی لگ گئیں۔

”ناں مطلب کیا ہے اس بات کا۔۔۔۔۔ کیا برائی دیکھ لی اس میں؟“

”دیکھو زاہدہ! تم اس کی جس چیز سے متاثر ہو۔ کم سے کم متاثر ہونے کے لیے میرے نزدیک وہ کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ تم نے اس کی دولت دیکھی ہے یا پھر اس کے اکلوتے ہونے کا خیال ہوگا تمہیں۔“

”ہاں تو اور کیا ہونا چاہئے، ماشاء اللہ تین تین گاڑیاں گھڑی ہیں ان کے گھر میں۔ گھر کو دیکھ کر کسی محل کا گمان ہوتا ہے پھر مہوش کولنڈن دیکھنے کا شوق بھی بہت ہے۔“

”زاہدہ تم فیصلہ کر چکی ہو یا مجھ سے پوچھ کر کرنا چاہتی ہے۔“ باہر چچا ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

”کمال ہے آپ کے بغیر تنہا میں کیسے فیصلہ کر سکتی ہوں۔“

”تو پھر میری مان لو کہ مہوش کو اپنے اور اس کے شوق کی بھینٹ مت چڑھاؤ۔ خوشیوں کے لیے صرف دولت اور اسٹیٹس کافی نہیں ہوتا۔“

”لیکن آخر زین میں برائی کیا ہے۔۔۔۔۔“ زاہدہ چچی باہر چچا کے سرد لہجے پر جیسے کڑھ کر بولیں۔

”تم نے محض وہ سنایا دیکھا ہے جو تمہیں دکھایا اور سنایا گیا ہے جبکہ میں اس کے متعلق وہ کچھ جانتا ہوں جو شاید اس کے اپنے ماں باپ نہیں جانتے۔“

”مثلاً۔۔۔۔۔“

”وہاں لندن میں بہت سی انگریز عورتوں کے ساتھ فرینڈ شپ ہے اس کی۔ دو شادیاں کر چکا ہے۔“

وہ۔ ان میں سے ایک عورت اس کے بچے کی ماں بھی ہے۔ پھر تم خود بتاؤ سب کچھ جانتے بوجھتے مہوش کو کنویں میں کیسے دھکیل دوں۔“

”یہ سب کس نے بتایا آپ کو..... کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“ زاہدہ چچی تو آگ بگولا ہو گئیں اپنے جھجھے کے کرتوت سن کر۔

”احسن میرے دوست کو شاید تم جانتی ہو اسی شہر اس انسٹیٹ میں رہائش پذیر ہے وہ جہاں تمہارا بھتیجا رہتا ہے۔ جب تم نے پہلی بار مہوش اور زین کے رشتے کی بات کی تھی میں نے تب ہی احسن سے اس کے بارے میں ساری معلومات لے لی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ پھر میں نے اس رشتے پر غور نہیں کیا۔“

باہر چچا رسان سے بولے۔

”تو اس کا کیا ہوا، کیا حدیث ہو گیا؟ وہ غلط بھڑکا بھی سکتا ہے۔“

”کیوں اس کی کیا دشمنی زین سے۔“ باہر چچا کا دل چچی کی عقل پر ماتم کرنے کو چاہا۔

”ہو سکتا ہے وہ اپنی بیٹی کا رشتہ دینا چاہتا ہو بہر حال یہ تو ماننے والی بات نہیں الہتہ دوستی کی جہاں تک بات ہے تو وہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔“ چچی نے ان کا اعتراض سرے سے ہی مسترد کر دیا۔

”بھتیجے کی محبت کی پٹی آنکھوں سے اتار کر دیکھو..... بالفرض بحال ایسا ہے بھی جیسا تم کہہ رہی ہو تب بھی رنگ رنگ کی عورتوں سے دوستی کرنے والے شخص کا کیا اعتبار کل کو اسے کوئی زیادہ پسند آ جائے اور وہ اسے اپنے گھر لے آئے پھر مہوش کا کیا بنے گا؟“

”کوئی بھی نہیں ایسا، رنگ رنگ کی عورتوں کو مرد گھر سے باہر ہی رکھتا ہے، گھر والی کا رتبہ ہر ایک کو نہیں دیا جاتا۔“

”زاہدہ..... بحث مت کیا کرو۔ مہوش میری بیٹی ہے اور اس کی زندگی کا فیصلہ میں سوچ سمجھ کر کروں گا، میں کسی آوارہ، بد قماش شخص سے اپنی بیٹی کا رشتہ طے نہیں کروں گا۔“ باہر چچا چچی کی بحث سے تنگ آ کر ذرا بلند آواز میں بولے۔

”باہر! آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ مہوش آپ کی بیٹی ہے تو کیا میری کچھ نہیں لگتی۔ میں ماں ہوں اس کی، اس کے مستقبل کے بارے میں غلط فیصلہ کیسے کر سکتی ہوں۔“ چچی رسائیت سے بولیں۔

”لیکن یہاں تمہارا فیصلہ ٹھیک نہیں ہے اسی لیے میں بول پڑا ہوں..... آج تک اس گھر میں ہونے والے ہر فیصلے کی خود مختاری تمہیں دی ہوئی تھی کہ یقین تھا گھر اور گریہ سستی کو سمجھنے والی عورت ہو لیکن یہاں مجھے مداخلت کرنی پڑے گی کیونکہ یہ مہوش کی ساری زندگی کا معاملہ ہے۔“ باہر چچا ضبط اور تحمل کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

”آخر خرابی کیا ہے زین میں.....؟“ زاہدہ چچی کی فطری ہٹ دھرمی ورائی تھی۔ جب وہ کوئی

فیصلہ کر کے اس پر قائم ہو جاتی تھیں تو پھر مد مقابل کو زیر کرنے کی خاطر بحث و تکرار تک بات پہنچا دیتی۔

”ابھی بتایا نہیں تھیں..... طوائفوں جیسی عورتوں کے ساتھ دوستیاں ہیں اس کی جن لوگوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے وہ اچھے لوگ نہیں۔“

”تو یہ کوئی اتنی قابل اعتراض بات بھی نہیں..... جوانی میں سبھی ایسی حرکتیں کرتے ہیں بعد میں خود ہی سدھر جاتے ہیں۔“ چچی کی لاپرواہی دیدنی تھی۔ باہر چچا کا تو خون ہی کھول اٹھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا..... یعنی اس میں کوئی قابل اعتراض بات ہی نہیں۔ زاہدہ بیگم ایک آوارہ مزاج شخص کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دینا تمہارے لیے لائق داد و تحسین ہو گا لیکن میرے لیے نہیں۔“

”لیکن میں مہوش کی شادی وہیں کرنے کا ارادہ کر چکی ہوں۔“

”جب تم فیصلہ کر چکی ہو تو میرا مشورہ میری رائے کس لیے مانگ رہی ہو۔ زاہدہ بیگم اولاد کوئی کھلونے نہیں ہوتے جنہیں جہاں جی چاہے اٹھا کر رکھ دو، ان کی زندگیوں کے فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کرنے ہوتے ہیں جبکہ تم تو مجھے آنکھوں دیکھی کھٹی ٹھنکے کو کہہ رہی ہو۔“

”باہر! میں نے کہہ دیا مہوش کی شادی وہیں ہوگی۔“ چچی کے حتیٰ لچے کو محسوس کر کے باہر چچا بھڑک اٹھے۔

”تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں زاہدہ بیگم..... بھتیجے کی محبت میں بیٹی کی زندگی تباہ کرنے پر تل گئی ہو تم..... لیکن میرے حواس ابھی سلامت ہیں۔ میں یہ رشتہ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ڈٹے ہوئے تھے۔ لہجوں کی تلخی آواز کے مد و جز کو بلند کرتی گئی۔ نواز مہوش اور شاذان ان کی آوازیں سن کر اپنے کمرے سے نکل آئے۔ ان کے کمرے کے دروازے میں کھڑے وہ

ان دونوں کو دیکھ رہے تھے لیکن ماحول کی کشیدگی کے باعث ان میں سے کسی نے بھی آگے بڑھ کر مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ باہر چچا کا مسلسل انکار چچی کو مزید اشتعال دلارہا تھا۔

”میں سمجھ سکتی ہوں کہ مہوش وہاں خوش رہے گی۔“

”بالکل..... تم صحیح کہہ رہی ہو جب تمہارا بھتیجا رنگ رنگ کی عورتوں کے پاس جائے گا تو مہوش کی زندگی واقعی بہت خوشگوار ہو جائے گی، اس سے بہتر نہیں کہ اسے کسی اندھے کنویں میں پھینک دو۔“

باہر چچا طنز یہ لہجے میں بولے۔

”آپ..... آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں مہوش کی دشمن ہوں..... میں اس کی زندگی تباہ کرنا چاہتی ہوں۔“ چچی کھر دے لہجے میں بولیں۔

”میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ میں مہوش کی شادی ہرگز زین جیسے بے کردار شخص سے نہیں ہونے دوں گا۔“

”جن دنوں آپ رنگ برنگی عورتوں کے پاس جاتے تھے ان دنوں کردار کا یہ معیار کہاں تھا۔۔۔۔۔ وقت کتنا گزرا ہے آپ کو وہ سب چھوڑے ہوئے، کبھی میرا یا ان بچوں کا خیال نہیں کیا آپ نے۔ لاکھوں روپیہ لٹا دیا اس کل موہی پر۔ وہ طوائف جو آپ کو اپنی بیوی اپنے بچوں سے زیادہ عزیز ہو گئی، ایک بار بھی شکوہ نہیں کیا۔ میں نے کبھی ان لکھوں کا حساب نہیں مانگا مگر نہ شوق تو آپ کے بھی ایسے ہی تھے۔“ غصہ اور اشتعال انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لیتا ہے۔ وہ بھی غصے کے عالم میں کہتے ہوئے بالکل فراموش کر بیٹھیں کہ ان کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ صرف باہر چچا کی ہی نہیں ان کی اولاد کی سماعت میں بھی محفوظ ہو رہا تھا۔ وہ یکدم چپ ہو گئیں۔ باہر چچا کی آنکھیں کسی نکتے پر مرکوز جیسے ساکت تھیں اور چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ چچی نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو جیسے سن ہو کر رہ گئیں، دروازے کے فریم میں سجے تینوں چہرے نوزائیدگی سے لے کر جوانی تک ان کے وجود سے ایک ایک قطرہ خوشی کشید کرتے رہے تھے لیکن اس وقت ان کی نظروں میں ایسی بے یقینی اور بے اعتباری تھی کہ ایک بلی کو زائدہ چچی جیسے اپنے اندر کٹ کر رہ گئیں۔

”یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔۔ جس راز کو بر سہا برس اپنے سینے میں چھپانے کیلئے سسرال کے دورا ہوں پر میں آبلے پا چلتی رہی لیکن کسی کو کانوں کا خبر تک نہ ہوئی کہ کون سا درد سینے میں سنبھالے پھرتی ہوں۔ آج وہ راز بے دھیانی میں لیوں پر کس وقت آ گیا، جو ان اولاد کے سامنے کتنا نامعتبر کرو یا میں نے اپنے شریک زندگی کو۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ شادی کے دو تین سال بعد وہ زمرہ کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے لیکن ان کا یہ عشق چھ سات سال سے زیادہ نہ چلا۔ وجہ وہ پھول تھے جو ان کے آنگن میں کھل چکے تھے۔ ان پھولوں کی آبیاری ان کی ساری توجہ اور محبت کی طلبگار تھی اور انہوں نے ان پھولوں کو حوادثِ زمانہ کی خزاں سے بچانے کے لیے اپنی جان لڑا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج ان کے تینوں بچے تعلیمی قابلیت، کردار، اخلاق کسی چیز میں بھی کسی سے کم نہ تھے لیکن زائدہ چچی نے ان کی ریاضت ضائع کر دی تھی۔

وہ تو اسی لمحے ٹوٹ گئے جب انہوں نے اپنے بچوں کی آنکھوں میں اپنے لیے بے یقینی اور اعتماد کے مجروح آئینے کی کرچیاں دیکھیں۔ کمرے میں پانچ نفوس تھے لیکن ہر ایک اپنی اپنی سوچ میں گم، فواد، مہوش اور شاذ ان کے قدم جہاں تھے وہیں رکے ہوئے تھے۔ زائدہ چچی پچھتاؤں کے بوجھ تلے دبی سہی دھڑکنیں شمار کر رہی تھیں اور باہر چچا کنفیس باکس کے اندر اعترافِ گناہ کر چکے والے مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر کی جان لیوا خاموشی کے بعد باہر چچا اپنی جگہ سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا یا شاید وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پارے تھے کہ اپنے ماضی کا وہ تاریک گوشہ جو انہوں نے ہر ایک سے چھپا کر رکھا، یوں ان کی اولاد کے سامنے بے

لقاب ہوا کہ لکھوں میں وہ اپنے مقام سے بہت نیچے آ گئے۔ نظروں سے گرنا انہیں برداشت نہیں ہو رہا تھا، وہ اندر کے شور سے گھبرا کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ماحول میں قدرے خشکی سی تھی، وہ پیدل چلتے گئے، باہر کے سنانے نے اندر موجود شور کو جیسے اور شوریدہ سر بنا دیا تھا۔ جانے ان کے قدموں نے کتنی مسافت طے کی، گھر کہیں بہت پیچھے رہ گیا جو کبھی ان کے لیے جائے پناہ، جائے امان تھا لیکن آج عدالت کے کٹہرے کی طرح بے حس واقعہ ہوا تھا۔ وہ گھر اور اس گھر کے مکن بہت دور رہ گئے تھے۔ چلتے چلتے انہیں محسوس ہوا جیسے بیروں میں سکت نہ رہی ہو شاید آبلے بن چکے تھے یا بیروں کے ٹکڑے چھل گئے تھے۔

ٹانگوں میں جان نہ رہی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا، بالکل خاموش فضا۔ وہ شہر سے غالباً باہر نکل آئے تھے، دور تک جاتی خاموش سڑک اور اس کے ارد گرد لگے بلند و بالا درخت۔ اندھیرا بہت گہرا ہو چکا تھا شاید رات کا پہلا پہر اختتام پزیر تھا۔ وہ جیسے تھکن کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے سڑک کے کنارے لگے درخت سے ٹیک لگا کر نیچے گھاس پھوس بیٹھ گئے۔ جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور سگ کر گھر کے گہرے صحن کش لیے۔

”کیا محض چند جملوں سے زندگی کی تمام محنت رائیگاں جا سکتی ہے۔ کیا لفظوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے جو یوں ریاضت کو بے ثمر کر کے رکھ دے؟ زمرہ۔۔۔۔۔ تمہاری محبت کو ٹھکرانے کی سزا مجھے اور کس کس صورت میں ملے گی؟“ باہر چچا اپنے دل کے نہاں گوشوں میں جھانکنے لگے جہاں ایک چہرہ وقت کی دھول سے دھندلایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ہونے کا ماتم کرتا ہوا۔

”یہ گرد تو باہر شاہ تم نے خود اس معصوم چہرے کا مقدر کی ہے پھر اب کیوں شرمندہ ہو۔“ باہر چچا نے اس گد لے آئینے میں عکس کی طرح جھللاتے اس دھندلے لودیتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔ آنکھوں کے آگے سیاہ چادر حائل ہو گئی پھر اس چادر پر روشنی جھللانے لگی اور اس روشنی میں کچھ سائے سے متحرک ہو گئے۔

”زمرہ۔۔۔۔۔ محفل اپنے پورے جوہن پر ہے گھٹکھرو بانڈھ لو۔“ بڑی آہ کاؤٹیکے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولیں۔

”آپا چند منٹ ٹھہریے۔۔۔۔۔“ زمرہ کی بے چین نگاہیں بیرونی دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

”ارے کا ہے چھمک چھلو۔۔۔۔۔ کس کا اتجار ہے ری۔“ پان چباتا ہوا کوئی سینٹھ نشتے میں ڈوبی آواز میں بولا۔

”کچھ نہیں سینٹھ صاحب! بس محفل شروع کیے دیتے ہیں۔۔۔۔۔ آپا عاجزی سے بولیں۔ غالباً کوئی موٹی آسامی تھا وہ شخص۔

”زمرہ۔۔۔۔۔ بھرا شروع کرو۔۔۔۔۔ طوائفوں کو انتظار اس نہیں آتا۔ کوٹھے میں رہتی ہو تو یہاں کے

اصول بھی سمجھو۔۔۔۔۔ بڑی آپا کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سختی سے مجبور ہو کر زمر نے ہنسنے کا بندھ لیا۔

وہ آنکھیں بند کیے خود فراموشی کی کیفیت میں رقص کر رہی تھی۔ تماش بینوں پر جیسے سکتے سا طاری ہو گیا تھا۔ گیت کے بول تھے یا اس کے دل کی آواز۔ جذبوں کی تمام تر شدتیں ایک محور پر جمع ہو کر پکار اٹھی تھیں اور گو ہر مقصود نے در پر قدم رکھا۔ بابر شاہ اپنی بھرپور شان و شوکت کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ بڑی آپا خوشی سے ان کے استقبال کو اٹھنے لگیں لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اٹھنے سے روک دیا۔ ان کے ہمراہ ان کا دوست فیاض بھی اکثر یہاں آتا تھا اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ ہی تھا۔

انہوں نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر کھولا۔ سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور زمر پر نچھاور کر دیں۔ کڑکڑاتے ہوئے نوٹوں کی چمک سے جہاں بڑی آپا کی آنکھوں میں مسرت لہرائی تھی وہیں زمر کی بند پلکیں ایک جھٹکے سے کھلی تھیں۔ انتظار کا نتیجہ اس قدر سرور انگیز ہوتا ہے۔ طمانیت خمار بن کر اس کے پورے وجود پر چھا گئی۔ طبلے کی تھاپ نے لے بدلی۔ ہنسنے والا ایک پل کو رکے۔ زمر کی خمار آلود نگاہوں نے جھک کر بابر شاہ کی قدم بوسی کی اور پھر نئی تال پر رقص شروع ہو گیا۔

اپنے درودوں کا کٹ پہن کر
بے درودوں کے سامنے جائیں
جب رونا آئے مسکائیں
جب دل ٹوٹے روپ جلائیں
پریم کتھا کا انت نہ کوئی
گنتی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی سا جن
کچھ نہ مانگیں، سب کچھ پائیں
فیض ان سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

رقص ہوتا رہا، گیت گائے جاتے رہے، رات بھٹکتی رہی۔ سازوں کے تھمتے ہی تماش بین اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ روشن شبستانوں میں تارکیوں کی آغوش میں سینے چلے گئے۔ وسیع و عریض کمرے کے فرش پر پھول کی پتیوں اور لونوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ بے ترتیب گاؤں کیوں اور حتمی آلود چادروں نے کمرے کی ہیئت ہی بگاڑ دی تھی۔ زمر نے ہنسنے والا تارک ایک طرف رکھے اور سچ سج قدم اٹھاتی بابر

شاہ کے قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں کے لودیتے جذبوں کے آگے بابر شاہ نے ہمیشہ خود کو بے بس سمجھا تھا۔ فیاض کو بریف کیس تھما کر انہوں نے اسے باہر گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ چلا گیا۔

”شاہ صاحب! آپ نے اس بیٹھنا ہے؟“ بڑی آپا انہیں ہنوز براجمان دیکھ کر بولیں۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔ بس زمر سے چند باتیں کرنی ہیں۔“

”سو بار کریں۔۔۔۔۔ میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ اگر ابھی بیٹھنا ہے تو اندر کمرے میں چلے جائیے۔۔۔۔۔ یہ کمرہ اس وقت آپ کے شایانہ شان نہیں ہے۔“ وہ ضرورت سے زیادہ کھنکھانے کی عادی معلوم ہو رہی تھیں۔

”آپا آپ کہاں جا رہی ہیں۔۔۔۔۔ بڑی آپا کو اٹھتے دیکھ کر زمر نے پوچھا۔

”بھئی میں تو سونے جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی ہے تم شاہ صاحب کی کوئی خدمت کرو، کوئی مشروب چائے پانی پوچھو انہیں۔ اچھا شاہ صاحب مجھے تو آپ اجازت دیجئے، یہ زمر ہے آپ کے پاس جب تک آپ کا دل چاہے بیٹھیں اسے اپنا ہی دولت خانہ سمجھیں۔“

بابر شاہ ایک ایک لفظ میں چپے معافی اور رزمیں جاننے والوں میں سے تھے، نوٹوں کی چمک بہت غیر معمولی ہوتی ہے اور طوائف تو ہوتی ہی دولت کی رشتہ دار ہے۔ بابر شاہ زمر کو پسند کرتے تھے اسی لیے ابا میاں، زاہدہ بیگم اور گھر والوں کی پرواہ کیے بغیر اس سے ملنے چلے آتے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ جب گھر والوں کو علم ہوگا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟

بڑی آپا بیرونی دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”شاہ جی! آج آپ نے بہت دیر کر دی! آپ کیا جانیں انتظار کی کتنی اذیت سہی میں نے۔“

زمر داغلا کر بولی، جانتی تھی بابر شاہ کی دھڑکنوں پر اس کا نام لکھا ہے پھر وہ خود پر کیوں نہ تازہ کرتی۔

”زمر! ہماری زندگی تقسیم شدہ ہے، ہمارے وقت میں بہت سے سانچے دار ہیں اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم خیانت کرنے والوں میں سے نہیں ہیں، تمہاری محبت جب بھی اپنا حق مانگتی ہے، ہم تمہارے پاس چلے آتے ہیں۔“ بابر شاہ نے کہا۔

”شاہ جی! اس محبت کے آگے ہارنے لگی ہوں میں۔۔۔۔۔ میرا اب اس ماحول اس فضا میں دم گھٹتا ہے۔ خدا را مجھے یہاں سے لے چلیے۔“

”یہ ناممکن ہے زمر! تم جانتی ہو ہم شادی شدہ ہیں، ہماری بیوی ہے، بچے ہیں، وہ تمہیں قبول نہیں کریں گے۔“ بابر شاہ اپنی فطری سنجیدگی سے بولنے لگے۔

”شاہ جی! آپ ایک بار مجھے یہاں سے لے جائیں یقین کریں تمام عمر میں آپ کی بیوی اور بچوں کی کنیز بن کر رہوں گی۔۔۔۔۔ ساری زندگی آپ سے کوئی حق نہیں مانگوں گی، یہ تک نہیں کہوں گی کہ

اصول بھی سمجھو۔ ”بڑی آپا کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سختی سے مجبور ہو کر زمر نے ہتھکڑیاں باندھ لیں۔

وہ آنکھیں بند کیے خود فراموشی کی کیفیت میں رقص کر رہی تھی۔ تماشا بینوں پر جیسے سکتہ ساطاری ہو گیا تھا۔ گیت کے بول تھے یا اس کے دل کی آواز۔ جذبوں کی تمام تر شدتیں ایک محور پر جمع ہو کر پکار اٹھی تھیں اور گوہر مقصود نے در پر قدم رکھا۔ بابر شاہ اپنی بھرپور شان و شوکت کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ بڑی آپا خوشی سے ان کے استقبال کو اٹھنے لگیں لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اٹھنے سے روک دیا۔ ان کے ہمراہ ان کا دوست فیاض بھی اکثر یہاں آتا تھا اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ ہی تھا۔

انہوں نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر کھولا۔ سوسو کے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور زمر پر نچھاور کر دیں۔ کڑکڑاتے ہوئے نوٹوں کی چمک سے جہاں بڑی آپا کی آنکھوں میں مسرت لہرائی تھی وہیں زمر کی بند پلکیں ایک جھٹکے سے کھلی تھیں۔ انتظار کا نتیجہ اس قدر سرور انگیز ہوتا ہے۔ طمانیت خمار بن کر اس کے پورے وجود پر چھا گئی۔ طبلے کی تھاپ نے لے بدلی۔ ہتھکڑیاں ایک بل کور کے۔ زمر کی خمار آلود نگاہوں نے جھک کر بابر شاہ کی قدم بوسی کی اور پھر نئی تال پر رقص شروع ہو گیا۔

اپنے درووں کا کٹ پھن کر
بے درووں کے سامنے جائیں
جب رونا آئے مسکائیں
جب دل ٹوٹے دیپ جلا لیں
پریم کٹھا کا انت نہ کوئی
کتنی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی سا جن
کچھ نہ مانگیں، سب کچھ پائیں
فیض ان سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں بچھتائیں

رقص ہوتا رہا، گیت گائے جاتے رہے، رات بھٹکتی رہی۔ سازوں کے تھمتے ہی تماشا بین اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ روشن شبستانوں میں تارکیوں کی آغوش میں سینے چلے گئے۔ وسیع و عریض کمرے کے فرش پر پھول کی پتیوں اور نوٹوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ بے ترتیب گاؤں کیوں اور شکن آلود چادروں نے کمرے کی ہیئت ہی بگاڑ دی تھی۔ زمر نے ہتھکڑیاں ایک طرف رکھے اور سچ سج قدم اٹھاتی بابر

شاہ کے قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں کے لودیتے جذبوں کے آگے بابر شاہ نے ہمیشہ خود کو بے بس سمجھا تھا۔ فیاض کو بریف کیس تھما کر انہوں نے اسے باہر گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ چلا گیا۔

”شاہ صاحب! آپ نے اس بیٹھنا ہے؟“ بڑی آپا انہیں ہنوز براجمان دیکھ کر بولیں۔

”جی نہیں..... بس زمر سے چند باتیں کرنی ہیں۔“

”سو بار کریں..... میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ اگر ابھی بیٹھنا ہے تو اندر کمرے میں چلے جائیے..... یہ کمرہ اس وقت آپ کے شایان شان نہیں ہے۔“ وہ ضرورت سے زیادہ مکھن لگانے کی عادی معلوم ہو رہی تھیں۔

”آپا آپ کہاں جا رہی ہیں.....“ بڑی آپا کو اٹھتے دیکھ کر زمر نے پوچھا۔

”بھئی میں تو سونے جا رہی ہوں..... آدمی سے زیادہ رات بیت چکی ہے تم شاہ صاحب کی کوئی خدمت کرو، کوئی مشروب چائے پانی پوچھو انہیں۔ اچھا شاہ صاحب مجھے تو آپ اجازت دیجئے، یہ زمر ہے آپ کے پاس جب تک آپ کا دل چاہے بیٹھیں اسے اپنا ہی دولت خانہ سمجھیں۔“

بابر شاہ ایک ایک لفظ میں چھپے معافی اور رمزیں جانتے والوں میں سے تھے، نوٹوں کی چمک بہت غیر معمولی ہوتی ہے اور طوائف تو ہوتی ہی دولت کی رشتہ دار ہے۔ بابر شاہ زمر کو پسند کرتے تھے اسی لیے ابامیاں، زاہدہ بیگم اور گھروالوں کی پرواہ کیے بغیر اس سے ملنے چلے آتے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ جب گھروالوں کو ظلم ہوگا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟

بڑی آپا بیرونی دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”شاہ جی! آج آپ نے بہت دیر کر دی! آپ کیا جانیں انتظار کی کتنی اذیت سہی میں نے۔“ زمر داغلا کر بولی، جانتی تھی بابر شاہ کی دھڑکتوں پر اس کا نام لکھا ہے پھر وہ خود پر کیوں نہ تاز کرتی۔

”زمر! ہماری زندگی تقسیم شدہ ہے، ہمارے وقت میں بہت سے سانچے دار ہیں اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم خیانت کرنے والوں میں سے نہیں ہیں تمہاری محبت جب بھی اپنا حق مانگتی ہے ہم تمہارے پاس چلے آتے ہیں۔“ بابر شاہ نے کہا۔

”شاہ جی! اس محبت کے آگے ہارنے لگی ہوں میں..... میرا اب اس ماحول اس فضا میں دم گھٹتا ہے۔ خدا را مجھے یہاں سے لے چلیئے۔“

”یہ ناممکن ہے زمر! تم جانتی ہو ہم شادی شدہ ہیں، ہماری بیوی ہے، بچے ہیں، وہ تمہیں قبول نہیں کریں گے۔“ بابر شاہ اپنی فطری سنجیدگی سے بولے۔

”شاہ جی! آپ ایک بار مجھے یہاں سے لے جائیں یقین کریں تمام عمر میں آپ کی بیوی اور بچوں کی کنیز بن کر رہوں گی..... ساری زندگی آپ سے کوئی حق نہیں مانگوں گی، یہ تک نہیں کہوں گی کہ

میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں۔ بس..... مجھے اپنا نام دے دیں۔ اپنی پہچان دے دیں۔ میں اس سے زیادہ کی طلبگار نہیں۔“ زمرہ کے لہجے میں درد تھا، سوز تھا..... تڑپ تھی۔ بابر شاہ کے دل میں اس کا دکھ بہت خاموشی سے در آیا۔

”ہم جانتے ہیں زمرہ! تم بہت اچھی ہو..... بہت پاکیزہ۔ تمہاری محبت پاکر یقیناً ہمیں خود پر فخر محسوس ہو رہا ہے لیکن تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کریں یہ ہمارا ضمیر کبھی گوارا نہیں کرے گا، ہم صرف اپنی شریک زندگی کی وجہ سے انکار نہیں کر رہے بلکہ ہمارے بچے ہماری ساری محبت کے حقدار ہیں، ہم ان کی شخصیت میں کسی قسم کی کمی نہیں دیکھنا چاہتے۔ اسی لیے زمرہ! آج ہم تم سے اجازت لیتے ہیں آج کے بعد ہم تمہارے پاس نہیں آئیں گے۔ گزشتہ سالوں کی رفاقت ایک حسین یاد بن کر ہمارے دل میں رہے گی، ہم تمہیں ٹھکرا نہیں رہے۔ بخدا تم ایسا کچھ مت سمجھنا۔“ بابر شاہ نے آنسوؤں سے جھللاتی آنکھوں میں ڈولنا اپنا عکس دیکھا۔ کتنی نا تمام آرزو میں حسرت بن کر اس کے چہرے پر رقم ہو گئی تھیں۔ بابر شاہ نے رخصت ہونے سے پہلے بہت غور سے زمرہ کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیکھا تھا، اپنے اندرونی جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے زمرہ کی صبح پیشانی چومی تھی اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سات سالوں میں یہ محبت کا پہلا لمس تھا جس سے وہ دونوں آشنا ہوئے تھے لیکن اس کے بعد ان کے راستے جدا تھے۔ ایک آبلہ پانی کا طویل سفر زمرہ کا مقدر کر کے انہوں نے پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تک نہ تھا کہ وہ بیمار وفا جیتی بھی ہے یا مر گئی۔ انگلیوں پر جلن کا احساس ہوا تو وہ جیسے چونک گئے۔ سگریٹ سلگ سلگ کر ختم ہو چکا تھا بالکل ان کی محبت، ان کی زمرہ کی طرح۔ انہوں نے سگریٹ پھینک دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

کتنے ماہ و سال چند لمحوں میں سمٹ کر آ گئے۔ ”تمہارا دل نوٹ گیا تو بجا میرے پاس بھی کچھ نہیں۔ تمہیں بچ رہتے پر چھوڑ کر تمہارا شاہ جی بھی کب منزل پر پہنچ سکا۔ تم جیتے جی مر گئیں زمرہ! اور میں..... میں مر رہا ہوں۔ کتنا بوجھ تھا میرے دل پر تمہاری وفاؤں کا مگر میں نے وہ بوجھ کسی مردہ لاش کی طرح دل میں دفن دیا اور جس شریک زندگی کی خاطر میں نے تمہارے پندار وفا کا ٹھیس پہنچائی میں اس کا بھی کب بن سکا۔ جن بچوں کے لیے میں خود کو منقسم ہونے سے بچاتا رہا۔ میرے حصے میں ان کی بے اعتباری آئی۔ میں تو بے گناہ ہی دار پر چڑھا دیا گیا۔ زمرہ! آج..... آج سوچتا ہوں سب کچھ چھوڑ دیتا۔ بس تمہارا دامن محبت میرے ہاتھ میں ہوتا تو..... تو شاید آج میں یوں لٹا ہوا خالی دامن خالی ہاتھ نہ ہوتا۔ میری زندگی جنت ہوتی۔ تم، تمہاری وفاؤں مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتی تھیں اور اب..... ان لمحوں میں جب..... جب میں ہونے اور نہ ہونے کے بیچ مصلوب ہوں تو تم کہاں ہو؟ کیا تمہارا دامن محبت پھر سے میرے لیے وسیع نہیں ہو سکتا؟ کیا اب بھی تمہاری وفاؤں میرے نام نہیں ہو سکتیں؟“ وہ سر جھکائے کسی بارے ہوئے جواری کی طرح اپنے ہی نقش قدم پر پاؤں دھرتے واپسی کے راستے پر ہو لیے تھے۔

زندگی کے اس جوئے میں وقت نے آخری پتہ شو کر دیا تھا اور ان کے حصے میں ہار آئی تھی۔ وہ واپس پلٹ رہے تھے اس بار سمیت۔ جو لوگ شکست کھا کر ٹوٹ جاتے ہیں زندگی ان کے لیے صرف جہنم بن کر رہ جاتی ہے اور وہ شکست کھا کر ٹوٹنے والوں میں سے نہیں تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو تیروں کے مقابل اپنا جگر آزماتے ہیں اور وقت نے ابھی ان کے لیے اپنے ترکش میں کچھ تیر بچا کر رکھے ہوئے تھے۔



آج کالج کی چھٹی تھی سو سرت جہاں بیٹا بھابی کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں۔ صبح انہوں نے صابروں کے ہمراہ پورے گھر کی خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ اور صفائی کی تھی۔ دن کے کھانے سے کچھ دیر پہلے ابا میاں اور بابر بھائی بھی واپس آ گئے تھے۔ گاڑی کا کافی نقصان ہوا تھا لیکن شبیر حسین شاہ مالی نقصانات کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے۔ سرت جہاں نے رست و اراج پر نگاہ دوڑائی۔ ایک بجنے والا تھا، ان کی منتظر نگاہیں کچن کی کھڑکی کے اس پار گیٹ کی طرف انھیں اور واپس پلٹ آئیں۔

”کیا بات ہے کسی نے آنا ہے.....“ بیٹا بھابی نے ان کی نظروں کی چوری پکڑ لی۔

”نہیں تو..... آنا کس نے ہے؟“ سرت جہاں جلدی سے بولیں۔

”میں نے سوچا شاید تمہاری کسی دوست نے آنا ہے۔ صبح سے تمہاری ان گھریلو مصروفیات سے میں نے اندازہ لگایا۔“ بیٹا بھابی کچن کڑا ہی کا مصالحہ چکھتے ہوئے بولیں۔

”ہر یانی تمہارے ذمے ہے اماں بی کے طریقے سے بنانا۔ ورنہ ہم سب تو مارے مروت کے کھا ہی لیں گے۔ شا کرنے ریکارڈ لگا دینا ہے تمہارا۔“

”اب ایسی بھی ٹکمی نہیں ہوں مانا کہ آپ جیسی بھابیوں کی نندیں عموماً کوری رو جاتی ہیں لیکن اماں بی نے سب کچھ سکھایا ہے مجھے۔“ سرت جہاں دیکھی چو لہجے پر کہتے ہوئے بولیں۔ ایک گھنٹہ مزید گزر گیا۔ کھانا تیار تھا سو ٹیبل پر لگا دیا گیا۔ گھر کے کبھی افراد کھانے پر جمع تھے۔ آپس کی باتوں کے دوران کھانا کھانے کے بعد ابا میاں نے قبوے کی فرمائش کر دی۔ صابروں نے برتن اٹھا لیے اور قبوہ تیار کرنے کچن سدھار گئی۔

”بڑے شاہ جی! بابر کوئی آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔“ مالی فضل الہی نے ڈانٹنگ روم میں جھانک کر کہا۔ سرت جہاں نے چونک کر سر اٹھایا۔

”کون ہے..... نام نہیں پوچھا اس کا؟“ شبیر حسین شاہ بولے۔

”پوچھا تھا جی پر..... مشکل سا نام تھا ذہن سے لے (اتر) گیا ہے؟“ مالی فضل نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔ شبیر حسین شاہ مسکرائے۔

”تمہارا بھی کوئی جواب نہیں فضل الہی..... شکر ہے تمہیں اپنا نام یاد رہتا ہے بہر حال اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ ہم آتے ہیں۔“ ان کی بات سن کر فضل الہی باہر نکل گیا۔

”ابا میاں! کون ہو سکتا ہے؟“ اظہر بچانے سوال کیا۔

”کوئی بھی ہو..... میں گے دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کون ہے بہر حال تم لوگ آپس میں گپ شپ کر دو ہم ذرا جا کر ملتے ہیں۔“ شبیر حسین شاہ اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف چلے گئے۔

دروازے پر ہونے والے کھٹکے سے چونک کر اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ روشن چہرے پر بھی داڑھی، کنپٹیوں کے سفید بالوں نے انہیں بے حد بارعب اور پُر تمکنت بنا دیا تھا، اونچے قد اور قد سے وزنی جتنے کے مالک شبیر حسین شاہ اس عمر میں بھی قابل رشک صحت و وجاہت کے مالک تھے۔ ڈرائنگ روم کی پُر شکوہ سجادت اور نفاست، حویلی کی بلند و بالا دیواریں اسے کسی چیز نے متاثر نہیں کیا تھا لیکن پہلی بار شبیر حسین شاہ کو دیکھ کر جیسے ایک لمحے کو اس کے اندر کہیں کچھ ہوا تھا۔

”اسلام علیکم.....“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے رکی سے انداز میں ہاتھ ملایا۔

”وعلیکم السلام۔“ ساتھ ہی اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئے۔

”جی بر خوردار..... آپ کون ہیں اور کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟“ شبیر شاہ نے تمہید کو

غیر ضروری سمجھتے ہوئے ڈائریکٹ اس سے اس کی آمد کی بابت پوچھا۔

”جی میرا نام فرجاد ملک ہے اور میں گورنمنٹ کالج میں فور تھ ایئر کا سٹوڈنٹ ہوں۔“ فرجاد ایک

ہل کو رک گیا۔ شبیر حسین شاہ کی پُر سکوت سمندر کی طرح ٹھہری آنکھیں اس کے چہرے پر ٹپک گئیں۔

”پھر.....؟“ اس لفظ ”پھر“ میں کیا کچھ پوشیدہ تھا۔ فرجاد کے لیے سمجھنا دشوار نہیں تھا۔

”سر مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے؟“

”بر خوردار جہاں تک میرا خیال ہے ہم تم سے پہلی بار مل رہے ہیں۔ تم کون ہو آج سے پہلے تک

ہم نہیں جانتے تھے اور ہم کیا ہیں یہ شاید تم اچھی طرح نہیں جانتے۔ بہر حال کیا کسی قسم کی مالی معاونت

چاہئے ہم سے۔“ اجنبیت کا بھرپور تاثر شبیر حسین شاہ کے ادا کیے ایک ایک لفظ سے مترشح تھا۔

”جی نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“

”تو پھر کیا بات ہے!“

”میرا خیال ہے شاہ صاحب کہ اپنا مدعا بیان کرنے سے پہلے میں اپنا تمہوڑا سا تعارف کروا دوں

تو شاید میری بات سمجھنے میں آپ کو زیادہ آسانی ہو۔“

”بولو..... ہم سن رہے ہیں۔“ شبیر شاہ صوفے کی پشت سے ٹپک لگا کر بیٹھ گئے۔

”شاہ صاحب! میرے نام سے آپ کو آگاہی ہو چکی ہے اور یہ بھی آپ جان چکے ہیں کہ میں کیا

کرتا ہوں۔ میرا تعارف بس اتنا سا ہے کہ میری زندگی اوپر والے کی رحمت کے پیش نظر ہے، بچپن سے ہی والدین کی شفقت سے محروم ہوں، زندگی میں جو کچھ کیا..... جو کچھ پایا..... اللہ کے بعد صرف اپنی ذاتی کوششوں سے پایا..... اور آج کسی قسم کی کمی نہیں ہے مجھے۔“

”تو بر خوردار یہ سب تم ہمیں کیوں بتا رہے ہو۔“ ان کے سوال پر وہ ایک لمحہ کو خاموش ہو گیا۔

کچھ جھجک، کچھ ہچکچاہٹ نے چند ساعت اس کی زبان پر پہرہ بٹھا دیا پھر وہ بہت دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

”اس لیے شاہ صاحب! کہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دامن سوال دراز کرنے سے پہلے آپ کو

اپنے بارے میں آگاہ کروں۔ میں بہت اہم اور ضروری بات کرنے والا ہوں یقیناً آپ کے سامنے اس

طرح بات کرنا مجھے زیب تو نہیں دیتا لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرے والدین حیات نہیں

ہیں جو آ کر آپ سے بات کرتے۔ ممکن ہے آپ کو میری بات سن کر غصہ آ جائے لیکن شاہ صاحب! میں جو

کچھ آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ ایسا غیر اخلاقی، غیر مہذب بھی نہیں جسے سن کر آپ بھڑک انھیں کیونکہ میں

سمجھتا ہوں کہ آپ اس وقت جس مقام پر ہیں یہاں انسان عمر کے ہر حصے سے تجربات کشید کر چکا ہوتا

ہے۔ مجھے یقین ہے آپ میری بات توجہ اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سنیں گے۔“ وہ بہت شائستگی سے

اپنے مافی الضمیر کو بیان کر رہا تھا۔

شبیر حسین شاہ کی جہانگیرہ نگاہیں اس کے چہرے پر ٹپکی ہوئی تھیں۔

”دیکھو بر خوردار! لفظ جب تک زبان پر نہیں آتے با حرمست ہوتے ہیں۔ جب ہونٹوں سے ادا

ہو جائیں، بے وقعت اور حقیر ہو جاتے ہیں لہذا بولنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم کون

ہو اور کس سے مخاطب ہو؟“

ان کی آنکھوں میں سکوت در آیا اور لہجے میں غضب کا خیراؤ۔ چند لمحے سر جھکا کر خاموش بیٹھے

رہنے کے بعد وہ جھجک آمیز لہجے میں بولا۔

”شاہ صاحب! میں..... میں آپ کی بیٹی سر.....“

”بس.....“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

شبیر حسین شاہ کا چہرہ شدت غیض و غضب سے سرخ ہو رہا تھا یقیناً ان کے اندر ایک جوار بھانا اٹھ رہا تھا۔

”تمہاری زبان پر ہماری بیٹی کا نام ایک بار بھی آئے ہم برداشت نہیں کریں گے۔“ ان کے لہجے

میں سانپ جیسی پھٹکار تھی۔

”شاہ صاحب! آپ میری پوری بات تو سنیں۔“ فرجاد نے مزید بولنا چاہا۔

”بس! جو سن لیا وہ کافی ہے۔ ہم نا سمجھ، نادان نہیں۔ تمہاری بات سننے سے پہلے ہی سمجھ چکے تھے

کہ کیا کہنا چاہتے ہو تم..... اسے بھی بہت جانو جو تمہیں اتنا بولنے کی اجازت دے دی، مگر آئے ہوئے

دشمن کو بھی ہم مہمان سمجھتے ہیں اور مہمانوں کے ساتھ بدسلوکی کرنا ہماری روایت نہیں۔“ شبیر شاہ نے اپنے غصے پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”شاہ صاحب! میری.....“

”بس میاں بس..... تمہاری بات ختم ہو گئی۔ ہمیں مجبور نہ کرو کہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں کہ تم اپنی ٹانگوں پر واپس نہ جاسکو۔“ وہ اس کی طرف سے رخ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کے اشارے سے اسے چلے جانے کو کہا۔ فرجادان سے محض دو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

”شاہ صاحب! میں نے صرف مسرت جہاں کا ہاتھ مانگا۔“ چناخ کی بھرپور آواز آئی اور لفظ جیسے اس کے حلق میں سی انک کر رہے تھے۔ اس قدر بھرپور تھپڑ تھا کہ فرجادو تین قدم پیچھے کھڑا گیا۔

”اوقات کیا ہے تمہاری..... نسب کیا ہے تمہارا..... اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو تمہیں تو یہ تک نہیں معلوم کہ تمہارا باپ کون تھا..... تمہاری ماں کون تھی۔“

”بس شاہ صاحب بس..... بہت سن لیا میں نے..... میں یتیم سی..... کم حیثیت سی..... آپ بلند نسب سی لیکن دوسروں کو حقیر سمجھنے کا حق نہیں ہے آپ کے پاس۔“ فرجادو ان کے لہجے کا طنز کسی بھالے کی طرح دل میں کھینچا محسوس ہوا۔

”جب تم کسی کے دروازے پر جا کر سوال کرو گے تو اسے حق حاصل ہوگا کہ وہ تم سے پوچھے تو سی کہ آخر تم ہو کیا.....؟ پر خوردار آئندہ جب کسی دروازے پر اس نیت سے سوال کے لیے جاؤ تو اپنی اوقات ضرور دیکھ لینا۔“ شبیر حسین شاہ کے لہجے کی حقارت اسے کسی تازیانے کی طرح لگی۔

”شاہ صاحب! آپ بہت بلندی پر ہیں..... مان لیا کہ اللہ نے آپ کو بہت اونچا مقام دیا ہے شاید اسی لیے اتنی بلندی سے میں آپ کو بہت چھوٹا اور حقیر دکھائی دے رہا ہوں لیکن اگر آج بھی سب کچھ میرے پاس ہوتا..... میں حیثیت میں آپ کے برابر ہوتا تو شاید آپ کا یہ اونچا قدم میرے سامنے دب جاتا یا پھر آپ اتنی بلندی کی بجائے وہاں ہوتے جہاں میں کھڑا ہوں تو یقیناً آپ کو اتنا چھوٹا ہرگز دکھائی نہ دیتا۔“

”بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ..... ہمارے ضبط کا اور امتحان مت لو۔“ انہوں نے غصے سے دھاڑتے ہوئے فرجادو کو بیرونی دروازے کی طرف دھکیلا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے نکل آیا اور سنبھلتے سنبھلتے بھی ایک دو قدم مزید پیچھے کو ہو گیا۔ دروازے کی دہلیز اب اس سے دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس نے دونوں بازو دروازے کے پنوں پر رکھتے ہوئے شبیر حسین شاہ کی طرف دیکھا۔

”شاہ صاحب! میں جو بات کہنے آیا ہوں وہ مکمل کر کے جاؤں گا۔“ ان کا سخت رویہ اس کی ضد کو اور پختہ کر رہا تھا۔

”تمہارا ایک لفظ بھی سننا ہمیں گوارا نہیں..... تم جیسے بے حیثیت اوقات سے گرے دو نکلے کے

محض سے بات کرنا ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں۔“ شبیر شاہ اس کے قریب چلے آئے۔

”نگلو یہاں سے..... اور آئندہ سادات گھر کی بلند و بالا دیواروں کی طرف نگاہ اٹھانے سے پہلے اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا۔“ انہوں نے دروازے کے پٹ پر دھرا اس کا ہاتھ نیچے کو جھکا۔

”شاہ صاحب! میں نے کہا ناں کہ میں بات پوری کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“

”میں کہتا ہوں کیسے نہیں جاتے۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے دھکا دیا۔ اس بار وہ تقریباً گرتے گرتے بچا تھا۔ برآمدے کی دیواروں کے ساتھ ترتیب سے لگی کرسیوں سے ٹکرا کر وہ بمشکل خود کو گرنے سے بچا سکا۔ تھوڑے فاصلے پر وہیں برآمدے میں پانچوں کزیل جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑھے شیر کے دھاڑنے کی آواز بخوبی ان کی سماعت تک پہنچی تھی لیکن انہوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ اب ڈرائنگ روم کے دروازے سے برآمدہ ہونے والے اجنبی کو بھی انہوں نے بہت غور سے دیکھا تھا اور شبیر حسین شاہ کا غضب سے بھرپور چہرہ بھی ان کے چہرے کے عضلات تن کر نفوٹش کو بگاڑ رہے تھے۔ آنکھوں میں نفرت کے انکارے دھبے رہے تھے۔

”یہاں کتوں کا بھونکنا برداشت نہیں کیا جاتا۔ سادات گھر کا ایک اصول سنا کہ جو آنکھ اس گھر کی عزت کی طرف اٹھے نکال دو۔ اور تم..... تم ہماری عزت کے درپے ہو۔ ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔“ ان کے لہجے سے آگ بھڑک رہی تھی۔ اظہر، ہابر، عارب، شاہ کر، شفقت پانچوں معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر ہامیاں سے پوچھ لے۔

”شاہ صاحب! کبھی کبھی اندھیر کوٹھڑیوں میں بھی روزن کھل جایا کرتے ہیں۔ بعض جذبوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ بلند دیواریں بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں۔ اجازت دیجئے۔“ وہ اپنی بات کہہ کر رکنا نہیں تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ شبیر حسین شاہ چونٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے۔ پشت پر ہاتھ باندھے طویل برآمدے کے چکنے فرش کو بے رحمی سے روندتے ادھر سے ادھر ٹپٹنے لگے۔

”زہرا خاتون..... مسرت جہاں.....“ ان کی آواز میں غضب کا اشتعال تھا جیسے آج ان کے سامنے جو چیز آئے گی وہ جس نہیں ہو کر رہ جائے گی۔ ان کی بلند آہنگ آواز کسی آنے والے طوفان بلاخیز کا پتہ دے رہی تھی۔ مسرت جہاں اور اماں بی، اپنی جگہ لرز کر رہ گئیں۔ دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مسرت جہاں کے دل کا چور انہیں سر جھکانے پر مجبور کر گیا۔ اماں بی کی جہاندیدہ نظروں سے خود کو چھاتی سمیٹتی وہ اٹھ کر برآمدے میں آ گئیں۔ شینا بھابی اور مقسوم بھابی ابامیاں کے ڈر سے وہاں آنے کی بجائے کچن کے دروازے میں خاموش تماشا شائی بنی کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ شبیر حسین شاہ نے مسرت جہاں کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ ان آنکھوں میں شکوہ، ملامت، مان کی ٹوٹی کرچیاں،

اعتماد اور بھروسے کی موت کا کرب کیا کچھ نہ تھا۔ مسرت جہاں نے ایک نظر ان کے ہر جلال چہرے کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے آنکھیں جھکا لیں۔

”جینھے مسرت جہاں..... زہرا خاتون آپ بھی بیٹھیں۔“ شبیر حسین بدستور ٹپکتے ہوئے گویا ہوئے۔ اماں بی کو تو ابھی تک ان کے اس ناقابل فہم رویے کی سمجھ نہیں آئی تھی بہر حال وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ شبیر حسین شاہ کسی کو مخاطب کرنے کی بجائے عجیب کاٹ دار انداز میں مسرت جہاں کو گھورے جا رہے تھے۔

”ابامیاں آخر بات کیا ہے؟ آپ بتاتے کیوں نہیں۔“ شاکر حسین اپنی فطری عجلت پسندی کے باعث زیادہ دیر صبر نہ کر سکے۔

”اگر بات کہیں تو محض چند الفاظ ہیں لیکن ان کا پس منظر کس قدر تاریک ہے یہ شاید ہمارے سوا کوئی سمجھ نہ پائے، ہم مسرت جہاں سے تفصیلی بات کرنا چاہتے ہیں۔“ انہوں نے روئے سخن شاکر حسین سے مسرت کی طرف موڑ دیا۔ مسرت جہاں کی آنکھیں ضرور جھکی ہوئی تھیں لیکن ابامیاں کے چہرے کے تاثرات کا انہیں اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔

”مسرت جہاں..... ہمارے منہ سے نکلے الفاظ آپ کی نظر میں کتنے معتبر ہیں۔“

”جی ابامیاں..... میں سمجھی نہیں۔“

”آپ اتنی نادان تو نہیں کہ سمجھ ہی نہ پائیں، ہم نے کیا کہا ہے..... ہم نے آپ سے یہ پوچھا ہے کہ ہمارے کبے الفاظ آپ کے نزدیک کیا حیثیت رکھتے ہیں۔“ ان کے لہجے میں سکوت تھا لیکن ایسا سکوت جو کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

”ابامیاں! ہم نے ہمیشہ آپ کے کبے الفاظ کی حرمت کا پاس کیا ہے۔“ مسرت جہاں نے سر جھکائے جھکائے ہی جواب دیا۔

”آپ غلط کہہ رہی ہیں مسرت جہاں! ہمارے کبے لفظوں کو نامعتبر کیا ہے آپ نے..... کیا آپ بھول گئیں ہم نے کہا تھا مسرت جہاں! جس اچلے لباس میں آپ ملبوس ہیں ہم اس پر ذلت کا ایک چھینٹا بھی برداشت نہیں کریں گے۔ کہا تھا ناں ہم نے۔“ شبیر حسین شاہ مسرت جہاں سے مخاطب تھے لیکن ان کی کئی باتیں کسی حد تک ان کے بیٹوں نے سمجھ لی تھیں۔

”جج..... جی ابامیاں.....“ مسرت جہاں ہکلائی گئیں۔ شبیر حسین شاہ کے منہ سے یہ بات سن کر اماں بی کا دل بھی سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرا۔ ان کی نظریں مسرت جہاں کے چہرے پر ٹپکت گئیں۔

”ہوں..... اس کا مطلب یہ ہوا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے آپ نے اپنے پاکیزہ دامن کو داغدار

کیا۔ کیا آپ نے اس وقت سوچا نہیں کہ آپ کے دامن کی یہ سیاہی آپ کے بھائیوں اور باپ کی ناموس پر ایک طمانچہ ثابت ہوگی، ہم نے ایک جگہ سے چھینٹنے کی بات کی تھی اور آپ ذلت گھر میں ہی اٹھالائیں۔“

”ابامیاں..... آخر یہ سب کیا ہے..... مجھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا، صاف صاف بتائیں کیا مسئلہ ہے..... کیا ہوا ہے۔“ عارب بھائی کا ضبط جواب دے گیا۔

”دھیرج..... ہمیں پہلے مسرت جہاں سے پوچھنے دو۔ کیا یہی وہ تعلیم تھی جس کی خاطر انہوں نے احتجاج کیا تھا۔ زہرا خاتون نے حمایت کی تھی اور گھر کے سب افراد نے خوشی منائی تھی۔ مسرت جہاں کیا اپنے بعد آنے والوں کے لیے یہ زینہ چنا ہے آپ نے؟“ شبیر حسین شاہ انتہائی سخت مزاج سہی لیکن جوان اولاد خصوصاً بیٹی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھنا چاہئے اس سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے ابھی تک ضبط سے کام لے رہے تھے حالانکہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ جس پر ضبط کرنا ان کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہ تھا۔

”ہم نے آپ سے کچھ پوچھا ہے مسرت جہاں! کیا سوچ کر آپ نے ایک کم ذات شخص کو اتنا حوصلہ دیا کہ وہ ہمارے مقابل آن کھڑا ہوا۔“

”ابامیاں..... ہم نے کچھ نہیں کیا..... ہمارا یقین کیجئے ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے آپ کی یا ہماری عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔“ مسرت جہاں بہت آہستگی سے صفائی دینے والے انداز میں بولیں۔

”ہم نے سوال کچھ اور کیا ہے مسرت جہاں! آپ سے پوچھے بغیر آپ کی مرضی کے بغیر وہ شخص اتنی جرات نہیں کر سکتا کہ سادات نگر کی دہلیز پر پاؤں بھی رکھ سکے۔ کجا کہ آپ کا نام لینا۔ خود سوچئے مسرت جہاں کسی اجنبی کی زبان پر آپ کا نام آئے، ہماری غیرت اسے زندہ زمین میں نہ گاڑ دے گی۔“

”بس ابامیاں! اب میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے، میں سب سمجھ گیا ہوں۔ اب آپ کچھ نہ کہیں مجھ پر چھوڑ دیں۔ قسم سید کی اگر اب وہ کل کا سورج بھی دیکھ پایا تو۔“ عارب بھائی مارے طیش کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”نخبرہ.....“ شبیر حسین شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کو کہا۔

”ابامیاں! اس نے کون سی قابل اعتراض حرکت کی..... محض رشتہ ہی تو مانگا ہے۔“ مسرت

جہاں عارب بھائی کی بات سن کر برا فروختہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اب بات جب زبان پر آئی گئی ہے تو

میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ..... کہ میں بھی فرجاد سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ لفظ نہیں تھے کوئی ہم تھا جو

سادات نگر کے در و دیوار کو منہدم کرتا چلا گیا۔ ابامیاں مسرت جہاں کے چہرے پر نظریں نکائے عجیب انداز سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ بے یقینی اور بے اعتباری سے شاید انہیں تو قیاس نہیں تھی کہ مسرت جہاں

کے منہ سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں۔

”بے حیا۔۔۔ بے غیرت۔۔۔ کیا بک رہی ہے۔“ اماں بی غصے کی شدت سے کانپتے لہجے میں بولیں لیکن مسرت جہاں نے جیسے یہ الفاظ ادا کر کے اپنے دل کا بوجھ اتار پھینکا تھا۔ سوچے بغیر کہ ان کا یہ بوجھ اس گھر کے کینوں کی روحوں کو کس کرب سے ہلکانا کر گیا تھا۔ پانچوں بھائی مشتعل ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، شدت غیض و غضب سے شائد ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ غیرت کسی لاوے کی طرح ان کے جسموں میں پکپکے لگی، ان کے قدم اٹھے تو ماحول کا سکوت ٹوٹ گیا۔ وہ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف گئے تھے اور جب واپس ملے تو پانچوں کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ مسرت جہاں، اماں بی، بھابھیاں اپنی اپنی جگہ لرز کر رہ گئیں۔ اس سے پہلے مسرت جہاں نے اپنے لیے کبھی کسی کی آنکھ میں نفرت یا غصہ نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت ہر دیکھنے والی آنکھ انہیں یوں گھور رہی تھی جیسے وہ کوئی بہت حقیر اور اپنے مقام سے گری ہوئی چیز ہوں۔

”ابامیاں۔۔۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔۔۔ اس کی زندگی یہیں تک تھی۔“ عارب بھائی نے کہا۔

”آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔۔۔“ مسرت جہاں نے جیسے تہیہ کر لیا تھا کہ آج باپ اور بھائیوں کے ضبط کی انتہا دیکھ کر دم لیں گی۔

”بکواس بند کرو تم اپنی۔ تمہاری شہ پر وہ یہاں تک آیا۔ تم نے کیا سمجھا تھا ہم سب مرے ہوئے ہیں یا ہم نے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔“ انظہر بھائی مشتعل لہجے میں بولے۔

”انظہر۔ عارب۔۔۔ برابر اندر رکھا آؤ یہ پستول اور بندوقیں۔۔۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔“

”ابامیاں! اس کے بعد کون سے وقت کے منتظر ہیں آپ۔۔۔ اس شخص کی بر آتی جاتی سانس اب ہم پر بار ہے۔“ بابر بھائی جیسے سرد مزاج شخص کا اشتعال بھی دیدنی تھا۔ شبیر حسین شاہ کے روکنے پر بھی وہ نہیں رک رہے تھے۔

”ابامیاں غلطی میری ہے تو سزا بھی مجھے ہی مٹی چاہئے۔“ مسرت جہاں نے کہا۔

”ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ ذلت کا بیج تو تم نے بویا ہے۔ تمہیں، پہلے کاٹ کر پھینکنا چاہئے۔“

عارب بھائی نے ریوالور اس پر تان لیا۔ اماں بی کی سانسیں حلق میں اٹک گئیں۔

”یا اللہ!۔۔۔ یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔۔۔ میری روح میں اتنی سکت نہیں ہے میرے مولا جو اس طوفان کا سامنا کر سکے تو معاف کر دے ہمیں اللہ! ہم اس آزمائش کے قابل تو نہیں ہیں۔“ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”عارب! کیا کر رہے ہو۔۔۔“ بابر نے عارب بھائی کا پستول والا ہاتھ نیچے کیا۔

”پہلے اس کی سانسوں کی ڈور کٹنی چاہئے جس نے ہماری عزت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔“ وہ

پانچوں ہتھیار لے کر گھر سے باہر جانے لگے۔ مسرت جہاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ اگر اس عالم میں وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو یقیناً اس دن کا ڈوتا سورج اسے بھی اپنے ساتھ اندھیروں میں لے جائے گا۔ انہوں نے اپنا دوپٹہ اتار کر بھائیوں کے پیروں میں رکھ دیا۔ اماں بی کی روح لرز گئی۔

”بھائی! رک جائیں آپ سب۔۔۔ معاف کر دیں اسے۔۔۔ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“

”آئندہ کی کس نے دیکھی ہے۔۔۔ آئندہ ایسا تب ہی ہوگا ناں جب تم اس گھر کی دہلیز سے باہر پاؤں رکھو گی۔“ سرد لہجے میں کہہ کر عارب بھائی آگے بڑھے۔ سفید براق دوپٹے پر پانچوں بھائیوں کے نقش قدم ثبت ہو گئے۔ شبیر حسین شاہ نے دوبارہ انہیں روکنے کو کہا لیکن وہ پانچوں سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ گئے۔ مسرت جہاں نے جھک کر مٹی میں تعزیر اہوا آٹھل اٹھایا اور کسی قیمتی جھینے کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا۔

کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ بہت خاموشی سے جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ شبیر حسین شاہ نے اماں بی کے متشکر چہرے کو ایک نظر دیکھا اور بوجھل قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ان کے بیٹوں نے ان کا کہا نہیں مانا تھا، ان کے روکنے پر وہ روکے نہیں تھے۔ غیرت و ناموس پر آٹھ آجائے تو انسان ضبط نہیں کر سکتا۔ وہ پانچوں بھی اسی جوش میں گھر سے نکلے تھے کہ فرجاد کو موت کی نیند سلا دیں جس کی وجہ سے پہلی بار ان کی بہن نے سر اٹھا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ابامیاں سے اور بھائیوں سے بات کی تھی۔ اعتراف کیا تھا کہ یہ سب کچھ اسی کی ایماء پر ہوا ہے پھر وہ اسے کس طرح چھوڑ دیتے۔

شبیر حسین شاہ ان کے جانے کے بعد سے اپنے کمرے میں بند تھے۔ اماں بی کے بار بار دروازہ بجانے پر بھی انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ گھر بھر پر سکوت مرگ طاری تھا جیسے اتنی وسیع و عریض حویلی ویران اور آسیب زدہ ہو، کوئی کھٹکا، کوئی صدا نہیں تھی، رات کا کھانا تیار تھا لیکن کسی نے روٹی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

اماں بی دوسرے کمرے میں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ماضی کا ورق ورق ان کے سامنے تھا، کہیں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی انہوں نے۔ کسی معاملے میں بھی کوئی کجی ان سے سرزد نہیں ہوئی تھی پھر۔۔۔ پھر مسرت جہاں کی تربیت میں ان سے کہاں غلطی ہوئی؟ کہاں کمی ہوئی؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھیں، انہیں شبیر شاہ کی طرف سے بھی فکر لاحق تھی، رات ہو چکی تھی اور انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔

ادھر مسرت جہاں سامنے بیڈ پر دوپٹہ پھیلائے اس پر بنے جوتوں کے نشان دیکھ رہی تھیں۔ آج سے پہلے تک بڑا یقین تھا انہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ ہیں۔ بھائیوں کی لاڈلی ہیں لیکن جس طرح ان کے دوپٹے کو پیروں کے روند کر ان کے بھائیوں نے ان کے مان کو کرچی کرچی کیا تھا اس سے ان کا دل بھر آیا تھا۔ ذہن میں اپنے گھر کے کینوں کے خلاف سوچیں ابھرنے لگیں۔

یہ محبت بھرے چہرے کس قدر منافق ہیں، زندگی بھر محبت کا ڈھونگ رچاتے رہتے ہیں اور آخر کار

سودھیت یہ محبت واپس لے لیتے ہیں۔ کیا ماں باپ ایسے ہوتے ہیں جنہیں اولاد کی خوشی سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ جنہیں اپنی ذات، صرف اپنی خوشی عزیز ہو اور بس کیا بھائی ایسے ہوتے ہیں جنہیں بہنوں کا مان توڑتے ہوئے ایک ہل کو بھی احساس نہ ہو۔

انسان ہیں یہ جو اپنے سوا ہر ایک کو حقیر سمجھتے ہیں۔ کیا یہ انسان کہلانے کے لائق ہیں، ایسی کون سی بڑی غلطی کر دی تھی اس نے محض رشتہ ہی تو مانگا تھا۔ کیا یہ اتنی بڑی خطا ہے جس کی سزا موت ہو۔ مسرت جہاں جوں جوں سوچ رہی تھیں ویسے ہی ان کے دل میں اپنے گھر کے افراد کے لیے نفرت پیدا ہو رہی تھی، انہیں اپنے بھائی انسان نما حیوان دکھائی دے رہے تھے جو ان کی محبت کو قتل کرنے کے درپے تھے جنہیں ایک انسان کی زندگی سے صرف اس لیے ہیر ہو گیا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ان کی بہن کا نام آ گیا تھا، ان کے دماغ میں سوچوں کا لاوا سا پکھنے لگا۔ رات کا پہلا پہر تھا لیکن کسی نے ان کے دروازے پر آ کر ان سے کسی قسم کی بات کرنا گوارا نہیں کی تھی۔ کسی ناسور کی طرح کاٹ کر انہیں پھینک دیا گیا تھا اور جب وہ جسم سے الگ ہو چکی تھیں تو پھر اس جسم کا دکھ اس کا درد بھی انہیں محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یونہی سوچوں میں گم بیٹھی تھیں جب ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔ انہوں نے دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالی، ساڑھے گیارہ بجے رہے تھے، دوسری کھنٹی پر انہوں نے ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو مسرت۔۔۔ مسرت یہ تم ہونا۔“ بے قرار لہجے میں سوال کیا گیا۔ مسرت جہاں کی سماعت کو یقین ہی نہ آیا۔ ”فر۔۔۔ فر جاد آپ۔۔۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکیں۔

”ہاں مسرت۔۔۔ میں ہی ہوں۔۔۔ تم۔۔۔ تم ٹھیک تو ہونا۔“

”یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے۔۔۔ مجھے کیا ہونا ہے ٹھیک ہوں میں۔۔۔“

”مسرت! تمہارے ابا میاں کے سامنے دامن سوال دراز کرنے کی جرأت بہت مہنگی پڑی مجھے۔“ اس کا آرزوہ لہجہ مسرت جہاں کو بھی دکھی کر گیا۔

”میں بہت کم حیثیت سہی مسرت جہاں لیکن اتنی حیثیت ضرور رکھتا ہوں کہ تمہیں زندگی کی ہر خوشی دے سکوں۔“

”فر جاد! یہ آپ مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں۔ میں نے کب تقاضا کیا ہے خوشیوں کا۔ میں تو صرف آپ کی محبت پا کر ہی بہت خوش تھی۔“ مسرت جہاں دھیسے لہجے میں بولیں۔

”لیکن تمہارے ابا میاں کو تمہارے لیے اعلیٰ نسب، خاندانی اور دولت مند شخص کا رشتہ چاہئے اور یہ تینوں چیزیں میرے پاس نہیں۔۔۔ انہوں نے بہت حقیر سمجھا مجھے۔۔۔ شائد دولت ہی ان کے نزدیک واحد معیار ہے انسان کو پرکھنے کا۔“ فر جاد کا لہجہ بکھرا ہوا تھا یقیناً جو سنو کہ اس کے ساتھ کیا گیا تھا وہ کم از کم

اس کا مستحق نہیں تھا۔

”اب۔۔۔ اب کیا سوچا ہے آپ نے؟“ مسرت جہاں بے چینی سے بولیں۔

”مسرت! تمہاری محبت سے دستبردار ہونا میرے لیے موت سے بھی بدتر ہے، مجھے ایسی زندگی نہیں چاہئے جس میں تمہاری محبت، تمہارا ساتھ نہ ہو، زندگی نے ہر بار مجھ سے دھوکا کیا، ہر بار خوشی میرے دروازے پر دستک دے کر لوٹ گئی۔ کیا میرا دل صرف دسکیں سننے کے لیے ہے؟ کیا مجھے خوشیوں کی آرزو نہیں۔۔۔ اور اس بار۔۔۔ اس بار میں نے سوچ لیا ہے اس خوشی کو واپس پلٹنے نہیں دوں گا۔ تمہیں مجھ سے جدا کرنے کے لیے تقدیر کو بھی دانتوں، پسینے آجائیں گے۔“ فر جاد کے لہجے میں جذبات کی سچائی اور مسرت جہاں کو پانے کی تڑپ تھی اور وہ تو جیسے پکھل رہی تھیں، جذباتوں کی تیز آنچ ان کے وجود کو جلا کر خاکستر کر رہی تھی، اس ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے شخص کی محبت اتنی طاقتور ہو گئی کہ خون کے رشتوں کی صداقت پر غالب آ گئی۔

”فر جاد میں۔۔۔ میں بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی، آپ جو کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔ بس، مجھ سے جدا مت ہوئے گا۔ مجھے یوں راستے میں مت چھوڑ دینے گا۔“

”مسرت! سو عیب ہوں گے مجھ میں۔۔۔ مگر یہ ہرگز نہ سوچنا کہ کبھی تمہیں راہ میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہئے زندگی بھر کے لیے۔ تم۔۔۔ تم ملی ہو تو زندگی مجھے زندگی لگنے لگی ہے۔ ورنہ صرف سانس لیتا تھا۔ میں زندگی نہیں جیتا تھا۔۔۔ ہر آنے جانے والی سانس دل کو اذیت دیتی تھی لیکن اب۔۔۔ اب مجھے جینا اچھا لگتا ہے۔ تمہارے سنگ، تمہارے لیے۔“

لفظوں کی ٹھنڈی پھوہار مسرت جہاں کے محبت بھرے دل کو بھگور رہی تھی، انہیں ہر پہنی اذیت و کوفت بھول گئی، ایک طمانیت رگ و پے میں دوڑ گئی۔

جب ایک محبت کرنے والا اپنی محبت کی تمام تر شدتیں ان پر لٹا رہا تھا ان کے بغیر جو ایک ہل جیسے کار وادار نہیں تھا تو پھر انہیں اور کیا چاہئے تھا ان کی آنکھوں کے سبزے پر خوابوں کی شبنم گر نے تھی۔

”مسرت! سیدھا راستہ اپنا کر تمہارے گھر والوں کے سامنے دامن سوال دراز کیا تھا لیکن بدلے میں سوائے حقیر کے اور کچھ نہ ملا۔ اگر کوئی امید ہوتی تو۔۔۔ تو شائد میں بار بار تمہارے در پر دستک دیتا لیکن وہاں کے در و دیوار پتھر کے ہیں۔ میری صدا بس صدا ہے صحرائی ثابت ہوگی۔ اگر۔۔۔ اگر تم ساتھ دو تو شائد ہماری محبت کو منزل نصیب ہو جائے۔“

”آپ جو کہیں گے اسی طرح کروں گی، بولیں مجھے کیا کرنا ہے!“

”مسرت! تمہیں اپنا گھر والدین اپنے خون کے رشتے ہر آرام ہر آسائش کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلنا ہوگا، دنیا کے اس گوشے میں جہاں تمہارے سامنے صرف میری ذات ہوگی اور میرے لیے صرف

تم..... جہاں محبتیں تقسیم ہونے کی بجائے صرف ہم دونوں کے بچ رہیں گی اس گوشے کو ہم اپنے خوابوں اپنی آرزوؤں سے سجائیں گے۔ بولو مسرت ساتھ دوگی ناں میرا۔“ فرجاد محبت کی تمام تر شدت اپنے لہجے میں سموتے ہوئے بولا۔

مسرت جہاں تو پہلے ہی اس سرزمین اس گوشے کے سنے دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں..... میں ساتھ دوں گی آپ کا.....“

”سوچ لو مسرت! تمہیں ان سب محبتوں سے دستبردار ہونا پڑے گا صرف میری محبت کے لیے.....“

”فرجاد! مجھے بے غرض محبت چاہئے..... منافقت نہیں۔ ان رشتوں کے نزدیک میری خوشی کی کوئی اہمیت نہیں اور جب ان کے نزدیک میری ذات کی کوئی حیثیت نہیں تو پھر میں ان رشتوں کو اپنی محبت اپنی خوشی کی بھینٹ کیوں دوں۔ کس کی خاطر زندگی کو اپنے لیے آزار بنالوں۔ ان لوگوں کی خاطر جنہوں نے میری محبت کو تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنایا۔“ مسرت جہاں جذباتی لہجے میں بولیں۔

”نہیک ہے مسرت..... میں دو دن بعد فون کروں گا، تم ان اڑتالیس گھنٹوں میں خوب سوچ لو ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں یہ محبتیں دلائیں۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکوں گا میں..... مجھے تمہاری خوشی عزیز تر ہے اور تمہارا ہر فیصلہ دل و جان سے قبول۔ اگر قدم روک لوگی تب بھی تمہیں مورد الزام نہیں ٹھہراؤں گا اور اگر ساتھ چل پڑوگی تو اس یقین کو تمہارے ہمراہ کر دوں گا کہ منزل پر پہنچ کر تمہیں کبھی اپنی مسافت کے رازیں جانے کا افسوس یا پچھتاوا نہ ہوگا۔“ فرجاد بے یقین لہجے میں بولا۔

”اور ہاں یہ بتاؤ کل کالج آرہی ہو.....“

”نہیں..... کالج آنے پر پابندی لگ گئی ہے۔ میں اپنے گھر کی دہلیز سے باہر پاؤں نہیں رکھ سکتی۔“ ان کی آنکھوں میں غمی حیرنے لگی۔

”وہی روایتی رشتے، وہی روایتی رویے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

”تم پریشان مت ہونا مسرت..... اپنا خیال رکھنا یہ سوچ کر کہ تم میری امانت ہو..... دو دن بعد فون پر بات کروں گا۔“

”ایک منٹ فرجاد! آپ کل کالج مت جائیے گا۔“ مسرت جہاں کو جیسے کچھ یاد آگیا۔

”کیوں.....؟“

”بھائی بہت غصے میں ہیں، آپ کے بچے نکلے تھے گھر سے مسلح ہو کر..... شکر ہے آپ پہلے سے نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ آپ کی تلاش میں کالج ضرور جائیں گے۔“

”تو پھر.....؟“

”تو پھر یہ کہاں اشتہال کی کیفیت میں آپ کا اور ان کا سامنا کچھ نہیک نہیں ہوگا۔“

”یعنی تمہارا خیال ہے کہ تمہارے وہ گمرو جوان بھائی مجھے قتل کر دیں گے۔“ فرجاد طنزیہ لہجے میں بولا۔

”مسرت جہاں اشتعال میرے اندر بھی ہے لیکن میں ہمیشہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہوں، میں کالج ضرور جاؤں گا، دیکھوں تو کسی کتنا دم ہے ان میں۔“

”نہیں فرجاد! ضد مت کریں آپ کو اپنی محبت کی قسم آپ کالج نہیں جائیں گے۔“ وہ جتنی انداز میں بولیں کہ جانتی تھیں نازک دھاگے کے دونوں سروں کو طاقت سے کھینچنے کا نتیجہ ہمیشہ دھاگے کا ٹوٹنا ہوتا ہے۔ نقصان بھائیوں کا ہوتا یا فرجاد کا اس کے لیے تو دونوں ہی کی اہمیت تھی۔ بے شک وہ ان سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھیں لیکن ان کی جان تو نہیں لینا چاہتی تھیں۔ وہ سب زندہ رہیں۔ بس وہ ان کے درمیان سے نکل کر اپنی الگ دنیا بسانا چاہتی تھیں۔

”مسرت! پہلے قدم پر ہی محبت کی بیڑیاں ڈال دیں تم نے میرے پیروں میں چلوٹھیک ہے نہیں جاؤں گا.....“ فرجاد نے مسرت جہاں کی بات مان لی۔ پھر چند منٹ باتیں کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔

یہ شخص انہیں اتنا عزیز ہو گیا تھا کہ انہوں نے دوری کا سوچ کر بھی انہیں زیادہ ملال نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اس کی باتوں سے اپنی مرضی کے معافی کشید کر کے وہ بہت پُر سکون اور مطمئن ہو گئی تھیں۔ دو دن بعد جب وہ دوبارہ انہیں فون کرے گا تو کس قدر خوش ہوگا جب وہ اسے یہ بتائیں گی کہ وہ اپنے گزشتہ فیصلے پر قائم ہیں۔ وہ اس کے گھر کی چاندنی بننے کو تیار ہیں۔ اور تصور میں خوشیوں سے بھر اس کا روشن چہرہ دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیں۔



آریان پنک سے واپسی کے بعد سے کچھ خاموش ہو گئی تھی۔ پہلے اسے یہ خدشہ رہتا تھا کہ اگر اصلیت کا پتا اس گھر کے مکینوں کو لگ گیا تو وہ اس کا وجود ایک پل کو بھی برداشت نہیں کریں گے لیکن اب اسے ایک مضبوط سپورٹ مل چکی تھی۔ فواد شاہ اس گھر کے معتبر ناموں میں سے ایک نام تھا۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے اور حیرت کی بات یہ کہ سب کچھ جاننے کے بعد ان کا رویہ اس کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ نرم ہو گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگے تھے لیکن اب اس کی سوچیں ہر لمحہ ایک خوف ایک ڈر کے زیر اثر رہنے لگی تھیں۔ ستارہ بیگم کے ہاتھوں کی پہنچ اس کی گردن تک ہو گئی تھی اور کسی بھی لمحے وہ دوبارہ ان پتھروں کے بیچ محبوس ہو سکتی تھی جن سے بچانے کی خاطر اس کی ماں اور ٹھنڈا بابا بٹے بہت تکلیف سہی تھی اور اب تک ہو رہے تھے۔ ”کیا فواد اسے ان لوگوں سے بچا سکتے ہیں بھئی ان کے گھر کے درود یوار اتنے مضبوط ہیں کہ وہ درندوں سے چھپ کر یہاں پناہ لے سکے؟ وہ خود سے کھو جاتی اور الجھتی رہتی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اس جگہ واپس جاتی جہاں سے وہ آئی تھی۔ ستارہ بیگم سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔ بڑے بڑے عہدیداروں، پولیس والوں کو اس نے ستارہ

بیگم کے چہنوں میں ماتھا ٹپکتے دیکھا تھا۔ اسے گرا آتا تھا مخالف ہواؤں کو اپنے حق میں کرینکا۔ اور اس بار جو زخم اسے آریان کے فرار نے لگا یا تھا وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح غیض و غضب میں ہوگی اس کی سوچیں بہک کر ماں پر جاگتی تھیں۔ لاکھ دامن بچانے کے باوجود کوئی نہ کوئی بات اسے اس کا ماضی یاد دلا دیتی تھی۔ وہ دوسرے بچوں پر مستالانی ماؤں کو دیکھ کر نگاہوں کا زاویہ بدل لیتی کہ مبادا اس کی حرام نصیبی کا سایہ ان پر نہ پڑ جائے۔

اس کی خاموشی اور اداسی دور کرنے کو ایقہ اور رویہ سوچتے کرتی رہتیں۔ وہ ان کے غلوں اور محبت کے زیر بار تھی اور ان کی تسلی کی خاطر ہنسی مسکراتی رہتی تھی لیکن دل کا خوف جوں کا توں تھا۔ گھر کے سب ہی لوگ کسی دعوت میں شریک تھے۔ آریان اصرار کے باوجود نہیں گئی تھی کہ گیدرنگز سے اس کا دل گھبراتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے اپنی شخصیت کے بارے میں یا اپنے ماضی کے متعلق کوئی احساس کمتری تھا۔ وہ باشعور لڑکی تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا ماضی جو بھی تھا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جس پر اسے شرمسار ہونا پڑتا لیکن بہت سارے لوگوں کے بچ جانا اسے پسند نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے یہ بھی لگتا تھا جیسے یہ لوگ تماش بین ہیں ایک دوسرے کے دکھوں، ایک دوسرے کے ڈھکے چھپے عیبوں کا اشتہار لگانے والے تماش بین۔

صابرہ اس کے لیے کھانا تیار کر کے اپنے کوارٹر میں چلی گئی تھی۔ مالی فضل اسے بڑھاپے میں بھی قابل رشک حد تک تندرست تھا اور چاک و چوبند اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ آریان لاؤنج میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ ایقہ کی باتیں یاد کر کے آپ ہی آپ مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ آئی۔ ایقہ اور رویہ کی دوستی نے کافی حد تک اس کے اندر کا کرب کم کر دیا تھا۔

”کس قدر حاضر جواب اور فریض لڑکی ہے۔۔۔۔۔۔ ہر وقت ہنسی مسکراتی۔ دوسروں کو ہنساتی۔“ وہ ایقہ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک فون کی تیل بجنے پر سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ یونہی فریض موڈ کے ساتھ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو۔“ سوچوں کا ہلکا سا خوشگوار شائبہ اس کے لہجے میں بھی در آیا تھا۔

”بہت چمک رہی ہو۔۔۔۔۔۔ لگتا ہے خوب دل لگ گیا ہے تمہارا۔“ کرشت طنزیہ آواز سن کر آریان جیسے سن ہو کر رہ گئی۔

”کک۔۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔۔؟“ بمشکل تمام اس کے حلق سے آواز نکلی۔ خوف کسی عفریت کی طرح اسے نگلنے کو بے چین ہونے لگا۔

”ارے رانی! ایسا بھی کیا انجان جنتا۔۔۔۔۔۔ نیا آشیانہ بن جائے تو پرانے ٹھکانے بھول جایا کرتے ہیں کیا۔“ لہجہ اب بھی طنزیہ اور کسی حد تک تمسخرانہ تھا۔

”تت۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ وہ خاموش ہو گئی۔

”بالکل ٹھیک پہچانا۔۔۔۔۔۔ ہم وہی ہیں جنہیں پچھلے دنوں دیکھ کر تم بازار سے چھپ کر بھاگ نکلی تھی۔ لیکن دیکھو ہمارے لیے ہاتھ۔۔۔۔۔۔ تمہارے یار کے گریبان تک پہنچ گئے۔ ویسے مرغا بڑا جگڑا پھانسا ہے تم نے۔۔۔۔۔۔ پر رانی جی! ہم بھی کچھ ایسے گئے گزرے نہیں آزا کر تو دیکھتی۔“

”تم۔۔۔۔۔۔ تم بکو اس بند کرو اپنی۔۔۔۔۔۔“

”واہ۔۔۔۔۔۔ تزی دینے لگ گئی ہو۔۔۔۔۔۔ ہاں بھی دیوار چین پر بیٹھ کر تو کو بھی خود کو عظیم سمجھتا ہے۔ تمہارے ارد گرد شرافت کی بڑی مضبوط دیواریں ہیں لیکن شاید تم جانتی نہیں ہو کہ یہی دیواریں بدنامی کا ہلکا سا دھکا بھی نہیں سہہ سکیں گی اور ریت کی دیواروں کی طرح ڈھے جائیں گی۔“

”دیکھو۔۔۔۔۔۔ تمہاری دشمنی مجھ سے ہے۔ ان لوگوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“ آریان رد بانسی ہو چلی تھی۔ خود کو جس قدر بھی مضبوط سمجھ لیتی تھی تو وہ ایک کمزور اور بے سہارا لڑکی۔ حالات کی کڑی تمنازت میں تنہا جھلسا اس کا مقدر تھا۔

”نہ نہ۔۔۔۔۔۔ رانی۔۔۔۔۔۔ رونا مت۔۔۔۔۔۔ ہمارے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ تم سے ہماری دشمنی کہاں ہے ارے ہم تو دل ہارے بیٹھے ہیں تم پر۔۔۔۔۔۔“ وہ کیننگی پر اتر آیا تھا۔ آریان جیسے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

”وہ ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔ بڑا بھلا سا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔۔ بڑی تریاں لگا رہا تھا ہمیں کہ خبردار جو آریان کا نام بھی تمہاری گندی زبانوں پر آیا۔ ایک تو یہ بہت بری بات ہے یہ شریف زادے غصے میں بڑی جلفی آجاتے ہیں۔ مجبوراً ہمیں اس پر ہاتھ اٹھانا پڑا۔ بہر حال اگر تم ہمارا ساتھ دو گی اور جس طرح ہم کہیں گے اسی طرح کرو گی تو تم اور تمہارے ارد گرد رہنے والے افراد کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔“

”اور۔۔۔۔۔۔ اور اگر میں ایسا نہ کروں تو۔۔۔۔۔۔؟“ آریان ہر قسم کے امکان پر غور کرتا چاہتی تھی۔

”تو۔۔۔۔۔۔“ دوسری جانب چند ٹانجے خاموشی رہی پھر وہ گویا ہوا۔ ”تو رانی جی! اس گھر کی چار دیواری میں آپ کے علاوہ دو اور محل بھی ہم نے چمکتے دیکھے ہیں۔ ستارہ بیگم کے کوٹھے پر انگوٹھی میں سنگ کی طرح فٹ ہو جائیں گے۔ ہمارا کیا ہے۔ تین تین کے دام کھرے کر لیں گے اور کیا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔ دیکھو تم ایسا مت کرنا ہم سیاہ نصیبوں کی نو قسمت میں ہی یہ زندگی لکھی ہے ان اچلے لوگوں کو میلی نظر سے بھی مت دیکھنا۔ ٹھیک ہے میں دو دن بعد تمہیں بتاؤں گی لیکن وعدہ کرو تم ایسا کچھ نہیں کرو گے جس سے ان لوگوں کی عزت پر کوئی حرف آئے۔“

”ارے رانی! بڑا پیار پال لیا چند دنوں میں۔۔۔۔۔۔ خیر میں تو تم چاہنے ہو ہر قیمت پر۔ تم ہماری مان لو۔۔۔۔۔۔ ہم تمہاری مان لیں گے۔“ دوسری طرف سے کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ آریان نے ریسیور کو کان سے ہٹا کر یوں گھورا جیسے سامنے وہی شخص کھڑا ہو۔ ہلکا سا کھٹکا ہوا تو وہ تیزی سے ریسیور کھینچ کر چلی۔

لاؤنج کے دروازے سے فواد اندر آرہے تھے۔ آریان کا دل دھک سے رہ گیا کہ کہیں خدا نخواستہ انہوں نے اس کی بات نہ سن لی ہو لیکن ان کے سپاٹ چہرے سے اسے کسی قسم کا اندازہ نہیں ہوا۔
 ”آریان..... آپ نہیں گئیں دعوت پر.....“ انہوں نے اپنے کمرے میں جانے کی بجائے لاؤنج میں ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ جو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں چٹکاتی مضطرب سی دکھائی دے رہی تھی۔ فواد نے بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔
 ”ابھی بہت معصوم ہوں..... اندر کے احساسات چھپانے نہیں آتے تمہیں..... پھر کیوں خود پر جبر کرتی ہو..... کھل کر بات کہہ کر مطمئن کیوں نہیں ہو جاتی۔“ فواد سوچ رہے تھے لیکن انہوں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

”وہ دراصل کس گیدرنگ مجھے پسند نہیں۔“ اس نے جیسے رٹا رٹا جملہ دھرا دیا۔
 ”ہوں.....“ ان کی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اندر ہی اندر جزبہ زور ہی تھی۔

”آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟“
 ”نہیں..... تو.....“ ان کے جملے پوچھنے پر وہ گھبرا گئی۔
 ”آریان! میرا خیال ہے گزشتہ چند دنوں میں کم سے کم ہمارے درمیان اتنی دوستی ضرور ہو چکی ہے کہ آپ اپنی پریشانی اپنی کوئی تکلیف بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکیں۔“
 ”جی..... جی.....“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”تو پھر وہ بات بتا دیجئے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ آپ کی اضطرابی کیفیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بات معمولی نہیں ہے۔“ فواد اسے دھیرے دھیرے اپنے ٹریک پر لا رہے تھے۔
 ”آپ..... آپ یوں ہی پریشان ہو رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس امی یاد آ جاتی ہیں۔“
 ”آریان! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اپنے چہرے کے تاثرات نہیں چھپا سکتیں۔ امی کے یاد آنے پر آپ اداس ہو سکتی ہیں پریشان اور خوف زدہ نہیں۔“
 ”یا امی..... یہ شخص کیا تاثرات کا پوسٹ مارٹم کرنے لگ جاتا ہے۔ آنکھیں ہیں یا ایکسرے مشین بندہ کچھ چھپا نہیں سکتا۔“ وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔
 ”ٹھیک ہے..... آپ نہیں بتانا چاہتیں تو آپ کی مرضی.....“ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔

”ایک منٹ ٹھہریے پلیز.....“ آریان کم سے کم ان جیسا ہمدرد کھونا نہیں چاہتی تھی۔
 ”ابھی ابھی ستارہ بیگم کے ایک آدمی کا فون آیا تھا..... وہ اب مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں کہ میں خاموشی کے ساتھ ان کا کہنا مان لوں اور اسی غلامت کی دلدل میں واپس چلی جاؤں۔ جہاں سے اپنا

آپ بچا کر اتنی اذیتیں کاٹ کر میں یہاں تک پہنچی ہوں۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔
 ”مثلاً کیا دھمکیاں دے رہے ہیں وہ.....“ فواد گہری سنجیدگی سے بولے۔
 ”وہ..... وہ اس گھر کے کینوں کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وہ لوگ بہت طاقتور ہیں بہت وسائل ہیں ان کے پاس۔“

”پھر..... آپ نے کیا سوچا؟“ فواد بھرپور توجہ سے اس کی بات سننے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کو بھی بغور دیکھ رہے تھے۔

”م..... میں..... میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا۔“ آریان یہ نہ کہہ سکی کہ اس نے ان کے ہمراہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے کہ اس خاندان کی عزت اور شرافت پر اس کی وجہ سے کوئی حرف آئے یہ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”آریان! ایک بات تو طے ہے کہ اب آپ وہاں نہیں جائیں گی۔ اس گھر میں آنے کے بعد آپ ہماری عزت ہیں اور ہم اتنی جرأت رکھتے ہیں کہ اپنی عزت کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے والے کو اس حال کو پہنچا سکیں کہ دوبارہ وہ کسی کی طرف دیکھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ سو یہ خوف اپنے ذہن سے نکال دیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ وہ بہت طاقتور ہیں اور اس گھر کے کینوں کو وہ کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچائیں گے..... تو یہ بات بھی میں آپ پر واضح کر دوں کہ وہ ایسا کر کے دیکھ لیں! انجام ان کے حق میں کس قدر بھیانک ثابت ہو سکتا ہے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔“ فواد کا ٹھہرا ہوا لہجہ اور مطمئن انداز کسی حد تک آریان کو بھی طمانیت بخش گیا اس کا خوف کہیں دور جا سوا۔

”آریان! اپنی سوچوں پر خوف کو مسلط نہ ہونے دیں۔ خوف انسان کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے اس کے اعتماد کو ختم کر دیتا ہے۔ اور میں آپ کی شخصیت کو اس کے تمام تر حسن سمیت دیکھنا چاہتا ہوں۔“ فواد جیسے لہجے میں کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور آریان ان کے کہے لفظوں پر غور کرنے لگی۔
 ”اس شخص کے حوالے سے خواب دیکھنا اب آنکھوں کو بہت اچھا لگنے لگا تھا۔“

وہ عامیانا اور فضول گفتگو نہیں کرتے تھے۔ لیکن چند لفظوں کا چناؤ بھی آریان کو بہت جامع محسوس ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا اس کے ارد گرد فواد کی محبت کا نادیہ لیکن اتنا مضبوط حصار تن چکا ہے کہ بیرونی حواث جسے چھو تو سکتے ہیں لیکن توڑ کر اس تک پہنچ نہیں سکتے۔ وہ اس کے لیے۔

کبھی نہ ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں

وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

کی کھل تفسیر بن چکے تھے اور آریان نے ان کی ذات میں رہنے کا فیصلہ دل سے کر لیا تھا۔



تھیں۔ دل میں اٹھتے ہزاروں سو سے اور وہم ان کی امیدوں کو توڑنے کی کوشش میں لگے رہتے لیکن وہیں کہیں موجود محبت کی سچائیاں اس ادھ موٹی امید کو پھر سے زندہ کر لیتیں۔ مسرت جہاں گھر سے بالکل لاتعلق ہو چکی تھیں اور شاید خود سے بھی۔ ان کا مطلع نظر صرف فرجاد کا انتظار تھا اور بس۔ فقط شینا بھابی گھر میں واحد سستی تھیں جو ان کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتیں۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتیں۔ لیکن عارب بھابی سے چھپ کر..... کیونکہ جب سے مسرت جہاں نے بھابیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرجاد سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس دن سے وہ عارب شاہ کے دل سے اتر گئی تھیں۔ اس لیے وہ خود ان کا ذکر کرنا یا سننا پسند کرتے تھے اور نہ ہی شینا بھابی کو اجازت تھی کہ مسرت جہاں سے ہم کلام ہوں لیکن وہ عارب شاہ کی عدم موجودگی میں مسرت جہاں کا خصوصی خیال رکھتی تھیں۔ شاید وہ اپنی فطری نیک دلی اور حساسیت سے مجبور تھیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ گھروالے سارے ہی مسرت جہاں کے خلاف تھے لیکن شینا بھابی کا خیال یہی تھا کہ مسرت جہاں کی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے ان کی خوشی کا خیال رکھنا گھر کے بڑوں کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ان کے خیال کو کس نے کیا اہمیت دینی تھی۔ بہر حال مسرت جہاں کے ساتھ گھر میں صرف شینا بھابی کا تھوڑا بہت رابطہ رہتا تھا۔ دسواں دن ڈھل گیا رات کی سیاہی نے آسمان پر چاروں اور اپنے پنکھ پھیلا لیے تھے مسرت جہاں بستر پر گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھی تھیں۔ بنا کبل لیے اتنی شدید سردی میں وہ یوں بیٹھی ہوئی تھیں جیسے ان پر موسم کی شدتیں اثر ہی نہ کر رہی ہوں۔ وہ ذہنی، قلبی، روحانی اور جسمانی ہر اعتبار سے توڑ پھوڑ کا شکار تھیں۔ انتظار کی انتہا ہو چکی تھی دل اور دماغ کی جنگ کے سچ وہ نڈھال ہونے لگے تھیں۔

”فرجاد..... بس دو قدم ساتھ چل کر تھک گئے..... اتنی ہی ہمت تھی آپ میں۔ ارے میں تو آپ کے ساتھ خارزاروں اور پتھر لیے راستوں کی ہم سفر بننے کو بھی تیار تھی پھر کیا سوچ کر آپ نے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ کیا سوچ کر مجھے یوں تنہا چھوڑ دیا۔ میں نے سب کی نظروں میں گر کر جینا گوارا کر لیا لیکن آپ سے دور ہو کر جینا..... نہیں..... مجھے ایسی زندگی نہیں چاہئے۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے ہم کلام تھیں۔ جب کمرے کی خاموش فضا میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ سوچوں کے خاروں میں الجھتے ہوئے ان کے حواس بالکل ہی نیم مردہ سے ہو چکے تھے۔ تیسری نیل پر انہوں نے طوعاً و کرہاً یسور اٹھالیا۔

”ہیلو.....“ اکتاہٹ آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔

”مسرت..... میں..... میں فرجاد.....“ دوسری طرف سے حیات آفریں آواز ان کی سماعت میں اتر کر جیسے ان کی روح کو زندہ کر گئی۔

”فر..... فرجاد..... آپ..... آپ بہت سنگدل ہیں..... اتنے دن آپ کو میرا خیال تک نہ آیا..... یہ

بھی نہ سوچا کہ میں کس قدر اذیت میں دن گزار رہی ہوں گی۔“ مسرت جہاں جیسے پھٹ پڑی۔

”مسرت..... آئی ایم ریلی سوری..... لیکن میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ چند دن لگ جائیں گے۔“

”لیکن ان چند دنوں میں اپنی خیریت بتانے کے لیے میرا حوالہ پوچھنے لیے آپ کم سے کم فون تو کر سکتے تھے۔“

ہاں یہ غلطی ضرور مجھ سے سرزد ہوئی۔ بہر حال اس وقت کیا کر رہی ہوں۔

”آپ کے فون کی ہی منتظر تھی..... فرجاد..... زندگی میں میں نے کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔ لیکن ان دس دنوں میں انتظار کے جب کرب سے میں گزری ہوں میں چاہوں بھی تو نہیں بیان کر سکتی۔“

مسرت جہاں بھیکے لہجے میں بولیں۔

”میں جانتا ہوں۔ انتظار کی اذیت کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ زندگی بھر انتظار ہی تو کیا ہے۔ خوشیوں کا، سکون کا، آسودگی کا اور..... اور تمہارا۔ لیکن اب یہ انتظار ختم ہو جائے گا۔ تم جب میری زندگی میں آ جاؤ گی ناں تو سب کچھ مل جائے گا مجھے، تمہارا ساتھ خوشیاں بھی، سکون اور آسودگی بھی۔“ فرجاد ترنگ میں بولتا چلا گیا۔ مسرت جہاں اس کے لفظوں کے زیر و بم میں الجھ کر اس سے مزید شکوہ نہ کر سکیں۔ ورنہ ان دس دنوں کی ساری کوفت سارا کرب اس پر اندر مل دیتیں۔

”فرجاد.....“ مسرت جہاں نے اسے پکارا۔

”ہوں.....“ وہ جیسے کسی سوچ میں گم تھا۔

”ہم یہاں سے کہاں جائیں گے۔“ عجیب بچوں جیسے اشتیاق بھرے لہجے میں انہوں نے پوچھا۔

”اتنی بڑی زمین پر، کہیں نہ کہیں تو ہو گا وہ گوشہ جہاں ہم نے اپنی دنیا بسائی ہے۔ اتنے دن تمہیں بے وجہ انتظار نہیں کروانا رہا میں..... اپنا فلیٹ بیچ کر میں نے دوسری جگہ ایک چھوٹا سا مکان خریدا ہے۔ اس کی خرید و فروخت اور سیٹنگ میں کچھ وقت لگ گیا۔ بنک اکاؤنٹ ٹرانسفر کروا دیا ہے۔ ظاہری بات ہے اتنا بڑا قدم اٹھا کر ہم اس شہر میں تو نہیں رہ سکیں گے۔ مجھے تمہارے بھائیوں کا تو کوئی خوف نہیں لیکن تمہارا خیال ہے..... اس لیے ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“ فرجاد نے دس دنوں کے دوران اپنی ساری مصروفیت کا جواز مسرت جہاں کے گوش گزار کیا۔ مسرت جہاں بھی کچھ مطمئن ہو گئیں۔

”اس وقت دس بج رہے ہیں ٹھیک ایک بجے میں تمہارے گھر کی عقبی دیوار کے قریب تمہارا انتظار کروں گا۔ بہت خیال اور دھیان سے محتاط ہو کر..... یہ سوچ لینا کہ اگر اس قدم کی بھٹک بھی کسی کو پڑ گئی تو پھر شاید ہم زندگی بھر نڈھال سکیں۔“ فرجاد نے کہا۔

”ٹھیک ہے..... میں ایک بجے پہنچ جاؤں گی۔“ مسرت جہاں نے کہا تو فرجاد نے فون بند کر دیا۔ یقیناً اسے تیاری میں کچھ وقت درکار ہو گا۔ مسرت جہاں بستر سے اٹھ گئیں۔ اپنے کمرے کا

دروازہ اندر سے بند کر کے پہلے انہوں نے انچ ہاتھ میں جا کر وضو کیا اور پھر کمرے میں جا کر جائے نماز بچالی۔ نوافل ادا کر کے اپنے پالنے والے سے ہم کلام ہو گئیں۔

”اے مالک... تو دلوں کے حال جانتا ہے... تیری اس دنیا میں ہماری کوئی حیثیت کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے ایک فیصلہ کیا جو یقیناً تیرا بھی فیصلہ ہے کہ سب جانتے ہیں تیرے حکم کے بغیر ایک پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ کجا انسان ایک سے دوسرا قدم اٹھائے۔ تو نے ہر انسان کو حق اور اختیار دیا ہے کہ اپنی مرضی سے جتنے جیسے چاہے۔ ہم اسی حق کو استعمال کر رہے ہیں پروردگار تو ہماری مدد فرما۔ اس نئی مسافت کو ہمارے لیے ہل کر دے۔“ دعا مانگ کر جب وہ انھیں تو ان کا ذہن پہلے سے نہ سکون تھا۔ پہلے اگر کوئی ملاں، کوئی خلش، کوئی دکھ تھا بھی تو اب اس کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مطمئن انداز میں وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگیں۔ چند زیورات اور پہننے کے کپڑے بعد ری نکال کر انہوں نے ایک بیک میں رکھے اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگیں لیکن جیسے گھڑی کی سوئیوں کو بھی علم ہو گیا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہیں۔ سو وہ بھی جیسے رک رک ہم کر چل رہی تھیں۔ سارے بارہ بجے مسرت جہاں نے اپنے دروازے سے باہر جھانکا۔ ابامیاں کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی باقی سادات گھر تقریباً اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دروازے سے نکلنے لگی تھیں جب ابامیاں کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آئے۔ مسرت جہاں نے دروازہ دھیرے سے بند کرتے ہوئے ہلکی سے جھری جھوڑ دی اور اس میں سے باہر جھانکنے لگیں۔ ابامیاں عجب بے چینی کے عالم میں گھن میں ٹہل رہے تھے۔

”یہ کیا...؟“ وہ دھک سے رہ گئی۔

”کہیں ابامیاں کو پتا تو نہیں چل گیا کہ میں کیا قدم اٹھانے لگی ہوں۔“ انہوں نے سوچا اور آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ گویا دوسروں کو باور کرانے کے لیے کہ وہ سوچ چکی ہیں۔ ابامیاں بدستور گھن میں ٹہل رہے تھے۔ مسرت جہاں مسلسل کھڑے رہنے کی وجہ سے تھک گئی تھیں۔ ٹانگیں اور پیچھے شل ہو گئے تھے لیکن خدا معلوم ابامیاں کو کیا بے سکونی، بے چینی اور اضطراب تھا جو وہ گھن میں ٹہلے جا رہے تھے۔ ایک بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ مسرت جہاں کی بے چینی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چادر اچھی طرح اپنے وجود کے گرد لپیٹ لی۔ حجاب سے چہرے کو چھپا لیا اور ایک ہاتھ میں بیک تھام لیا۔ ابامیاں بیرونی دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ مسرت جہاں پریشان ہوا انھیں لیکن یہی موقع تھا ان کے پاس۔ انہوں نے فرجاد سے کہا تھا کہ وہ چھت کی طرف سے آئیں گی۔ سو ابامیاں کے بیرونی دروازے سے نکلنے ہی وہ بیلی کی طرح بے آواز قدموں سے تیزی کے ساتھ برآمدے سے ہوتی ہوئی سڑھیوں کی طرف بھاگیں۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے سینہ پھاڑ کر باہر

آجائے گا۔ سادات گھر کے چاروں طرف بھرپور نگاہ دوڑاتے ہوئے وہ بہت تیزی سے سڑھیاں چڑھ گئیں۔ آخری سڑھی چڑھ کر دبے پاؤں تھوڑا آگے جا کر انہوں نے دھوکنی کی طرح چلتے سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ بیرونی دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی تو وہ چونک اٹھیں۔

”ایسا نہ ہو کہ ابامیاں میرے کمرے میں جھانکیں اور مجھے نہ پا کر گھر بھر کو میری تلاش میں سرگرداں کر دیں۔ پتا نہیں میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے آئی تھی یا جلدی میں کھلا ہی چھوڑ کر آگئی۔“ وہ خود سے ہم کلام تھیں۔ ایک طرف اپنوں کے جاگ جانے کا خوف اور دوسری طرف یہ خوف کہ پتا نہیں فرجاد آیا بھی ہوگا یا نہیں۔ انہوں نے بہت آرام سے قدم آگے بڑھائے اور حویلی کی پشتی سمت چھت کے آخری کنارے پر آ کر نیچے جھانکا۔ حویلی کی دیوار کے ساتھ کچھلی طرف ایک وسیع و عریض پلاٹ یونٹی بیکار پڑا ہوا تھا۔ مسرت جہاں کو وہاں نیم تاریکی میں ایک گاڑی اور اس کے ساتھ ٹیک لگائے باتوں میں مصروف دو انسانی بیولے دکھائی دیے۔ ایک پل کو وہ گھبرا کر پلٹیں۔ یقیناً رات کے اس پہر ان کی وہاں موجودگی بے سبب نہیں تھی۔ اور وہ کم سے کم ان کی نظروں میں نہیں آتا چاہتی تھیں لیکن اٹل کے پیچھے ہٹنے سے پہلے ہی ان میں سے ایک بیولا تیزی سے قدرے روشنی میں آیا۔ وہ فرجاد تھا انہوں نے قدرے سکون کا سانس لیا۔ فرجاد نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

”نیچے کیسے آؤ گی۔“ مسرت جہاں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ایک منٹ رکنے کو کہا۔ بیک کی زپ کھول کر ری نکالی۔ یہ وہی ری تھی جس سے انہوں نے اپنے گھر کے سب سے بڑے درخت کی ڈال پر جھولا ڈال رکھا تھا۔ جس جھولے پر سادوں میں وہ جھولتے ہوئے گیت گنگنا کر رہی تھیں۔ جوان کے خوابوں، ان کی سوچوں میں شراکت دار تھا۔ آج وہ آنگن بکھیاں، گڑیا بھی کچھ چھوڑ کر جا رہی تھیں تب بھی اس جھولنے نے اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ یہاں بھی ان کی خوشیوں کو حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے زپ بند کر کے بیک اوپر سے پھینک دیا جسے فرجاد نے کیچ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ فرجاد بہت غور سے ان کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا لیکن زیادہ بولنے سے گریز کر رہا تھا کہ کہیں اس کی آواز کسی اور کے کانوں میں نہ پہنچ جائے۔ یوں ری سے لٹک کر نیچے اترنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے مسرت جہاں کو کہا کہ وہ اچھی طرح ری کی مضبوطی کا یقین کر لینے کے بعد نیچے اتریں۔ مسرت جہاں نے ری کو اچھی طرح سمجھ کر جھٹکے دے کر اس کی پائیداری کا یقین کیا اور پھر کچھ جھٹکتے ہوئے انہوں نے مندر پر سے اپنے پیچھے لٹکائے۔ دونوں ہاتھوں سے ری کو مضبوطی سے تھام کر انہوں نے خود کو فضا میں چھوڑ دیا۔ ایک پل کو تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے ہاتھ ان کا بوجھ برداشت کر پائیں گے اور ری ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائیگی۔ ری ان کی نرم ہتھیلیوں پر بری طرح کھسک کر انہیں زخمی کر رہی تھی لیکن وہ اس وقت جس کیفیت سے گزر رہی تھیں۔ اس میں انہیں کسی چیز کا

احساس نہیں ہو رہا تھا۔ عجیب سا جمود طاری تھا۔ ذہن ہر سوچ سے خالی۔ بس فرجاد کو سامنے پا کر آنکھوں میں خوشی کی رقع جاگ رہی تھی۔ رسی زمین سے قدرے اونچی تھی اس لیے فرجاد نے ان کے دونوں بازو تھام کر انہیں نیچے اترنے میں مدد کی اور پھر تیزی سے ان کا ہاتھ تھام کر گاڑی کی طرف بڑھا۔

”چلو عامر“ پہلے سے گاڑی کے بیک ڈور کھلے ہوئے تھے فرجاد نے بیک انڈر پھینکا اور مسرت جہاں کے ہمراہ پچھلی نشستوں پر براجمان ہو گیا۔ عامر نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی بہت تیزی سے ٹرن لیا اور پھر ہر گز رتا لمحہ سادات نگر اور مسرت جہاں کے درمیان ان سٹ فاصلہ بڑھاتا چلا گیا۔ مسرت جہاں نے ایک محبت کی آسودگی کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا۔ سادات نگر کے دروازے اپنے لیے بند کر دیئے خود اپنے ہاتھوں خون کے رشتوں کی ہر ذرہ کو توڑ کر وہ ایک نئی دنیا، نیا جہان دریافت کرنے چل پڑیں۔ شاید ایک محبت کبھی کبھی بہت ساری محبتوں پر بھاری پڑ جاتی ہے۔ گاڑی اندھیرے میں گم ہو گئی تھی بالکل ایسے ہی جیسے شبیر حسین شاہ کی عزت۔



نئی لیے خنک ہوا سرسبز درختوں کے پتوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ لان میں لگائے گئے پھولوں کے پودے نت نئی خوشبوؤں کے حصار میں جھوم رہے تھے آسمان پر چھائے بادلوں نے یک دم موسم کو انتہائی حد تک دلکش بنا دیا تھا۔ یہ موسم ان سب کے لیے ایکساٹنگ ہوتا تھا۔ سو اس وقت بھی وہ سب لان میں جمع تھے۔ کچھ دنوں سے بڑی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن آج وہ بھی کچھ بہتر محسوس کر رہی تھیں۔ سو وہ بھی ان سب کے بیچ موجود تھیں۔ شاذان اور مہوش بند منٹن کھیل رہے تھے۔ طاہرہ انظہر۔ حسنین اور باصر الگ نیم بنائے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ روبیہ۔ انیقہ اور آریان بھی گھر کی خواتین کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ جب سے فواد نے آریان کو اپنے ساتھ کالیفین والیا تھا وہ پہلے کی نسبت کافی خود اعتماد نظر آنے لگی تھی۔ خوف بدرجہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اور اسے زندگی کا یہ نیا روپ اچھا لگ رہا تھا۔ یقیناً جو لوگ خوشیوں اور محبتوں کو ترسے ہوئے ہوتے ہیں ان کے لیے تھوڑا بھی بہت ہوتا ہے۔ محبت کے چند قطرے بھی آب حیات کا درجہ رکھتے ہیں۔

ماحول بہت خوشگوار تھا سب ہنس بول رہے تھے۔

”ویسے زاہدہ! اب تم فواد کی شادی کر رہی دو۔۔۔ گھر میں کچھ ہلاک ہو کوئی رونق ہو۔“ بھابی مقسوم نے خاموش بیٹھی زاہدہ چچی کو مخاطب کیا۔

”بس بھابی! بچوں کی مرضی اور پسند جہاں ہوگی وہاں کریں گے۔ فواد نے ابھی کسی لڑکی کے بارے میں مجھ سے بات نہیں کی۔“ زاہدہ چچی اس دن کے جھگڑے کے بعد سے بہت خاموش خاموش رہنے لگی تھیں۔ باہر بچا کے چہرے کی مایوسی اور دگرنگی کا مددوار وہ خود کو ٹھہراتی تھیں۔ اس لیے اب ان

لی فطری اکثر ضد اور اپرتی جیسے اپنی موت آپ مر گئی تھی۔ بہت نرم اور چمکدار رویہ ہو گیا تھا ان کا سب کے ساتھ اور تقریباً سب ہی گھر والوں نے نوٹ بھی کیا تھا یہ اور بات کہ انہیں جتنا نہیں۔ اور فواد، شاذان یا مہوش نے بھی ان سے کسی قسم کی بازید نہیں کی تھی۔ ان تینوں نے ماں باپ کے درمیان ہونے والے ساری گفتگو سنی تھی لیکن اس سلسلے میں وہ بالکل یوں انجان بن گئے تھے جیسے انہوں نے کچھ نہ سنا ہو۔ اور شاید بازید کرنے کا حق ان کے پاس تھا بھی نہیں۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا آج کل کے بچے کہاں ماں باپ کی پسند کو کچھ گردانتے ہیں۔“ تانی مقسوم بولیں۔

”تانی امی! کیا آپ کے زمانے میں بھی لوگ پسند سے شادیاں کرتے تھے۔“ انیقہ نے کہا۔

”ارے تو بہ کرو۔۔۔ پسند کی شادی۔ تو بہ تو بہ۔ ہمارے زمانے میں تو لوگ اپنی شادی کا تذکرہ تک اپنے منہ سے نہیں کرتے تھے۔ کہاں مرضی کی شادی۔۔۔ ماں باپ نے جس کھونٹے سے باندھ دیا، چپ چاپ سر جھکا کر بندھ گئے مجال ہے جو احتجاج کیا ہو۔ آج کل کی تو لڑکیاں ایسی منہ پھٹ ہیں کہ اپنی شادی کی بات بھی یوں کریں گی جیسے کسی عام سی تقریب میں شرکت کرنی ہو۔۔۔ نہ بھئی آج کل تو بہت ہی برے حالات ہیں۔“ تانی مقسوم مقصومیت سے کہہ رہی تھیں۔

”نہیں خیر بڑی بھابی! ایسی بھی بات نہیں۔ اس وقت بھی بڑے بڑے کھلاڑی پڑے تھے جو ماں باپ کی عزت کی پرواہ کیے بغیر اپنی مرضی اور پسند سے شادی کر کے خاندان کے منہ پر کالک ملنے کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔۔۔“ حدیقہ چچی کا زہر بلا لہجہ محفل میں موجود سبھی کے حلق کڑوے کر گیا تھا۔ اللہ جانے حدیقہ کو اس گھرانے کے لوگوں سے کیا ہیز کیا دشمنی تھی۔ وہ ان سب میں سے کسی کو بھی ہنستا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اگر ان کے اور اس گھرانے کے حراج اور پسند میں کوئی فرق تھا تو اس کا انتقام وہ سب سے کیوں لے رہی تھیں۔ ایک ان کی ذات کے لیے تو سب اپنا آپ اپنی گھریلو روایات بدلنے سے رہے۔ اگر انہیں اپنی اور دوسروں کی خوشی مقسوم ہوتی تو یقیناً وہ خود کو اس ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کرنیں لیکن انہوں نے نہ صرف خود کو اپنے میاں اور بچوں کو سب سے الگ کر لیا تھا۔ بلکہ موقع بے موقع طنز اور تحقیر کے نغضوں سے دوسروں کو زخمی کرنا بھی اپنا فرض سمجھ لیا۔ بڑی اماں کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک پل کو تار یک ہوا لیکن بچوں کی موجودگی میں وہ کسی قسم کا تاثر نہیں دینا چاہتی تھیں۔ اس لیے حدیقہ کی طرف سے انہوں نے اپنی توجہ ہٹا لی۔

”حدیقہ! کبھی کبھی دوسروں کا دل رکھ لینا دوسروں کی دل جوئی کرنا آپ کی ذات کو دوسروں کی نگاہ میں معتبر کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے تم سمجھ گئی ہوگی۔“ ہینا پھو کے سر دلچھ میں پہلی بار حدیقہ چچی کے لیے ایک حبیہ تھی۔ حدیقہ چچی ہونہ کہہ کر دوسری طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایسا کر کے وہ صرف اپنے لیے

نفرت کاشت کر رہی تھیں۔ آج جو پوری تھیں کل وہی کاٹنا بھی تھا۔ سو کسی نے زیادہ توجہ نہ دی۔ ایقہ چائے کے برتن اٹھا کر اندر جانے لگی تو آریان بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ حدیقہ چچی کی حقارت اور تفاخر بھری نگاہیں اسے اپنے وجود کے آ رہا ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس لیے وہ بھی ایقہ کے ہمراہ اپنے پورٹن میں آگئی۔ نیلی فون کی تیل پہلے ایقہ نے ہی سنی تھی۔ برتن کچن میں رکھ کر اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف کی بات سن کر اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا اور بولی رہی آپنی۔ آپ کا فون..... کمرے کی طرف جاتی آریان کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ وہ بمشکل پلٹی۔

”میرا فون“

”جی شاید سکول سے ہو..... میرا خیال ہے آپ نے اپنا ٹیکسٹ نہیں بھیجی ہوگی تو سر چھٹی کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے۔“ ریسیور ہاتھ میں دیتے ہوئے قیاس آرائی کرنے کے بعد ایقہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آریان نے ریسیور کان سے لگا لیا۔

”ہیلو.....“ وہ مری مری آواز میں بولی۔ حقیقتاً اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی طرح یہیں کھڑے کھڑے غائب ہو جائے۔ تاکہ اسے تکلیف پہنچانے والے، اس کے نقصان کے درپے ظالم لوگ ہاتھ ملتے رہ جائیں لیکن یہ ناممکن تھا۔

”ہمارا خیال ہے رانی جی! تین دن سوچنے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ اور جہاں معاملہ ماں کی زندگی کا آجائے..... اپنی زندگی اور دوسرے محبت کرنے والوں کی عزت کا۔ میرا خیال ہے وہاں فیصلہ کرنے میں زیادہ تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔“

”تم لوگ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے..... آخر کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔ کیوں زندگی کو میرے لیے ایک ناروا بوجھ بنانے پر تل گئے ہو.....“ اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

”کیسے چھوڑ دیں تمہارا پیچھا..... ارے بڑا روپیہ لگایا ہے ہم نے تم پر..... وہ ستارہ بیگم..... وہ کسی طرح بھی تم سے دستبردار نہیں ہوگی۔“

”کتنا پیسہ لگایا ہے اس بدکار عورت نے..... میں سارا ادا کر دوں گی۔ پائی پائی واپس کر دوں گی لیکن خدا را میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ آریان سسک رہی تھی۔

”کہاں سے لاؤ گی اتنا پیسہ..... اے ہاں یاد آیا..... اپنے راجہ سے کہو گی ناں کہ تمہاری قیمت چکا دے..... تمہیں ہم سے خریدے..... لیکن رانی ہمارے بھی تو کچھ اصول ہیں..... تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ستارہ بیگم اپنی دسترس میں آئی چڑیا کو اتنی آسانی سے نہیں نکلے دیتی۔ اس لیے اب فیصلہ کر کے بتا دو کہ کیا کرتا ہے۔“

”جب میں ایک بار کہہ چکی ہوں کہ قیمت چکا دوں گی اپنی..... پھر..... پھر بھی نہیں چھوڑ دوں گے“

میرا پیچھا۔“

”بتایا ناں کہ جو چیز ہماری ملکیت میں ہو وہ ہم کسی کو نہیں دیتے۔ بے کار ہونے پر توڑ سکتے ہیں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے جو تمہارے دل میں آئے کرو۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ خواہ موت کو گلے لگانا پڑے لیکن گندگی کے اس ڈھیر میں دوبارہ واپس نہیں جاؤں گی۔“

”ارے رانی! کیسی باتیں کرتی ہو..... سونے کے جھروکوں کو گندگی کا ڈھیر کہہ رہی ہو۔“

”ارمانوں کے خون میں نہائے سونے کے جھروکے تمہیں مبارک ہوں۔ میری جان چھوڑو..... یہ ذہن میں رکھ لو کہ میں اب تنہا نہیں ہوں..... میرے ساتھ زبردستی تمہیں مٹائی پر سکتی ہے۔“

آریان کے لہجے میں فواد کی ہمراہی کا عہد غرور بن کر سایا ہوا تھا۔

”ہم سمجھ گئے..... یہ کبھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں..... کوئی بات نہیں رانی جی..... شاید تم بھول گئیں کہ ستارہ بیگم جب کبھی نکالنے کے لیے انگلیاں نیڑھی کر لے تو پھر بہت کچھ تہہ وہ بالا ہو جاتا ہے..... اور ہم انگلیاں نیڑھی نہیں کرتے پورا ہاتھ کھلی میں ڈال دیتے ہیں..... تم نے جو کہنا تھا کہہ ڈالا..... اب جو کرنا ہے ہمیں کرنا ہے..... افسوس تمہیں اپنا تو کیا احساس ہونا ہے اپنی ماں اور اپنے ارد گرد بکھرے لوگوں کی عزتیں اور جانیں بھی اپنی ضد کے عوض داؤ پر لگا دیں تم نے.....“ دوسری جانب سے نیلی فون بند کر دیا گیا۔ اس نے بھی بے جان ہاتھوں سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور وہیں قریب پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ پتہ نہیں اس کے نصیب کی یہ سیاسی کب دھلے گی۔ اس کی سوچیں اذیت سے کر لانے لگی تھیں۔ دردینے میں پھیلتا جا رہا تھا۔

”کیا کہیں کوئی جائے آساں نہیں..... کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں وہ اپنی حرمت سمیت زندگی کے سانس پوری کر سکے.....“ اس کی ماں..... اذیتوں کا سفر کانٹے کاٹتے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ہر جرحہ پکی تھی وہ..... لیکن غلاظت کی بے حس دلدل میں وہ گری ہوئی تھی اس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا تھا۔ آریان کو خود سے دور رکھ کر پل پل اس کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی یہ سوچ کر اس کا تڑپنا اذیت سہنا اور آریان کو اپنی ممتا سے محروم کر دینا اس سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ وہ اس کو ٹھکے کے گندے ماحول میں چلتی..... دن رات اس کی سماعت میں تھنکھروں اور طبلوں کی صدائیں گونجتی اور ایک دن وہ نوخیز پھول حالات کے سنگلاخ ہاتھوں میں آکر پتی پتی ہو کر نکھر جاتا۔ اسے اپنی بیٹی کا بکھرتا منظور نہ تھا لیکن اس کی یہ ساری ریاضتیں، ساری کوششیں رائیگاں ثابت ہوئی تھیں۔ اس کی اذیتیں تکلیفیں بے کار گئیں۔ ستارہ بیگم کی شاطر نظروں کی گرفت آریان پر پڑی تو جیسے وہ کھل ہی اٹھی تھی۔ اس کے کوٹھے پر حسین ترین اور چاند جیسا روشن چہرہ اپنی چھب دکھاتا تو بڑی بڑی نایکائیں ہاتھ ملتی رہ جاتیں۔ ستارہ بیگم نے خفیہ طور پر آریان کو ہوشل سے یوں غائب کر دیا کہ خود اسے بھی پتا نہ چل سکا۔ جب اس نے اپنی ماں کے بے

بس چہرے اور ہتھکڑیاں کی نظر کی لکیروں سے لبریز پیشانی دیکھی تو بہت کچھ سمجھ گئی۔ ستارہ بیگم کا داؤ چل گیا تھا۔ اس کی ماں کی محنت اور کوشش بھی اسے نہ بچا پائی تھی لیکن آریان کوئی ترنوالہ نہیں تھی جسے آسانی سے ہضم کر لیا جاتا۔ وہ کسی بڑی کی طرح ستارہ بیگم کے حلق میں اٹک گئی تھی۔ مجبور ہو کر ستارہ بیگم نے خفیہ طور پر اس کا سودا کر دیا۔ ہتھکڑیاں کو اس کی بھٹک پڑ چکی تھی۔ سو وہیں سے فرار کا منصوبہ بنایا گیا اور آریان ان لوگوں کے چنگل میں پھنسنے سے پہلے ہی بھاگ نکلی تھی۔ اور اب... اب وہی لوگ دوبارہ مسلسل اذیت کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ ایقہ کسی کام سے اپنے کمرے سے نکلی تو آریان کو یوں بے حس و حرکت مینھا دیکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

”کیا بات ہے رینی آپنی... آپ کیوں اس قدر پریشان دکھائی دے رہی ہیں...“ اس نے آریان کو مخاطب کیا۔

”نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں...“ آریان اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کا کمال نہیں رکھتی لیکن پھر بھی وہ اسے کیا بتاتی اس کا خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

”تم دونوں یہاں اس طرح کیوں بیٹھی ہوئی ہو جیسے کسی کا انتظار ہو...“ کوریڈور میں داخل ہوتے ہی روبیہ کو وہ دونوں گفت و شنید کرتی دکھائی دیں۔

”انتظار کس کا کرتا ہے... آریان آپنی پریشان ہیں لیکن بتاتی ہی نہیں ہیں کہ کیا وجہ ہے؟“ ایقہ نے کہا تو روبیہ نے بھی بغور آریان کی طرف دیکھا۔

”ہاں پریشان تو یہ واقعی لگ رہی ہے... سو آریان بغیر کے شروع ہو جاؤ... اگر تم اپنی پریشانی ہمیں نہیں بتاؤ گی تو ہم بھی سمجھیں گی کہ ہماری اتنی محبت کے باوجود تم ہمیں اب تک اپنا نہیں سمجھیں۔“

”نہیں ایسا مت سوچو... میں سچ کہتی ہوں کہ تم دونوں نے بہن کی کمی پوری کی ہے میرے لیے... مجھے جیسی کم مایہ لڑکی اتنی محبت اتنے خلوص کی کہاں حق دار تھی...“

”تم کس لائق ہو... یہ دوسروں پر چھوڑو۔ اس وقت اپنی پریشانی بتاؤ ہمیں...“

”کیا کرو گی سن کر... میں جو ہوں جیسی ہوں اس پر پردہ ہی پڑا رہے دو۔ میں تم دونوں کی محبت اور اس گھر کے سائے سے محروم نہیں ہونا چاہتی... میں جانتی ہوں جب تم دونوں سب کچھ جان لو گی تو نفرت سے منہ پھیر لو گی... اور محبت بھرے چہروں پر اپنے لیے نفرت مجھ سے برداشت نہ ہو پائے گی۔“

”رینی... خود سے نتیجہ اخذ کرتی رہتی ہو تم... افسوس صد افسوس کہ تم ہمیں سمجھ نہ سکیں۔“ روبیہ کے لہجے میں ملال تھا۔ آریان خاموش بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

”اب بول بھی چکو... کیوں ہمارے صبر کا امتحان لینے پر تکی ہوئی ہو...“ روبیہ محبت بھری ناراضگی سے بولی۔ آریان نے سوچا کہ میں تو کمال سب کچھ اٹھان کو پتا چل ہی جاتا ہے۔ نتیجہ تب بھی وہی

نکلے گا جواب نکلتا ہے۔ وہ محبت کو آزمایا جانتی تھی کہ اگر ان کے رویے بدل بھی گئے تو کم سے کم ان سب کو چھوڑتے ہوئے اسے بہت زیادہ اذیت تو نہیں ہوگی۔ اس نے اپنی داستان حیات کا ورق ورق ان دونوں کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ ہر وہ اذیت جو اکیلے اس نے یا اس کی ماں نے سہی تھی۔ لفظوں میں ڈھال کر بیان کر دی۔ آنکھوں سے اشک برستے لگے تھے۔ لفظ بے ربط ہو کر ٹوٹ ٹوٹ کر ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے اور روبیہ، ایقہ ساکت بیٹھی درو کی یہ داستان سن رہی تھیں۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے سر اٹھا کر روبیہ اور ایقہ کے چہروں کے تاثرات دیکھے... وہاں کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ نہ حقارت، نہ حقیقت چھپانے پر کوئی غصہ۔ ان کی آنکھیں اس کے چہرے پر تکی ہوئی تھیں لیکن ہر سوچ انداز میں۔ آریان ان کے یوں یک ٹک دیکھنے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ دل میں چور ہو تو انسان خواہ مخواہ بات بے بات نتیجہ اخذ کرنے لگتا ہے۔ ندامت محسوس کرتا ہے یا خود کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور آریان کا بھی اس وقت یہی حال تھا۔

”رینی... جن سے محبت کی جاتی ہے ناں انہیں اپنے درد کا بھی شریک بنایا جاتا ہے۔ جب انسان نے تنہا ہی اذیتوں کا سفر طے کرنا ہو تو پھر یہ محبتیں، یہ رفاقتیں محض بہلاوہ ہوتی ہیں۔ ایک بہانہ، صرف بے نام رشتہ...“ روبیہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”آپنی! اتنے دن ہمارے درمیان رہ کر بھی آپ نہ جان سکیں کہ ہم نے آپ سے جیسی ہیں جو ہیں ہمیں قبول ہیں کی بنیاد پر دوستی کا رشتہ اپنایا ہے۔ آپ کا ماضی کیا تھا؟ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ اس لیے کہ ہم اچھی طرح جان چکے ہیں کہ آپ بے قصور بے خطا تھیں۔ ہمیں آج کی آریان آپنی سے پیار ہے۔ اتنا کہ ہم انہیں اپنی ذات کا ایک حصہ سمجھنے لگے ہیں۔ اور جہاں تک نفرت کی بات ہے تو میری پیاری آپنی... نفرت تو ہم نے قابل نفرت لوگوں سے کبھی نہیں کی... آپ... آپ تو پاکیزہ ہیں، معطر ہیں کسی پھول کی طرح... آپ کو تو خدا نے بنایا ہی محبت کے لیے ہے۔ پھر ہم سب آپ سے نفرت کیوں کریں۔“ ایقہ کا ایک ایک لفظ امرت بن کر آریان کے دھکے دل کو بھگور رہا تھا۔ اس نے نم آلود آنکھوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”یہ ذہن سے نکال دو رینی! کہ ہم تمہیں جانے دیں گے۔ تم حالات کی تیز دھوپ میں مجلس جاؤ۔ ہم کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔“ روبیہ نے کہا تو اس کے لہجے میں آریان کے لیے فکر اور محبت رہی ہوئی تھی۔

”لیکن روبی! وہ تم دونوں کا نام لیتے ہیں کہ اگر میں ان کے ساتھ نہ گئی تو وہ خدا نخواستہ تم دونوں میں سے... مجھے جانا ہو گا اس لیے کہ اپنی ذات کو بچا کر میں تم دونوں کو اذیت کے الاؤ میں نہیں پھینک سکتی۔“ آریان دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”رینی آپنی! نہ تو آپ کہیں جائیں گی اور نہ ہی ہمیں کوئی نقصان پہنچ سکتا...“

جانتے نہیں کہ سادات عمر کے ہاں ابھی اتنے کھوکھلے نہیں ہوئے کہ کوئی ایراغیرایوں منہ اٹھا کر چلا آئے عزتوں کا سودا کرنے..... "ایقہ زندگی میں پہلی بار اتنی سنجیدہ ہوئی تھی۔ روبیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا یہ تم ہی ہوگی....." وہ شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ماحول پر طاری کشیدگی کو بھی تو کسی طرح کم کرنا تھا۔

"کیوں..... کیا سینک نکل آئے ہیں میرے جو پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔"

"نہیں خیر تم بغیر سینکوں کے بھی کم خوبصورت نہیں....."

"ایسا! پلیز اس وقت میں خطرناک حد تک سنجیدہ ہوں۔ زندگی میں پہلی بار....."

"اور شاید آخری بار بھی....." روبیہ نے لقمہ دیا لیکن ایقہ نے سنی ان سنی کر دی۔

"معاملہ کم سنگین نہیں ہے..... ہمیں بہت سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل سوچنا ہے کہ آریان آپلی پر

کوئی حرف نہ آئے..... گھر کے بڑوں کو بھی خبر کرنی پڑے گی تاکہ کسی بھی پیش آنے والی مشکل میں ہمیں

مکمل سپورٹ دستیاب ہو..... میرا خیال ہے سب سے پہلے فہدی بھائی سے بات کی جائے....."

"ہاں ان سے بات کی جائے..... تاکہ ایک بار پھر آریان کو گھر بھر کے سامنے ذلیل کرتے

پھر رہیں۔" روبیہ کو فواد کے اس دن والے رویے پر بہت غصہ تھا۔ حالانکہ آریان نے اس دن کے بارے

میں بھی پوری تفصیل سے انہیں آگاہ کیا تھا کہ غلطی فواد کی نہیں تھی۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا۔ ایسے انکشاف

کے بعد اس کا رویہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

"نہیں روبی! اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اب وہ سب کچھ جان چکے ہیں۔" آریان نے

ڈھکے چپے لفظوں میں فواد کی حمایت کی۔

"تو بس پھر ٹھیک ہے..... فہدی بھائی اور شانی بھائی کو ساتھ ملا لیتے ہیں۔" ایقہ نے کہا۔

"اور مبوش.....؟" روبیہ نے پوچھا۔

"رہنے دو اس مغرور حسینہ کو..... بچے چاری کی ناک کے نیچے ہی نہیں آتا کوئی۔" ایقہ جیسے اس

سے سخت خار کھائے بیٹھی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے رات کو فہدی بھائی کے ساتھ ڈسکس کریں گے۔" ایقہ اور روبیہ اس کے لیے کس

قدر فکر مند تھیں۔ جس کے چاہنے والے اس قدر فکر مند اور حساس ہوں اسے بھلا کیا خوف..... آریان کو

ان کا اپنے لیے یوں متشکر اور پریشان ہونا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بہر حال ان کو اپنا جواز بتا کر اس کی

پریشانی تھوڑی کم ہو گئی تھی۔ طبیعت بھی قدرے بحال ہو گئی۔ ہینا پھپھو کے آجانے پر گفتگو کا موضوع

بدل گیا۔ اور جب عشاء کی اذان سے کچھ پہلے ڈاکٹر فواد کلینک سے واپس آئے تو ایقہ نے ان سے تھوڑا

سادقت مانگا۔

"کیا بات ہے بہت قارل اور سنجیدہ ہو رہی ہو....." انہیں اس کا سنجیدہ ہونا مکمل رہا تھا۔

"حالات اور ماحول پر ڈچینڈ کرتا ہے برادر..... بہر حال آپ کھانا دانا کھالیں..... کچھ دیر بعد ہم

آپ کو شرف ملاقات بخشیں گے۔" آخری جملے میں شرارت کی آمیزش تھی۔

"تم کبھی سدھر سکو گی مجھے ناممکن ہی لگتا ہے۔" فواد مسکراتے ہوئے اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئے۔

رات کو میٹنگ کے شرکاء جن میں فواد، شاذان، ایقہ، روبیہ اور آریان شامل تھے فواد کے کمرے

میں موجود تھے۔

"ہاں بتاؤ..... کیا مسئلہ ہے۔" فواد بیڈ پر بیٹھ کر سر ہانہ گود میں رکھتے ہوئے بولے۔

"جناب عالی..... مسئلہ سنگین ہے بھی اور نہیں بھی۔ بہر حال مسئلہ آریان آپلی سے متعلق ہے۔"

ایقہ نے بات شروع کی۔

"کیا مطلب.....؟" فواد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔

"مطلب یہ کہ جو لوگ آپ کے کلینک میں آئے تھے..... جھگڑا اور توڑ پھوڑ کی تھی انہوں نے۔

وہ لوگ اب آریان آپلی کو پریشان کر رہے ہیں۔" ایقہ نے مختصر الفاظ میں کہا۔ فواد جان گئے کہ آریان

نے ایقہ اور روبیہ کو اپنا ہمارا بنالیا ہے البتہ شاذان منہ کھولے ہونٹوں کی طرح دیکھ رہا تھا اس کی سمجھ میں

کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"کیا مطلب! کون لوگ ہیں وہ....."

"دیکھو شانی! تم اپنی چھوٹی سی عقل دانی پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو....." ایقہ نے شاذان سے کہا جو

متحس نظر روں سے آریان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لیکن یہ سب آپ خود بھی تو مجھے بتا سکتی تھیں آریان! آپ نے اتنے دن مجھ سے اس مسئلے

پر کوئی بات نہیں کی تو میں سمجھا شاید وہ خود ہی پیچھے ہٹ گئے۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں بہت جلد اس کا

کوئی حل نکال لیں گے۔" فواد کے لہجے میں چھپی پس پردہ شکایت آریان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ لیکن اس نے

زیادہ غور نہیں کیا۔ اس وقت ان سب کی ہمدردیاں توجہ اور ساتھ ہی اس کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔

"برادر عزیز! اسی حل کو تلاش ہے اسی لیے ہم یہاں آئے بیٹھے ہیں۔" ایقہ نے کہا۔

"میرے خیال میں ہمیں ہینا پھپھو سے تفصیلی بات کر لینی چاہئے۔ وہ ہمیں بہتر گائیڈ کر سکتی ہیں۔"

"لیکن کیا وہ ناراض نہیں ہوں گی....." آریان کے لہجے میں خدشہ کا تاثر تھا۔

"نہیں آریان! ہینا پھپھو ایک لبرل سوچ کی مالک بہت سلجھی ہوئی خاتون ہیں تم دیکھنا وہ

ہمارے لیے اس مسئلے میں کتنی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اور ایقہ میں پہلے ہینا پھپھو سے بات کروں گا۔

مجھے یقین ہے کہ کوئی بہتر راستہ نکل آئے گا۔“

”کیا مطلب ہے کیا ابھی بات کرنے جا رہے ہیں۔“ انیڈ نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں اس میں کیا ہرج ہے؟“ وہ استفہامیہ انداز میں بولے۔

”نہیں ہرج تو کوئی نہیں۔۔۔۔۔ بہر حال جیسے آپ کی مرضی۔۔۔۔۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے اس مسئلے کو حل ہو جانا چاہئے۔ تاخیر کسی صورت بہتر نہیں ہے۔ بہر حال میں جا رہا ہوں پھپھو کے پاس۔ تم لوگ یہیں رک کر میرا انتظار کرو۔“ فواد کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

”لوا کیلے ہی جیمز بانڈ 007 بننے کا شوق چرایا انہیں۔“ انیڈ کو قلعی ہو رہا تھا کہ فواد انہیں چھوڑ کر خود آریان کے سب سے بڑے خیر خواہ بن کر ماما کے پاس چلے گئے تھے۔ بہر حال اب صبر اور انتظار کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ برا سامنہ بنا کر بینڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ جبکہ آریان خاموش بیٹھی اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ بقول روہیہ کے بہت روشن پیشانی تھی اس کی اور بہت فریش لکیریں تھیں اس کے ہاتھ میں۔ لیکن مقدر میں روشنی کہیں نہیں تھی بس اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ مقدر کی کٹنی ایک زخمی مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر ثبت ہو گئی۔

ادھر فواد ذہن میں لفظ ترتیب دیتے ہوئے ہینا پھپھو کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ سامنے بینڈ پر نیم دراز کوئی ڈائجسٹ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ برسوں سے ان کی یہ مطالعے والی عادت آج تک نہ چھوٹی تھی۔

”پھپھو آ جاؤں۔۔۔۔۔؟“ وہ دروازے میں ہی رک کر اجازت طلب کرنے لگے۔

”آ جاؤ۔۔۔۔۔ وہ سیدھی ہو بیٹھیں۔“

”کیا ہو رہا تھا؟“ انہوں نے یونہی برسیل تذکرہ پوچھا۔

”روز کی روٹین پوری کر رہی تھی۔ ایسی عادت پڑی ہوئی ہے کہ رات کو کچھ پڑھ نہ لوں نیند نہیں آتی۔۔۔۔۔“

”پھپھو یہی تو آپ کی ڈیسنسٹی ہے۔ حقیقتاً اس مطالعے ہی کے باعث گھر میں سب سے لبرل ہیں آپ۔۔۔۔۔“ وہ عقیدت سے بولے۔

”خیر تو ہے بڑا کھن لگا جا رہا ہے۔“ پھپھو کو اپنا یہ ہونہار جھتکا بہت پیارا تھا۔

”نہیں پھپھو میں سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔ بہر حال اس وقت تو میں بہت اہم موضوع پر بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ کو کوئی مصروفیت تو نہیں یا نیند تو نہیں آرہی۔۔۔۔۔“

”نیند اور مصروفیت تم سے زیادہ اہم تو نہیں۔۔۔۔۔ تم بات کرو میں سن رہی ہوں۔“ انہوں نے فواد

کے کہے کو بہت اہمیت دی۔ جس سے ان کو کافی حوصلہ ہوا۔

”پہلی بات تو یہ کہ آپ خود کو بالکل غیر جانبدار فریق کے طور پر رکھیں گی۔ دوسرے سادات نگر کی روایات و اقدار اور یہاں کے کینوں کی سوچ سے ذرا ہٹ کر اس معاملے کو پرکھیں گی۔“ فواد انہیں ہموار کرتے ہوئے بولے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم بات کرو۔۔۔۔۔ زیادہ سسپنس کری ایٹ مت کرو۔“

”پھپھو موضوع آریان کی ذات اور اس کا ماضی ہے۔ جس سے کچھ دن پہلے مجھے آگاہی ہوئی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی ساری تفصیل بتا کر اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے جواب درپیش ہے۔“ فواد کے منہ سے یہ بات سن کر پھپھو سیدھی ہو بیٹھیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

”آریان کے ماضی کے متعلق۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔“

”پھپھو۔۔۔۔۔ آپ کو یاد ہوگا چند دن پہلے شام کے وقت آپ سب لان میں موجود تھے۔ جب میں آریان کے ساتھ بہت غیر مہذب انداز میں پیش آیا تھا۔ یقیناً آپ سب کو ہی بہت ناگوار گزارا ہوگا۔ یاد ہے ناں پھپھو! جب میں اسے تھپیٹ کر کمرے میں لے گیا تھا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ آگے بولو۔۔۔۔۔“

”اس دن میرا اپنے دوستوں سے جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ دو اجنبی میرے کلینک پر آئے تھے غنڈہ ٹاپ شخص تھے اور انہوں نے مجھے آکر بتایا کہ آریان ان کی ملکیت ہے اور اسے خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان کا آریان سے کیا تعلق ہے تو ان بد معاشوں نے بتایا کہ آریان ایک طوائف زادی ہے اور کوٹھے سے بھاگی ہوئی ہے۔“ ایک پل کو روک کر انہوں نے ہینا پھپھو کے تاثرات دیکھے۔ وہ بہت دل جمعی سے ان کی بات سن رہی تھیں۔ پھر انہوں نے الف سے لے کر ی تک ساری تفصیل بتادی۔ آریان سے ہونے والی گفتگو کا حرف حرف کہہ ڈالا۔

”اب بتائیں پھپھو! کیا اسے گھر میں رکھنا چاہئے۔ یاد رکھو دے کر گھر سے باہر نکال دینا چاہئے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو فواد۔۔۔۔۔ احمقانہ باتیں مت کرو۔۔۔۔۔ وہ تو پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ اس کی دل جوئی کرنے اور اس کے زخموں پر مرہم لگانے کی بجائے اسے مزید چرے کے لگانے کی بات کرتے ہو۔۔۔۔۔ وہ جو بھی تھی وہ اس کا ماضی تھا جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اگر وہ اپنی مرضی سے اس گندگی میں رہنا پسند کرتی تو وہاں سے بھاگتی ہی کیوں۔ اب جبکہ وہ سادات نگر میں ہے اس کی جان اور اس کی عزت کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے سمجھئے۔“ ہینا پھپھو کے لہجے میں آریان کے لیے تردد سمٹ آیا۔ فواد کو اس پل اپنی پھپھو بہت پیاری لگیں حساس اور مثبت انداز فکر رکھنے والی۔

”بس یہی چاہتا تھا میں۔۔۔۔۔ اس کی مجبوری کو سمجھا جائے۔ اس وقت وہ اکیلی ہے تنہا ہے اس کا

ساتھ دینے والی اس کی ماں اس وقت ان غلاموں کے چنگل میں ہے سو ہمارا فرض ہے کہ اس کی مدد کریں۔“
 بالکل۔ لیکن یہ کوئی مسئلہ تو نہیں۔ تم وہ مسئلہ بیان کرو جو اب درپیش ہے۔“

”اصل میں وہ لوگ آریان کا چچا کرتے ہوئے سادات گمر کی دہلیز تک پہنچ چکے ہیں۔ مجھ سے بات کرنے کے بعد وہ رکے نہیں بلکہ انہوں نے درپردہ آریان پر پاؤ ڈالنے کے لیے ٹیلی فونک رابطہ رکھا۔ بار بار اسے فون کر کے پریشان کر رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلو ورنہ سادات گمر کی کسی بہو یا بیٹی کو ہم اٹھا کر لے جائیں گے۔ وہ بہت پریشان ہے۔“

”بات تو ہے پریشانی کی۔ اور صرف اس کے لیے ہی نہیں ہمارے لیے بھی۔“ شینا پھپھو پڑ سوچ انداز میں بولیں۔

”اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ اب کیا کیا جائے۔“

”میرا خیال ہے سب کو اعتماد میں لینا پڑے گا اماں بی سیت۔“

”نہیں پھپھو۔ آپ کے سوا کسی کو بھی علم نہیں ہونا چاہئے۔“ فواد بھی مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ دروازے میں سے لہجہ نے اندر جھانکا۔

”اندر آ جائیں۔“

”جب یہاں تک تشریف لے لی آئی ہیں تو اندر بھی آ جائیں۔“ فواد نے جل کر کہا۔ ”حد ہوتی ہے نافرمانی کی۔ کہہ کر بھی آیا تھا کہ وہاں کوئی نہ آئے اور سب کے سب منہ اٹھا کر آ گئے تھے۔“ اب اپنی چونچیں ذرا بند رکھنا۔ فواد نے انہیں تنبیہ کی اور ایک بار پھر شینا پھپھو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ سب اندر آ کر بیٹھ گئے تھے۔

”فہدی! جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ بالکل ناممکن ہے۔ گھر کے افراد سے کوئی بھی بات زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی۔ اور خود سوچو اماں بی جو اسے اتنا چاہتی ہیں جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ ان سے کچھ چھپایا گیا ہے تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔ میرا خیال ہے بتا دینا بہتر ہے۔ دوسری صورت میں سب کی ناراضگی مول لینی پڑے گی۔“ شینا پھپھو بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ بڑی اماں آریان کو بہت محبت سے پیش آتی تھیں۔ اور آریان ان کی محبت کو کسی صورت کھونا نہیں چاہتی تھی۔

”پھر۔“

”جو کچھ بھی کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔“ میرا خیال ہے سب گھروالوں کی سپورٹ حاصل ہونے پر زیادہ بہتر نتیجہ برآمد ہوگا۔“

”پھپھو! میں اپنے طور پر ان لوگوں کو سبق سکھانا چاہتا ہوں۔“

”فہدی! احمقانہ باتیں مت کرو۔ وہ لوگ مجرمانہ طور طریقے کے ہوں گے۔ ان سے یوں براہ

راست بھڑانا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“

”کیوں کیا وہ سلطان راہی کی روح سے ملاقات کر کے آئے ہیں۔“ شاذان کا منہ بند نہ رہ سکا۔
 ”شانی۔۔۔۔۔ فضول باتوں سے پرہیز کرو۔۔۔۔۔ موقع محل دیکھ کر بات کیا کرو۔“ روبیہ نے اسے گھورا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ سب اس وقت آریان کے لیے پریشان تھے۔

”یہ مسئلہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ کتنی پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں تم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہم لوگ جو گھروں کی چار دیواری سے نکلتے ہیں پھر بھی انہوں کے حصار میں رہتے ہیں۔ مجرمانہ ذہنیت کے لوگوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ستارہ بیگم جیسی عورتیں ہاتھ آیا شکار اتنی آسانی سے نہیں جانی دیتیں۔ اور اس کے لیے کسی کی جان بھی لینی پڑ جائے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتیں۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ تم میں سے عملی طور پر کوئی سامنے نہ آئے۔ میں اماں بی سے تفصیلی بات کروں گی۔ سب مل کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔“ شینا پھپھو نے انہیں سمجھایا۔ وہ سب خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

”اور آریان! تم پریشان مت ہونا۔ میرے لیے جیسی ایقہ اور روبیہ ہیں اسی طرح تم بھی ہو۔ کسی کی جرأت نہیں کہ وہ میری بیٹی کو کوئی معمولی سی تکلیف پہنچا سکتے۔ سادات گمر بزدل لوگوں کی جاء نہیں۔ تمہاری طرف اٹھنے والی میلی آنکھ نکالنے کی جرأت ہے ہم میں۔“ شینا پھپھو کا مستحکم لہجہ آریان کی چمکیں بھگو گیا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت جب ماں بن جاتی ہے تو دنیا بھر کے بچوں کو وہ اپنی اولاد سمجھنے لگتی ہے۔ اس کی متا کسی سمندر کی طرح وسیع ہوتی ہے۔ جتنی محبت بانٹتی ہے اس سے کہیں زیادہ محبت اور پیدا ہو جاتی ہے۔ شینا پھپھو بھی سراپا ماں تھیں۔ ہر ایک کے لیے اور آریان جیسی حرماں نصیب لڑکی کے لیے بھی۔ فواد ان سے بات کر کے مطمئن ہو گئے تھے۔ اور آریان بھی۔

اگلے دن شینا پھپھو نے اماں بی سے تفصیلی بات کی اور توقع کے عین مطابق ان کے دل میں آریان کے لیے جو محبت تھی وہ جوں کی توں رہی بلکہ اس کے درد اس کے دکھن کر اور بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے سب خواتین کو اپنے پاس بلایا سوائے حدیقہ کے۔ کیونکہ وہ دوسروں کے دکھوں سے خطا اٹھانے والوں میں سے تھیں۔ اور ان سے آریان کے متعلق ہر بات کہہ کر انہیں یہ بھی کہا کہ جلد سے جلد اپنے شہروں کو اس مسئلے پر رام کرنے کی کوشش کریں تاکہ اس بے سہارا لڑکی کو مشکل سے نکالا جاسکے۔ سب خواتین نے موقع دیکھ کر شوہروں سے بات کر لی اور سب ہی آریان کی حمایت میں نظر آ رہے تھے۔ حدیقہ اور شا کر چونکہ اس گھر کے کسی مسئلے میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے انہیں اب بھی اس معاملے سے دور ہی رکھا گیا تھا۔ بڑی اماں سمیت گھر کے سب مرد و خواتین آریان کے حق میں تھے سوائے عارب تایا کے۔ ان کو شینا پھپھو کچھ نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ لیکن اماں بی نے کہا کہ اسے اعتماد میں لے

لو۔ یہ نہ ہو کچھ عرصہ بعد اسے کہیں سے بھٹک پڑ جائے اور تمہاری جان کے لیے مصیبت بن جائے۔ پہلے ہی تمہاری زندگی بہت تنگ ہے اور پھر زیادہ تنگ ہو جائے گی۔ سوانہوں نے ایک دن جب عارب تایا کا موڈ کچھ بہتر تھا جو کہ شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ آریان کی بات چھیڑ دی لیکن جو شدید رد عمل عارب تایا کی طرف سے دیکھنے میں آیا۔ ہینا پچھو پریشان ہو گئیں۔



مہندی رچے گورے گورے پاؤں ابھی تکے سامنے تھے کمرے میں نیم تار کی تھی شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے بالکل اس کی زلفوں کی طرح۔ غلام عباس نے سامنے مچلیں بستر پر محو خواب وجود کو دیکھا۔ کس قدر حسن سمیٹ رکھا تھا اس بے خبر وجود نے۔ یوں لگتا تھا کائنات ہی سمٹ کر مجسم ہو کر سامنے آگئی ہو۔ لمبی لمبی گہری آنکھیں جن پر سیاہ پلکوں کا چھتار سا یہ قلعہ رہتا تھا اور اس وقت بھی سرخی مائل گورے گالوں پر وہ پلکیں اپنا سایہ کیے ہوئے تھیں۔ نیم دگلا بی شکر فی ہونٹ جیسے کوئی گیت گانے کو چل رہے تھے۔ اس گھر میں بے شمار کمرے تھے لیکن غلام عباس کو یہی لگتا تھا کہ زندگی بس اسی کمرے میں مقید ہے۔ جانے کیوں اس کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی سانسیں ہل ہو جاتی تھیں۔ سینے میں سلگتی ارمانوں کی چتا پر جیسے شبنم کی ٹھنڈک اترنے لگتی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑے موہیے کے ڈھیروں پھولوں کو ایک نظر دیکھا پھر وہ بے قدموں آگے بڑھ کر اس نے وہ سارے پھول ان گورے گورے چہروں پر ڈھیر کر دیئے یوں جیسے کوئی واس دیوی کے چہروں میں کچھ دان کر رہا ہو۔ نرم گدرائے ہوئے چہروں کو شاید نرم نرم پھولوں کا جمل سانس ناگوار گزارا تھا وہ کچھ کسمسائے اور پھر جیسے ساری کائنات ہی متحرک ہو گئی۔ محو خواب وجود ایک تو بہ شکن انگڑائی لے کر بیدار ہو چکا تھا۔ سیاہ گھوڑا آنکھیں نیند کے خمیر سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ غلام عباس نے نگاہیں چرائیں۔

”کیا وقت ہو گیا غلام عباس۔ کیا روشنیاں جل اٹھی ہیں؟“ دھیمی سی آواز غلام عباس کے کانوں سے نکرائی۔

”جی بی بی۔“ غلام عباس کا چہرہ تھکا ہوا تھا اور نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں جانے کیا بات تھی وہ ان آنکھوں میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پورے دن میں اس کے لیے وہ لمحے بے حد قیمتی اور مقدس ہوتے تھے۔ جب وہ اس کمرے میں پھول لے کر آتا تھا۔

”غلام عباس! تم سے کتنی بار کہا ہے ہمارے پاؤں اس قابل نہیں جن پر تم یہ پھول نچھاور کرو۔ ایسا کر کے تم ان کی پاکیزگی کو بھی مجروح کرتے ہو اور میری ذات میری روح کے زخموں پر سے کھرٹ اترنے لگتے ہیں۔ پاکیزگی، پارسائی، پاک دامنی، محبت ان لفظوں سے نا آشنا ہو چکی ہوں۔ ان پھولوں کی نرمی سے میرے زخموں کا مداوا ممکن نہیں۔“ درد جب لفظوں میں در آتا ہے تو سننے والے کی

سماعت کو بھی زخمی کر دیتا ہے۔ غلام عباس نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔

”ایسا مت کہیں بی بی! آپ کیا جانیں آپ کیا ہیں۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا ہے کہ مجھے مت روکا کریں۔ اپنی زندگی پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ میں نے کبھی اختیار کی تمنا بھی نہیں کی۔ بس چند لمحے مجھے عطا کر دیں غلام عباس کسی سے کچھ نہیں مانگتا نہ ہی آپ سے کسی چیز کا طلب گار ہے۔ بس ایک خواہش ایک آرزو ہے اس کو پورا کرنے دیں۔“ غلام عباس کی آنکھیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ چاندنی کی آنکھیں اس کے چہرے پر تنگ گئیں۔ جس جگہ چہروں کی پہچان مشکل ہو جائے کون کیا ہے۔ کیا ہے؟ سمجھ ہی میں نہ آئے وہاں ایسا بے ریا شخص کیا جی پائے گا۔

”آج ایک بات پوچھیں غلام عباس۔ کیا بتاؤ گے؟“

”پوچھیں بی بی۔“

”تم روزانہ میرے لیے پھول کیوں لے کر آتے ہو؟“

”پتا نہیں کیا بات ہے بی بی! لیکن آپ کو آواز دے کر جگانا مجھے اچھا نہیں لگتا اور جھوٹا اس لیے نہیں کہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ آپ کی پاکیزگی مانع ہوتی ہے۔ اس لیے۔ اس لیے آپ کو جگانے کا مجھے یہی طریقہ سمجھ آیا۔“ غلام عباس کا لہجہ بہت دھیمہ تھا اور چاندنی جیسے اس کی محبت کے اس انداز پر کانپ اٹھی تھی۔ اس کا زخم زخم وجود بھلا محبت کے اس انداز کا کہاں مقفل ہو سکتا تھا۔ اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں پر ٹھہر گئے۔ اپنے پھیلے ہوئے گھنیرے بالوں کو سمیٹ کر اس نے جوڑے کی شکل دی اور بہت خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ غلام عباس دیر تو اس کے بولنے کے انتظار میں کھڑا رہا اور جب وہ کچھ نہ بولی تو وہ بھی نہایت خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ سامنے کرسی پر اس کا باسی گجرے اور دیگر سنگھار کی چیزیں رکھی تھیں۔ باہر کا ماحول اپنے آپ میں آنے لگا تھا۔ روشنیوں کے ہوتے ہی دھیمے دھیمے ساز و سہاروں کی طرح اٹھنے لگے تھے۔

”مجھتیں پانے کا جو طریقہ تم نے چنا تھا ناں۔ آخر اس کا انجام کیا ہے۔ کیا بغاوت کبھی اس بھی آئی ہے۔ باغی کی سزا موت ہے اور تم۔۔۔ تم خود دیکھ لو۔ ہر گزرتے دن اور رات میں کتنی بار مرتی ہو تم۔ کیا جینا اس کو کہتے ہیں؟“

کچھ دھندلے عکس اس کی آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ اس کے کچھ اپنے بھی تو تھے جن کو وہ کھوپچی تھی اور جب کچھ کھوجاتا ہے تو اتنی بڑی کائنات میں اس کو تلاش کرنا کہاں ممکن ہوتا ہے اور اب۔۔۔ اب یہ غلام عباس۔۔۔ یہ ایک بار پھر اس کے راستوں کے کانٹے چنے نکل کھڑا ہوا ہے یہ جانے بغیر کے وہ کانٹے جن نہیں سکے گا ہاں محبت کے خارزار میں ٹھیک کراسے مزید زخمی ضرور کر دے گا۔



کے تقریباً تمام فردا ماں بی کے کمرے میں جمع ہو گئے۔

”میرا خیال ہے کہ جس کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اسے بھی بلایا جائے۔“ اماں بی سہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ اور شینا پھپھو جا کر آریان کو اپنے ہمراہ لے آئیں۔ آریان کو اماں بی نے اپنے قریب بٹھالیا اور طائرانہ نظر کمرے میں موجود افراد پر ڈالی۔ سب سی خاموش اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔

”میں ایک بہت اہم موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے یہ جاننا چاہوں گی کہ سادات گھر کے مکینوں کے لیے میرے کہے کی کتنی اہمیت ہے۔“

”اماں بی! یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آج بھی اور آنے والے نکل کو بھی اس گھر کے ہر فیصلے پر آپ کی مہر تصدیق ثبت ہونی ہے۔ ابامیاں نہیں ہیں تو کیا ہوا..... ہمارے نزدیک آپ کا کہا ہوا بھی اتنا ہی محترم اور معتبر ہے جتنا کہ ان کا تھا.....“ انظر چچا سلیقے سے بولے۔ اماں بی طمانیت بھرے انداز میں مسکرائیں۔

”تو بس ٹھیک ہے..... آریان بیٹی کے بارے میں پچھلے کچھ دنوں کے دوران ہونے والے انکشاف کے بارے میں سب جان ہی چکے ہوں گے..... میں نے آپ سب کو اس لیے بلایا ہے تاکہ اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکوں کہ آریان اب اسی گھر میں رہے گی۔ اہیڈ، روبیہ، مہوش اور انا کی طرح..... آپ میں سے کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں.....“ انہوں نے بات ختم کرتے ہوئے عین نظروں سے سب کے چہروں کے تاثرات دیکھے سوائے عارب شاہ کے سب نارمل انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے اماں بی! جب آپ نے فیصلہ کر لیا ہے تو پھر آپ کو کسی کی رائے لینے کی ضرورت نہیں.....“ باہر چچا بھی اماں بی کے حمایتیوں میں شامل ہو گئے۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے باہر..... ایک بیٹی کے باپ ہو کر سمجھ نہیں سکتے کہ اس جیسی لڑکی ہمارے گھر میں رہے گی تو ہماری بچیوں پر کیسے اثرات مرتب ہوں گے۔“ عارب شاہ چپختے ہوئے لہجے میں بولے۔

”اس جیسی سے تمہاری کیا مراد ہے عارب؟“ اماں بی کا لہجہ بے لچک تھا۔

”کیا اب سادات گھر کے مکین اپنے مقام سے اس حد تک گر چکے ہیں کہ انہیں سید گھرانوں اور کوٹھوں کا درمیانی فرق ہی نظر نہیں آ سکتا۔“

”بھائی! یہاں آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ اس بچی کو ہمارے درمیان رہتے بہت دن گزر چکے ہیں۔ ایسی کون سی قابل اعتراض بات دیکھی آپ نے اس میں..... جس کی وجہ سے اس کا یہاں رہنا ہمارے گھر کے ماحول کو خراب کر دے۔“ انظر شاہ عارب تایا کی بات سن کر تحمل لہجے میں بولے۔ حقیقتاً

صبح کا وقت تھا۔ سادات گھر کی چہل پہل حسب معمول تھی۔ بچے سہری سکولوں کو جا چکے تھے۔ فواد کو ایرجنسی ٹیلی فون آیا تھا سو وہ بھی کلینک جا چکے تھے۔ اہیڈ کے پہچان ہونے والے تھے۔ اس لیے وہ کالج جانے کی بجائے گھر پر ہی تیاری کر رہی تھی۔ رات گئے تک پڑھنے کی وجہ سے وہ ابھی سوئی ہوئی تھی۔ روبیہ اور آریان سکول جانے کی تیاری کر رہی تھیں کہ انہیں شینا پھپھو والے کمرے سے بلند آوازیں سنائی دیں۔ روبیہ تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ چاکسی ہاتھ پر اس کی ماما کو ڈانٹ رہے ہیں۔ شینا پھپھو کی آواز نہیں آرہی تھی۔ عارب تایا ہی دھاڑے جا رہے تھے۔ پھر اس نے دیکھا کسی طوفان کی طرح وہ اپنے کمرے سے نکلے اور اماں بی کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اماں بی چاشت کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیح کرنے میں مصروف تھیں۔ جب وہ اندر داخل ہوئے..... ان کے خطرناک تیزور اماں بی کو پہلی نظر میں ہی دکھائی دے گئے۔

”اماں بی..... کیا ہو رہا ہے اس گھر میں..... کیا سن رہا ہوں میں۔“ اتنے ہی جاتھبید انہوں نے قدرے سخت لہجے میں اماں بی کو مخاطب کیا۔

”عارب بیٹا..... سکون سے بیٹھ کر بات کرو۔ جو بھی کرنی ہے..... کیا سن لیا تم نے.....؟“ اماں بی کا سکون قابل دید تھا۔

”ایک طوائف زادی اس گھر میں کس لیے رہ رہی ہے..... اماں بی کیا اچے کے اصول ختم ہو چکے ہیں۔ مریچی ہیں سادات گھر کی روایات.....“ عارب شاہ سخت برا فروختہ تھے۔

”عارب پہلے اپنے لہجے کو درست کرو کہ کس سے مخاطب ہو..... یہ مسکا اٹھے گا میں جانتی تھی..... اسی لیے میں نے سب کو بلایا ہے..... اگر انتظار کر سکتے ہو تو چند لمحوں انتظار کر لو..... ہر بات واضح ہو جائے گی۔“ اماں بی انہیں جواب دینے کے بعد دوبارہ اپنی ادھوری تسبیح کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ عارب شاہ بیچ و تاب کھا رہے تھے لیکن جانے کس مصلحت کے تحت خاموش ہو گئے۔ پھر کچھ ہی دیر میں گھر

تو یہ ٹھیک تھا کیونکہ سب ہی آریان کی بے بسی سمجھ رہے تھے۔ آریان اس وقت دہرے عذاب سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف وہ ماں کے دکھ کو اپنی جان پر سہہ رہی تھی تو دوسری طرف زندگی کی سانسیں اس پر کسی امتحان کی طرح گزر رہی تھیں۔ وہ اماں بی کے کمرے میں بیٹھی تھی لیکن اسے یوں لگ رہا تھا وہ کسی عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہے اور ارد گرد موجود لوگ اس کی ذات کو طنز و تشیع کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ لفظوں کے پتھر اس کی روح کو زخمی رہے تھے لیکن خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کی سعی میں مصروف تھی۔

”بس میں نے کہہ دیا ہے کہ میں کم از کم اسے یہاں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس گندگی کے ذہیر سے اپنے گھر کو آلودہ نہیں کر سکتا۔“

”عارب بھائی! پلیز اس طرح تلخ باتیں مت کریں۔ اس بچی کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ حالات کی ستائی ہوئی ہے۔ اگر ہم اسے سہارا نہیں دیں گے تو آئندہ زندگی میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوگا ہم سب اس کے ذمہ دار ہوں گے۔“ اظہر شاہ بولے۔

”کس لیے ذمہ دار ہوں گے۔ ہمارا اس کے ساتھ رشتہ کیا ہے؟۔۔۔۔۔ رحمہ لی اپنی جگہ لیکن کیا ہر بے سہارا گھر سے بھاگی ہوئی آوارہ لڑکی کو گھر میں پناہ دے دیں کہ شاید یہ واقعی بے قصور ہے۔ یہ گھر ہے۔۔۔۔۔ اسے گھر ہی رہنے دو۔۔۔۔۔ دارالامان مت بناؤ۔“ عارب شاہ کا ہر لفظ آریان کے دل پر ایک نیا زخم بناتا جا رہا تھا۔ آنسو اب اس کے اختیار سے باہر ہو گئے تھے۔ وہ بے آواز رونے لگی۔ وہاں موجود خواتین اس کے دکھ کو محسوس کر رہی تھیں۔ اس کے درد کو سمجھ رہی تھیں لیکن اس معاملے میں نہیں بول سکتی تھیں کہ سادات گھر کی یہ بھی ایک روایت رہی تھی کہ فیصلے صرف مرد کیا کرتے تھے خواتین کو دخل اندازی کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی لیکن سب ہی خواتین فطرنا حساس اور نرم دل واقع ہوئی تھیں۔ اس لیے عارب شاہ کا رویہ انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خاص طور پر ہینا پھپھو آریان کے سامنے بے حد ندامت محسوس کر رہی تھیں۔

”یعنی تمہیں آریان کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے۔ تم ہمارے فیصلے پر انحراف کر رہے ہو۔“ اماں بی درخششی سے بولیں۔

”اماں بی! آپ اسے انا کا مسئلہ مت بنائیں۔ میں آپ کے فیصلے سے انحراف نہیں کر رہا۔ اس گھر کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے رائے پڑے رہا ہوں جو مجھے ٹھیک نہیں لگے گا میں اس سے اختلاف کروں گا۔“

”تو ٹھیک ہے۔ آریان کو یہاں رکھنے کا فیصلہ میرا ہے۔ تمہیں اگر اس کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے تو میں بھی یہاں نہیں رہوں گی۔ بات آریان کی نہیں میری اہمیت کی ہے۔ جہاں میری بات

کو اہمیت ہی نہیں دی جاتی تو وہاں رہ کر میں کیا کروں گی۔“ اماں بی قطعیت سے بولیں۔

”اماں بی! آپ محض ایک چھوٹی سی بات کو ایسا ثوبت بنا رہی ہیں۔ میں جس وجہ سے مخالفت کر رہا ہوں اس کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہا۔ ہماری ایک عزت ہے شہر میں ایک مقام ہے۔ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھیں۔ کل کو اگر اگلیاں اٹھیں گی تو اس سے اس کا کچھ نہیں بڑے گا ہماری ساکھ خراب ہوگی۔ ان جیسویں کا کیا ہے ایک چھوڑ سونٹھکانے ڈھونڈ سکتی ہیں۔“ عارب شاہ کا زہریلا لہجہ آریان کی رگ و پے میں گردش کرتے خون میں شامل ہو کر اس کے سارے وجود کو نیلا کر گیا۔ اذیت کے اس کڑے احساس نے تڑپا دیا تھا اسے لیکن افسوس کہ وہ تو حالات کے دھارے پر بہتا ایک بے وزن وجود تھی۔ لہریں اس کے ساتھ جو سلوک بھی کرتیں اسے سہنا تھا۔

”بس عارب بھائی۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ آپ نے کہا ہم نے سن لیا۔“ بابر چچا نے ہاتھ اٹھا کر عارب شاہ کو مزید بولنے سے روک دیا۔ ”آپ مسلسل ایک پاک باز اور معصوم لڑکی کو تحقیر کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ آپ کو یہ قبول نہیں تو ٹھیک ہے آپ اس کے لیے اپنے پورشن کے دروازے بند کر دیں لیکن سادات گھر سے نکالنے کا فیصلہ آپ اکیلے نہیں کر سکتے۔ اس گھر میں پانچ خاندان آباد ہیں۔ آریان کو آپ ٹھکرا رہے ہیں ہم سب نہیں۔ یہ میرے ساتھ رہے گی۔ جس طرح مجھے مبہوش عزیز ہے آریان بھی ویسی ہی ہے میرے لیے۔ اٹھو بیٹا۔۔۔۔۔ آج کے بعد تم ہمارے ساتھ رہو گی۔ زادہ بیگم اٹھیے آریان بیٹی کو اپنے ساتھ لے جائیے۔“ بابر چچا نے پہلے آریان اور پھر زادہ بیگم کو مخاطب کیا۔ زادہ بیگم خاموشی سے انھیں تاکہ آریان کو اپنے ساتھ پورشن میں لے جائیں۔ آریان نے ایک نظر اماں بی کی طرف ڈالی۔ اماں بی، بابر چچا کے فیصلے سے بہت مطمئن اور خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

”جاؤ بیٹی! مجھے یقین ہے کہ آج کے بعد اس گھر میں تمہیں دوبارہ سوال و جواب کے کڑے امتحان سے نہیں گزرنا پڑے گا۔ اب یہ گھر تمہارا ہے۔ تمہیں اب کوئی تکلیف نہیں ہوگی یہاں۔ سادات گھر کے کلین مہبتوں کے معاملے میں تمہی داماں کسی۔ لیکن اتنے حوصلے والے ہیں کہ تمہیں پناہ میسر کر سکیں۔ بابر اور زادہ کو اپنے والدین سمجھ کر رہو گی تو سکھی ہوگی۔“ اماں بی نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ سر جھکا کر زادہ بیگم کے ہمراہ کمرے سے نکل گئی۔ عارب شاہ اپنے چہرے پر بہت سی نگاہوں کی چشم محسوس کر رہے تھے۔ لیکن انہیں اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا ان ملا تہی نگاہوں کے سامنے وہ شرمندہ نہیں تھے۔ سو بہت سکون سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ یہی بہت تھا کہ اب آریان کی صورت انہیں اپنے ارد گرد دکھائی نہیں دیتی تھی۔



”لیکن پتا بھی تو چلے کہ آخر وہ کہتا کیا ہے..... کس بات پر وہ اتنے غصے میں آگیا وہ تو بہت خاموش اور سسٹی شخصیت کا مالک ہے۔“

”اللہ جانے! صبح سے کہے جا رہا ہے مجھے جانے دو..... میں نے جانا ہے..... میں آ رہا ہوں۔“

میں جاؤں گا۔ میں آؤں گا۔ خدا جانے کون سے سارے کی مخلوق اٹھا کر لے آئے ہو کون سی بولی بولتا ہے میری تو عقل سے باہر ہے۔“ کاشف جل بھن کر بولا۔

”چلو میرے ساتھ جا کر دیکھتے ہیں.....“

”نہ بابا..... تم جاؤ۔ مجھے اپنی زندگی فی الحال بہت پیاری ہے۔ ہائے میری فریال تمہاری محبت میں یہ ڈاکٹری جیسا منحوس پیشہ جان کو چٹ گیا۔“ وہ آہ بھر کر اپنی اکلوتی معیتر کو یاد کرنے لگا جس کی خواہش پر اس نے میڈیکل جوائن کیا تھا۔

”تم کبھی سدھر نہیں سکتے۔“ فواد نیل پر سے اسٹیتھی سکوپ اٹھا کر وارڈ کا راؤنڈ لینے چلے گئے۔

نذیر اور اکبر نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا اور نرس سسلی اس کے بازو میں انجکشن لگانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی مسلسل مومنٹ کی وجہ سے وہ اس میں ناکام ہو رہی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے..... یہ کیا طریقہ ہے؟“ فواد گرج کر بولے۔ نذیر اور اکبر نے گھبرا کر مریض کے بازو چھوڑ دیئے۔

”جس رویے سے بچانے کی خاطر میں نے اسے یہاں ایڈمٹ کیا ہے تم لوگ وہی سلوک اس کے ساتھ روا رکھو گے تو کیا فرق پڑے گا اس کی شخصیت پر.....“ اس نے کہیں کے۔“ آخری لفظ فواد نے خود کلامی کے سے انداز میں کہے۔

”سہجی! اس کی دوائی اور ٹیکے کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ سسلی نے کہا۔

”لیکن دوا سے پہلے اسے کچھ کھانے کو دو.....“

”پر سہجی کچھ کھاتا بھی تو نہیں..... یہ دیکھیں صبح اس نے کیا حال کر دیا میرا!“ نذیر نے اپنا گال آگے کر کے دکھایا۔

”ہاں سن چکا ہوں..... بہر حال تم جاؤ کچھ لے کر آؤ کھانے کو میں کوشش کرتا ہوں۔“ فواد کہہ کر بہت آرام سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”بابا.....“ بہت ملائمت سے اسے پکارا۔ تو وہ جیسے چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

پتا نہیں ان کے سامنے وہ انس قدر سلجھا ہوا کیوں بن جاتا تھا۔ وہ آج تک یہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ ان کے سامنے تو کبھی اس نے کوئی اوٹ پٹانگ حرکت نہیں کی تھی۔

”دیکھو..... مجھے جانے دو..... میں نے جانا ہے..... میں آ رہا ہوں..... میں جاؤں گا۔ میں

کلینک میں داخل ہوتے ہی فواد کو کچھ غیر معمولی محسوس ہوا۔ آفس میں سر پکڑے بیٹھا کاشف، اپنے سامنے پڑے پانی کے ادھ بھرے گلاس کو یوں گھور رہا تھا جیسے پتا نریم کی مشق کر رہا ہو۔

”تمہیں کیا ہوا ہے.....“ فواد نے اس کا کندھا ہلایا۔

”میں تو افسوس ہے کہ ابھی تک کچھ ہوا کیوں نہیں.....“ وہ تو جیسے جلا بیٹھا تھا۔

”یہ بھلا کیا بات ہوئی۔“ فواد مسکراتے ہوئے اس کے سامنے والی چیز پر بیٹھ گئے۔

”تم سے اگر اپنا مریض نہیں سنبھالا جاتا تو کوئی بچہ ہنگوا دو جس میں طوطے کی طرح بند کر دیں اسے جد ہو گئی۔ کلینک کو پاگل خانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔“

”یار بے ضرر سا شخص ہے وہ۔ کیا کہہ دیا اس نے تمہیں؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا مگر کہہ بھی سکتا ہے۔ صبح اکبر بھاگا بھاگا میرے پاس آیا کہ وہ مریض گیٹ

سے باہر جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ نذیر کیا ڈنڈا اور وارڈ بوائے نے بڑی مشکل سے قابو میں کیا ہوا تھا۔ اتنی مشکل سے کنٹرول کر کے اسے وارڈ میں لائے اور پیروں میں سنگل ڈال کر بند کے ساتھ باندھ دیا پھر ناشتہ کرانے کی کوشش کی تو نواب صاحب نے گلاس اٹھا دھر بیچ دیا..... چائے کا کپ اکبر کے پیروں پر دے مارا..... وہ جلتے پیر کی ٹلی کی طرح پورے وارڈ میں اچھلنے لگ گیا۔ نرے اٹھا کر نذیر کے منہ پر دے ماری..... گال پھاڑ ڈالا اس کا تین چار ٹانگے لگائے پڑے۔“ کاشف نے داستان الم ایک ہی سانس میں کہہ سنائی۔

”یار! اتنا تو معصوم شخص ہے وہ..... مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب اس نے کیا ہوگا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے تمہیں اگر یہ معصوم شخص بہت پیارا ہے تاں تو رہو اپنے اس کلینک کم پاگل خانے

میں اس کے ساتھ..... مجھے تو چھٹی دو۔ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ کل کلاں کو میرا سر پھاڑ ڈالے یا مجھ پر حملہ کر دے تو میرے تو سارے ارمان خاک میں مل گئے ناں۔“ کاشف اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

اؤں گا۔" بے ربط لفظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

"بابا..... کہاں جاتا ہے آپ کو....." فواد نے اسی طرح نرم لہجے میں کہا۔ نذیر کپاؤ نظر آتی دیر میں ڈبل روٹی کے دو تین چیس اور دودھ کے ایک گلاس پر مشتمل ناشتہ لے آیا۔

"میں..... مجھے جانا ہے..... میں جاؤں گا۔" اس کی جیسے ایک ہی رٹ تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے آپ نے جہاں جانا ہے میں لے چلوں گا آپ کو..... لیکن پہلے کچھ کھالیں۔"

"لے چلو گے....." اس کے لہجے میں شک تھا۔

"ہاں لے چلوں گا....."

"تم..... لے چلو گے....."

"ہاں بابا..... جہاں کہیں گے لے چلوں گا لیکن پہلے آپ کو یہ کھانا کھانا ہوگا پھر دوائی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے....." وہ رضامند ہو گیا تھا۔ فواد نے ڈبل روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دودھ میں بھگو کر اسے کھانے شروع کر دیے۔ نرس سلی، نذیر اور اکبر ہنوت بنے دیکھ رہے تھے۔ آج سے پہلے انہوں نے کسی ڈاکٹر کو اپنے مریض کے ساتھ اس قدر ان گنج نہیں دیکھا تھا۔ فواد خود بھی بہت ریزہ ریزہ تھے لیکن انہوں نے جس سچو نیشن اور حالات میں اس کو دیکھا تھا وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ سو ایک لحاظ سے انہیں اس سے قلبی لگاؤ سامحوس ہوتا تھا۔

وہ بہت توجہ کے ساتھ بغیر مزاحمت کے کھانا کھاتا رہا۔ پھر گلاس میں باقی بچا ہوا دودھ پی لینے کے بعد اس نے ارد گرد ایک نظر ڈالا۔

"اب..... اب مجھے جانا ہے..... مجھے لے چلو....."

"نہیں بابا! اب کچھ دیر آرام کریں..... آپ تھک گئے ہوں گے۔" فواد کا انداز نالہ والا تھا۔

"آرام کروں....." وہ تیز لہجے میں بولا..... "میں نے کہا..... مجھے جانا ہے..... میں جاؤں گا..... مجھے جانے دو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس ٹھائیں کی آواز سے سامنے دیوار پر دے مارا۔ فواد نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی۔

"تم..... تم نے جھوٹ بولا..... تم نے کہا لے چلو گے....." وہ چلانے لگا۔

دارڈ میں موجود دوسرے مریض سر اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔

"بابا..... میں نے انکار تو نہیں کیا۔ میں لے چلوں گا آپ کو....." فواد آگے بڑھے لیکن اس نے ان کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر ایسا بھرپور دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچے۔ پہلی بار اس کی جنونی کیفیت ان کے سامنے آئی تھی۔

"جھوٹ..... تم سب جھوٹے ہو..... تم نہیں لے کر جاؤ گے میں نے جانا ہے۔" وہ اپنے آپ کو

نذیرہوں سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فواد سے پونہ چھوڑ کر آفس میں آ گئے۔

"کاشف..... ہی از ریلی آسیر لیں کیس....." فواد جھکے ہوئے لہجے میں بولے اور کرسی پر سر تھام کر بیٹھ گئے۔

"نہیں میرے بھائی وہ تو بے چارہ بے ضرر اور معصوم شخص ہے۔" کاشف نے لطیف سے طنز یہ لہجے میں کہا۔

"محترم کرو اس سے پہلے میں نے اس کی ایسی کیفیت نہیں دیکھی..... کیا اسے اسی طرح کے دورے پہلے بھی پڑتے رہے ہیں۔" فواد نے پوچھا۔

"نہیں پہلے ان دوروں کی شدت بہت کم ہوتی تھی۔ اب تو بہت شدید ہیں۔ اس کے اس طرح ہسٹریائی انداز میں چیخنے اور چلانے کا وارڈ کے دوسرے مریضوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔" کاشف نے کہا۔

"یہ تو ہے..... پھر تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہئے۔"

"میرا خیال ہے اس کو اوپر کے کمرے میں شفٹ کر دو۔" کاشف نے پُر خیال انداز میں کہا۔

"نہیں..... یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ ملازمین کی ذرا سی غفلت سے اس کی جان بھی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے آج کے بی ہیوئیر سے یہ اندازہ ہو چکا ہے مجھے کہ وہ میٹھی اپ سیٹ ہے اور ایسے لوگ کسی وقت بھی کچھ کر سکتے ہیں جو ان کے لیے یا کسی دوسرے کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" فواد نے کاشف کی تجویز رد کر دی۔ اسی وقت باہر شاہ نے آفس میں قدم رکھا۔ فواد ان کو دیکھ کر حیران سے ہو گئے۔ کاشف نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔

"ابو آپ..... خیریت تو ہے ناں.....؟" انہوں نے پوچھا باہر شاہ بہت کم ان کے کلینک آتے تھے۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔ مگر سے کسی کام نکلا تو اماں بی نے اپنی دواؤں کی پر سکرپشن تھما دی۔" یہیں قریب ہی ہاشمی بلڈرز ہیں ناں۔ وہیں کام تھا مجھے تو سوچا جاتے ہوئے پرچی تمہیں دے جاؤں..... مگر واپسی پر یاد سے لیتے آنا....." انہوں نے جیب سے کاغذ نکال کر نیفل پر رکھا۔ کاشف آفس سے کسی کام کا بہانہ کر کے نکل گیا تھا کہ ممکن ہے باپ بیٹے کو کوئی ضروری بات کرنا ہو۔

"ابو! آئی تھنک بات کچھ اور ہے....." فواد نے باہر شاہ کے چہرے پر چھائے سکوت اور لہجے کی سنجیدگی سے اخذ کیا تھا۔ وگرنہ باہر شاہ اتنے چھوٹے سے کام کے لیے ان کے کلینک پر کبھی نہ آتے کہ دوائیاں تو میڈیکل سٹور سے مل جاتی ہیں۔ فواد کی بات سن کر ایک ٹالچے کو باہر شاہ نے ان کے چہرے کو دیکھا۔

اولاد جب کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگ جائے۔ ماں باپ کے لیے کس قدر مشکل ہو جاتا ہے اپنا آپ چھپانا۔

”ہوں۔۔۔ فہدی! تم نے اپنی ہینا پھوسے کوئی بات کی تھی؟“ انہوں نے فواد سے پوچھا۔
”کس سلسلے میں۔۔۔“ فواد سیدھے ہو بیٹھے۔ یعنی ان کا خیال درست تھا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ہے اب کیا ہوا ہے یہ تو بابر شاہ ہی بتا سکتے تھے۔
”آریان سے متعلق۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔ کی تھی۔۔۔ گھر میں اس مسئلے پر کوئی بات ہوئی ہے۔“ انہوں نے پوچھا۔
”ہاں ہینا نے اماں بی سے بات کی اور بعد میں اماں بی نے گھر کی خواتین کے ذریعے بات ہم تک پہنچائی۔ باقی سب تو ٹھیک ہی تھے بس عارب بھائی نے بہت ہنگامہ کیا۔۔۔“
”لیکن کس بات پر۔۔۔“ فواد کو فتنہ بھرے لہجے میں بولے۔ اسے عارب بتایا اپنی انہی عادات کی وجہ سے کچھ خاص پسند نہیں تھے۔ کبھی کبھی تو ہینا پھوسے کے لیے ان کا دل بہت دکھتا تھا کس قدر نائس خاتون اور عارب بتایا جیسے شخص کے ساتھ زندگی کے اتنے سال کس طرح گزارے ہوں گے انہوں نے۔

”یہی بات ایٹو بنارکھی تھی کہ آریان کا بیک گراؤ ٹھیک نہیں۔ اب تک آریان انہی کے پاس تھی لیکن ان کے اس طرح ہنگامہ کرنے کے بعد میں آریان کو اپنے پورشن میں لے آیا ہوں۔۔۔ تم پریشان نہیں ہونا۔ آریان کے مسئلے میں تم اکیلے نہیں ہو۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ اس بچی کی عزت اور زندگی بچانے کے لیے جو بھی مجھ سے بن پڑے گا میں کروں گا۔“ بابر شاہ نے فواد کو اپنے ساتھ کا یقین دلایا تو وہ جیسے خود کو ہلکا پھلکا تصور کرنے لگے۔

”تھینک یو۔۔۔ تھینک یو دیری جی۔۔۔ میں سچ سچ خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔“

”پنگے! اماں باپ کس لیے ہوتے ہیں۔۔۔ بروڈھ اپنی ذات پر سہہ جاتے ہیں اولاد کی خوشی کی خاطر۔۔۔ آریان کو میں اپنی بیٹی بنا چکا ہوں۔ اس لیے اب اس کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بہر حال ابھی تو میں تمہیں لینے آیا تھا کہ میرے ساتھ ایس۔ پی کے آفس چلو۔۔۔ پولیس کو پہلی فرصت میں اعتماد میں لینا ہمارے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوگا۔ پہلے ان بد معاشوں کا تو معاملہ نمٹائیں۔ جو آئے روز پریشان کر رہے ہیں۔ ستارہ بیگم کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔“ بابر شاہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ابو! میرا خیال ہے کہ آپ خود ایس۔ پی سے مل لیں۔۔۔ آپ کا دوست ہے۔۔۔ آپ زیادہ بہتر طور پر اس سے بات چیت کر سکیں گے۔ میرا ذہن اس وقت اپ سیٹ ہے۔“

”اویار۔۔۔ کیوں اپ سیٹ ہے؟ کوئی وجہ بھی تو ہو۔۔۔“ بابر شاہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اسی بل کا شف نذیر کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ اس نے بابر شاہ اور فواد کے مکالمے کا آخری حصہ سن لیا۔
”وجہ بہت معقول ہے جناب! ان کے کلینک پر ایک وی۔ آئی۔ پی مریض تشریف فرما ہیں۔ سو ان کا اپ سیٹ ہونا لازمی ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا کسی بڑے گھر سے تعلق رکھتا ہے وہ۔۔۔“ بابر شاہ دلچسپی سے بولے۔
”جی نہیں۔۔۔ موصوف نے انہیں سڑک پر بچوں سے پتھر کھاتے دیکھا تو پکڑ کر کلینک لے آئے۔۔۔ بس تب سے انہوں نے جو سلوک ہمارے ساتھ اور ہمارے مریضوں کے ساتھ روا رکھا ہوا ہے الامان الحفیظ۔۔۔“ کا شف ایک سی لے میں بولے جارہا تھا۔

”بند بھی کرو اپنی بکواس۔۔۔ ابوالیسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں میں ایک ایکسپیریمینٹ کر رہا ہوں اس پر۔۔۔“ فواد نے کہا۔

”تم تو ایکسپیریمینٹ کر رہے ہو اور اس نے جو نذیر اور اکبر کے اوپر کیا تھا وہ کیا تھا؟“

کا شف کی بات سن کر بابر شاہ کی توجہ نذیر کے جینڈا جی والے گال پر پڑ گئی۔
”اسے کیا ہوا۔۔۔؟“

”یہ ڈاکٹر فواد کی لیبارٹری کے حملے کا شکار ہوئے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔“ بابر شاہ کی توجہ اپنی پریشانی سے وقتی طور پر ہٹ گئی۔

”جن پر ہمارے ڈاکٹر صاحب تجربہ کر رہے ہیں۔ اپنے نذیر صاحب انہی کے تجربے کا شکار ہوئے ہیں۔“

”فواد! یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔۔۔ تم نے ایسے مریض کو اپنے کلینک میں کس لیے رکھا ہوا ہے۔ پی مینٹل ہاسپٹل تو نہیں۔“

”ابو! وہ عام حالات میں داخل رہتا ہے کبھی کبھار ایسا ہی ہے۔“

”بہر حال اسے یہاں سے شفٹ کرو۔۔۔ جس طرح اس نے اسے زخمی کیا۔ کسی اور کو بھی کر سکتا ہے بلکہ دورے کی حالت میں ایسے لوگ قتل تک کر دیتے ہیں اور انہیں پتا نہیں چلتا۔“ بابر شاہ نے کہا۔

”مجھے جانے دو۔۔۔ میں نے جانا ہے۔۔۔ چھوڑو مجھے۔۔۔ میں آؤں گا۔ میں جاؤں گا۔“ آفس کے ساتھ والے کمرے سے اچانک بہت اونچی آواز بلند ہوئی۔

”چلیے جناب، ریڈیو پھر آن ہو گیا۔“ کا شف نے بیزارگی سے کہا۔

”آخر اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔۔۔ کون ہے۔۔۔ کیا بیک گراؤ نڈ ہے اس کا؟ کچھ اتنا پتا بھی ہے یا یونہی فلاح دارین حاصل کرنے چل پڑے ہو۔“ بابر شاہ نے فواد سے پوچھا۔

”نہیں ابو! اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ کافی دن پہلے روڈ پر میں نے پہلی بار اسے انتہائی زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ بچے اس کو پتھر مار رہے تھے۔ ہتا نہیں میرے دل میں اس کے لیے کھج سی کیوں پڑی۔ میں نہیں جانتا۔ بس یہ سوچ ذہن میں ابھری کہ مجھے اس شخص کو پہچانا چاہئے۔ بس اس وقت سے یہ میرے کلینک پر ہے۔“

”کیا اس کی بیماری آخری سٹیج پر ہے۔“ بابر شاہ نے پوچھا۔

”نہیں ابو! اس کے ٹھیک ہونے کے ایٹی پریسٹ چانس ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کو توجہ اور ٹریٹمنٹ ملے تو یہ جلدی ٹھیک ہو سکتا ہے۔“ فواد نے کہا۔

”اور یہ جو کچھ بول رہا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کہاں جانا چاہتا ہے؟ کسی جگہ کا نام بھی لیتا ہے؟“

”نہیں انکل! کسی جگہ کا تو نام نہیں لیتا۔ لیکن لگتا ہے کہ بے چارہ بڑی بڑی چوٹ کھائے بیٹھا ہے۔“

”کہیں کسی کو غصے والی کے عشق اور فرقت میں اس کا یہ حال نہ ہو گیا ہو۔“ کاشف اپنی عادت کے مطابق اوٹ پٹانگ ہانکے جارہا تھا اس بات سے بے خبر کے بابر شاہ پر اس کے ان جملوں نے اثر کیا تھا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے سرائخا کر کاشف کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو حنفیہ ہوا تھا جو فواد کی نظروں سے بھی چھپا نہ رہ سکا۔

”کاشف یار! کسی کسی وقت بولنے سے پہلے سوچ بھی لیا کرو۔“ پھر وہ بابر شاہ سے مخاطب ہوئے۔

”نہیں ابو! ایسی کوئی بات نہیں بس کسی کسی وقت دورے کی حالت میں اس کی سوئی اڑ جاتی ہے۔ عموماً خاموش رہتا ہے۔ بس دورے کی حالت میں ہی اسے بولتے سنا ہے اور یہی جملے دہراتا ہے۔ پتا نہیں اس کے پس پردہ کیا کہانی ہے۔“ فواد جیسے باتوں میں بابر شاہ کا دھیان بنانے کی کوشش کرتے گئے۔ بابر شاہ بالکل خاموش تھے۔ جیسے وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ پھر وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اچھا۔۔۔ میں۔۔۔ چلتا ہوں۔۔۔ میں خود ہی مل لوں گا۔۔۔ ایس۔ پی۔ سے۔“ عجیب سے الجھن آمیز انداز میں کہہ کر وہ باہر جانے کو پلٹے۔ ساتھ والے کمرے سے متواتر آوازیں آرہی تھیں۔ ان کے قدر غیر ارادی طور پر اس طرف اٹھ گئے۔ حالانکہ ان کا ادھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”انکل! ادھر مت جائیے گا۔ اس وقت وہ دورے کی کیفیت میں ہے۔“ کاشف نے انہیں اس طرف جاتے دیکھ کر پیچھے سے کہا لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

”ابو۔۔۔ نہ جائیں ادھر۔ وہ آپ کو کہیں زخمی نہ کر دے۔“ فواد نے بھی روکا لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کرادیا۔ اور خود جیسے قدموں سے چلتے اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔

گئے۔ جہاں وہ چلا رہا تھا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے کمرے کے اندر جھانکا۔ فرش پر ادھر ادھر برتن، بستر کی چادر اور جانے کیا کیا الا بلا بکھرا پڑا تھا اور وہ بیڈ پر ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دس دس زنجیریں تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پر یہی الفاظ تھے۔

”مجھے جانا ہے۔۔۔ میں آؤں گا۔۔۔ میں جاؤں گا۔۔۔ چھوڑو مجھے جانے دو۔۔۔ مجھے لے چلو۔“ بابر شاہ کی نظریں اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ بہت عام سے انداز میں اس کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ان کے ذہن میں کچھ الجھن سی پیدا ہوئی۔ یونہی دیکھتے دیکھتے الجھن آمیز لکیریں ان کی پیشانی پر نمودار ہو گئیں۔ انہوں نے ہر سوچ انداز میں آنکھیں سکڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

کون سی چیز دماغ کو شیج کر رہی تھی وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اضطرابی انداز میں ہونٹ کاٹتے وہ دوبارہ پلٹ آئے۔ فواد کو اپنے ابو کا یہ انداز بہت غیر معمولی اور عجیب لگتا تھا۔ وہ بے خیالی میں چلتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔ ان کی نظریں تو فواد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن فواد یقین سے کہہ سکتے تھے کہ بابر شاہ ان پر نظریں جمائے رکھنے کے باوجود انہیں نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی باطنی آنکھیں کہیں اور کچھ رہی تھیں۔

”فہدی! تم اس کا بہت خیال رکھنا۔۔۔ اسے کہیں جانے مت دینا۔“ بابر شاہ کے منہ سے نکلنے والے جملے غیر متوقع تھے۔ فواد کے ذہن میں کئی سوچوں نے بیک وقت سر اُبھارا۔

”کیا ہے اس شخص میں کہ پہلے میں نادانستگی میں اس کے عمر میں گرفتار ہوا اور اب ابو بھی۔۔۔“ وہ الجھن آمیز انداز میں اپنے ابو کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں کوئی تاثر نہیں تھا۔ بابر شاہ بات ختم کر کے دوبارہ واپسی کے لیے پلٹے۔ اور بہت آہستہ روی سے قدم اٹھاتے آفس سے نکل گئے۔ کاشف ان کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس سارے دورانیے میں وہ کبھی بابر شاہ کو اور کبھی فواد کو دیکھتا رہا ان کے تاثرات نوٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ بابر شاہ کے جانے کے بعد وہ بھی کندھے اچکا تاوار کی طرف چلا گیا۔ فواد اپنے ابو کے بارے میں سوچنے لگے۔

”کیا شناسائی ہو سکتی ہے ابو کی اس شخص سے۔ کیا زندگی میں پہلے کبھی یہ ملے ہیں؟“

اور دوسری طرف بابر شاہ کی سوچ بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ہتا نہیں کیا بات تھی وہ شخص انہیں کچھ شناسا لگا تھا۔ انہیں یاد نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے پہلے اسے کہاں دیکھا۔ ہتا نہیں دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ بعض چہرے یونہی شناسا اور مانوس سے نکلتے ہیں لیکن یہ بات تو طے تھی کہ اس شخص کو دیکھ کر بابر شاہ کے الجھے ہوئے ذہن کو ایک اور نئی الجھن مل گئی تھی۔



تھکے ہوئے پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اس کے وجود کا بوجھ سہار سکتے۔ وہ تقریباً خود کو گھسیٹتے

ہوئے کمرے تک لائی تھی۔ آراستہ و پیراستہ کمرہ، نادر و نایاب قیمتی چیزوں سے سجا اس کا یہ کمرہ۔ اگر کسی کو کہتی کہ اس کمرے میں اس کا دم گھٹتا ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتا۔ اگر وہ کہتی کہ اس کمرے میں رہنے سے بہتر وہ یہ سمجھتی ہے کہ چھوٹی سی جھونپڑی میں رہ لے تو سننے والا اسے بے وقوف گردانتا۔ لیکن حقیقت یہی تھی اسے یہ آسائش نہیں چاہئے تھی۔ یہ تھلیں، قالین، نرم گرم بستر، اٹلس و کھواب کے لمبوسات۔ ان میں سے کوئی چیز اس کے لیے کشش نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے کہ اس سب کے عوض اس کی روح اس کا وجود رہن تھا۔ اس کی ذات گروی تھی۔ اور جب آزادی کا احساس ختم ہو جائے تو بے خبر ہونے کا ہو چاہے تیلیوں کا۔ پرندے کے لیے زندگی سے عدم دلچسپی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ آزاد نہیں۔ قید ہے اور قید بھی ایسی کہ اسی بے خبری کے درد و یار سے سرکرا کر ایک نہ ایک دن اسے مرجانا ہے لیکن آزادی کا سانس اسے اب نصیب نہیں ہونا۔ اس کے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ آزادی۔ اور آزادی کی لطافتیں سب ہی کچھ ایک سہانا خواب تھیں۔ اسے لگتا تھا جہنم جہنم سے وہ اس بے خبری میں قید ہے۔ بھاری بھر کم لباس سے نجات پا کر اس نے بالکل سادہ سے کپڑے زیب تن کیے۔ زیورات کے نام پر جو بوجھ اٹھا رکھا تھا اس سے چھٹکارہ پایا چہرے پر مصنوعی حسن کے نشانات مٹائے۔

کتنی تہوں کے نیچے دب گئی ہے میری اصل شخصیت۔ اب تو آئینے میں خود کو دیکھ کر پہچان بھی نہیں پاتی کہ یہ میں ہوں یا کوئی اور ہے۔ دروازے پر کھٹکا ہوا اور اگلے ہی لمحے غلام عباس حسب معمول ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کھڑا تھا۔ یہ شخص اسے ہمیشہ حیران کر دیتا تھا۔ اس کے پل پل کی خبر رکھتا تھا۔

”آ جاؤ غلام عباس! وہاں کیوں کھڑے ہو۔“ وہ آگے آگیا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ سا نیڈ نیبل پر رکھ کر واپسی کے پلنا تو چاندنی نے اسے روک لیا۔

”غلام عباس! کچھ دیر بیٹھو گے نہیں۔“

”بی بی! روندے ہوئے پھول اکٹھا کرنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔ باقی جی اندھیرا کر دیں گی۔ ساری روشنیاں بجھا دیں گی تو میرے لیے بہت دشوار ہو جائے گا۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”تم کیا اندھیروں سے ڈرتے ہو غلام عباس۔“

”نہیں بی بی! اندھیروں سے کیا ڈرتا۔ غلام عباس ان اندھیروں میں ہی تو پل کر جوان ہوا ہے۔ روشنیاں چبھتی ہیں آنکھوں کو لیکن میں ان پھولوں پر ان بکھری ہوئی پتیوں پر کسی اور کے پاؤں برداشت نہیں کر سکتا جو آپ پر نچھاور کی جاتی ہیں۔“

”غلام عباس! یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس پڑخار راستے پر تم چل رہے ہو وہ کسی منزل کی طرف

نہیں جاتا۔ تم سفر جاری رکھے ہوئے ہو۔ بھلا اس میں تمہیں کیا حاصل ہوگا؟“

”بی بی! حاصل اور لا حاصل کی بحث میں پڑتا ہی کون ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ سفر میں رہنے ہی میں اطمینان قلب ہے۔ اور پھر ہر مسافر کو منزل کہاں ملتی ہے۔ کچھ تو مسافت کی دھول میں ہی گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سو میں نے منزل پانے کی ہوس اپنے دل میں بیدار ہی نہیں ہونے دی۔ مسافت کو چن لیا۔“

”یہ بہت مشکل نہیں۔ اکیلے زندگی بھر کی مسافت۔“ چاندنی غلام عباس کی باتوں پر غور کرتے ہوئے بولی۔

”اکیلا کب ہوں میں۔ آپ بھی تو ساتھ ہیں۔ راستے الگ ہیں تو کیا ہوا۔ ہمسفر نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ آپ بھی مسافر میں بھی مسافر۔ نہ میری کوئی منزل نہ آپ کی کوئی منزل اور جب ہم دونوں ہی مسافت میں ہیں تو پھر نہ میں اکیلا ہوں نہ آپ تنہا ہیں۔“

”غلام عباس! کبھی کبھی تم مجھے حیران کر دیتے ہو۔ اس ماحول اس جگہ کے باہی نہیں نکلتے۔ مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے تمہاری کوئی اور دنیا ہے۔ تم کہیں اور سے آئے ہو۔ اس ماحول سے یکسر نامانوس اور اجنبی۔ تمہاری باتیں۔ تمہاری سوچیں اتنی الگ کیوں ہیں۔“

”ہاں نہیں بی بی! نہیں جانتا۔ پر میں الگ کہاں ہوں۔ ایک طوائف کی کوکھ سے جنم لیا ہے میں نے۔ آج تک طوائفوں کی کمائی ہوئی روٹی کھائی ہے۔ میں ان ہی میں سے ہوں۔ میرا اصل یہی ہے۔“ اس کے کرب انگیز لہجے میں سچائی کھنی ہوئی تھی۔

”غلام عباس! تم یہاں رہتے ضرور ہو لیکن تمہارا من، تمہاری روح یہاں نہیں رہتا چاہتی۔ تمہارے پیروں میں تو بیڑیاں نہیں ہیں۔ تم تو مرد ہو۔ آزاد۔ خود مختار اپنی مرضی کے مالک۔ تم تو اس عقوبت خانے سے نکل سکتے ہو۔ پھر کیوں نہیں چلے جاتے۔“

”کہاں جاؤں۔ میرے پیروں میں بیڑیاں نہیں۔ میرے ہاتھوں میں سسنگل نہیں لیکن بی بی! ایک آن دیکھی قید میں ہوں میں۔ میں آزاد کہاں ہوں۔ پرکاش کر پرندے کو کھلی فضا میں چھوڑ کر یہ سمجھ لینا کہ وہ آزاد ہے محض خود فریبی ہے اور کچھ نہیں اور میں ایسا ہی ایک چمچمی ہوں۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”بی بی! اس چار دیواری سے باہر کی دنیا بہت ظالم ہے۔ بدمصوں کی طرح اپنوں کا گوشت نوج نوج کر گھانے والی۔ یہاں سب اپنی مرضی سے کہتے ہیں لیکن باہر کی دنیا میں نہ خریدار ہے نہ دکاندار۔ وہاں تو لوٹ مار ہوتی ہے اور بس۔ آپ کا یہ غلام عباس لٹ نہیں سکتا۔ اس کے کاسے دل میں بس چند سکے ہیں اور یہ ریزگاری اسے اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔ میں نے سبیں پڑے رہنا ہے بی بی!

عبادت کا پہلا اصول یہی ہے کہ ایک بار جس در پر ہاتھ ٹیک دیا پھر مرجانا ہے وہ در نہیں چھوڑنا۔“
 غلام عباس تم کیا کہہ رہے ہو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ چاندنی کو واقعی اس کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔

”سمجھ جائیں گی بی بی! آپ بھی سمجھ جائیں گی۔ جس استاد سے میں نے سبق لیا ہے کبھی تو اس کی نظر کرم آپ پر بھی ہوگی۔ سب مفہوم واضح ہو جائیں گے۔ ہر بات سمجھ آنے لگے گی۔ پھر آپ غلام عباس کا ان کہا بھی سمجھنے لگ جائیں گی اور مجھے اسی دن کا انتظار ہے۔ اس انتظار کی مسافت کے عوض جتنے کانٹے میرے پیروں میں جھیں گے میرے اندر اور صبر آتا جائے گا۔ وہ کانٹے پھول سمجھ کر میں دامن میں بھرتا رہوں گا۔“

غلام عباس بات کھل کر کے کمرے سے نکل گیا اور چاندنی حیرت کے عالم میں دروازے کے سامنے لگے پردے کو ہٹا دیکھ رہی تھی۔



رات اپنی تمام تر لہیا ہی کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی ایک پل کے لیے بھی بابر شاہ کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئی تھیں۔ بہت سارے مسائل کسی عفریت کی طرح منہ پھاڑے ان کے سامنے کھڑے تھے۔ فواد کے کلینک میں جس شخص کو انہوں نے آج دیکھا تھا۔ اس نے انہیں ایک نئی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بار بار ذہن سے جھٹکنے کے باوجود اس کا چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ بار بار تخیل کے پردے پر وہ چہرہ انہیں کیوں دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ انہیں یاد نہیں آ رہا تھا لیکن اس چہرے کے شکست خوردہ نقوش انہیں شناسا لگ رہے تھے۔ کوئی سوچ ان کے ذہن میں سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے وہ کسی سوچ میں گم تھے۔ اسی وقت زاہدہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ بابر شاہ کے چہرے پر مثبت پریشانی انہوں نے آتے ہی محسوس کر لی تھی۔

انہوں نے ناشتے کی ٹرے ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔ بابر شاہ کی نیند سے عاری سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں زاہدہ بیگم کی طرف انہیں۔ تردد اور پریشانی نے جیسے انہیں ایک ہی رات میں بیمار کر کے رکھ دیا تھا۔

”زاہدہ۔۔۔ ناشتہ نہیں کرنا فی الحال سڑوگ سی چائے کا ایک کپ چاہئے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو۔۔۔“

”تکلیف کی کیا بات ہے۔۔۔ ابھی بتائے دیتی ہوں۔۔۔“ انہوں نے کہا اور ٹرے اٹھانے لگیں تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ کدھر جا رہے ہیں۔۔۔“ ان کی کیفیت کو سمجھنے کے باوجود زاہدہ بیگم نے کسی قسم کا استفسار مناسب نہیں سمجھا۔

”ان میں جا کر بیٹھتا ہوں۔۔۔ پتا نہیں کیا بات ہے کمرے کی فضا میں دم گھٹ رہا ہے۔“ وہ لہتے ہوئے باہر چلے گئے۔ صبح لان میں بالکل خاموشی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی وہ لان چیمبر پر بیٹھ گئے۔ ذہن کے تمام گوشے حالات کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کی تک و دو میں لگے ہوئے تھے۔ پریشانی اور تفکر کی عمیق لکیروں کا جال سا پیشانی پر پھیلا ہوا تھا۔ اسی پل رویہ انہیں اپنے پورٹن سے نکل کر ان کے حصے کی جانب بڑھتی دکھائی دی۔ اس نے دروازے میں سے اندر جھانک کر آریان کو آواز دی اور ایک دو منٹ کے بعد آریان بھی اس کے ہمراہ تھی۔ غالباً وہ دونوں سکول جا رہی تھیں۔

جس جگہ وہ بیٹھے ہوئے تھے ان دونوں کو وہاں سے گزر کر جانا تھا۔ سوان کے قریب آتے ہی دونوں نے سلام کیا۔

”ولیکم اسلام۔ سکول جا رہی ہو۔۔۔“ انہوں نے بریکمیل تذکرہ پوچھا۔

”جی انکل۔“ آریان نے جواب دیا۔

”بیٹا! بہت احتیاط اور دھیان سے جایا کرو۔ آج کل بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”جی۔۔۔“ وہ اثبات میں جواب دیتی گیٹ کی طرف چل پڑیں۔ بابر شاہ کی نگاہیں آریان کے سر پر تھیں اور ذہن کی سوئی ہر جھنجھٹ سے ہٹ کر آریان پر آ گئی۔ پتا نہیں کیا بات تھی بابر شاہ کو اس بچی سے عجیب سی انسیت ہو گئی تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ۔ اس کا سلیقہ، حسن صورت، حسن سیرت۔ کوئی بھی تو ایسا پہلو نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ طوائف زاوی یا کوٹھے کی پیداوار نظر آتی۔ اس کی روشن پیشانی، حیا سے جھکی ہلکیں، معصوم پاکیزہ چہرہ اور بھولپن اس کے خاندانی ہونے کی دلیل تھی۔ انہوں نے اسے اپنی بیٹی کہا تھا۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے مستقبل کی ذمہ داری بھی انہوں نے اٹھالی تھی۔ انہوں نے ایک باپ بن کر اسے رخصت کرنا تھا اور ایک بیٹی کی طرح اس کے سارے چاؤ پورے کرنے تھے لیکن کیا کوئی اتنا اعلیٰ ظرف ہوگا کہ اس بچی کو اس کے داغدار ماضی سمیت قبول کر لے؟ جب سے وہ اسے اپنے پورٹن میں لے کر آئے تھے اس کی ذات کے جوہر تو اب ان کے سامنے کھلے تھے۔ اس کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور صحرا کے مندر میں بچنے والی گھنٹیوں جیسی آواز انہیں بہت بری طرح کسی کی یاد دلا گئی تھی۔ اس کا مضبوط کردار، سکھڑا پا اور اس کی شخصیت کا سلجھاؤ۔ ہر چیز ہی انہیں اچھی لگی تھی۔ انہوں نے اب تک آریان میں کوئی برائی نہیں دیکھی تھی جو قابل گرفت و قابل مذمت ہوتی۔

آریان کے لیے شریک زندگی چننے وقت انہیں از حد خیال رکھنا ہوگا کہ اب تک کی محرومیوں بھری

زندگی کے بعد آئندہ کوئی محرومی اس کے حصے میں نہ آئے۔۔۔۔۔ ان کے ذہن میں فواد شاہ کا بھرپور سراپا در آیا۔ ان کی لودیتی آنکھوں کی ہلکی سی چمک بابر شاہ نے دیکھی تھی لیکن ابھی وہ پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے تھے۔۔۔۔۔ ہاں البتہ آریان کو اگر اس نگاہ سے دیکھا جاتا تو وہ ہر لحاظ سے ان کے معیار پر پوری اترتی تھی۔۔۔۔۔ ”جی تو میں اسے کہہ ہی چکا ہوں تو پھر مستقل بنی بنانے میں کیا ہرج ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس سے پہلے اس کی ماں کو یہاں موجود ہونا چاہئے۔ اس کو عذاب سے نکالنا ضروری ہے۔۔۔۔۔“ ایس۔ پی صاحب سے ملاقات کے بعد بابر شاہ کافی پریشان تھے کیونکہ جن ستر سو بھجوں کا ذکر ایس۔ پی نے ان کے سامنے کیا تھا انہیں حل کرنا قدرے مشکل تھا۔

”کن سوچوں میں گم ہیں۔۔۔۔۔ چائے لیں۔“ زاہدہ بیگم چائے کا کپ لیے قریب ہی کھڑی تھیں۔ سوچوں کے گرداب میں پھنس کر وہ ارد گرد سے بالکل ہی بے خبر ہو گئے تھے۔ انہوں نے کپ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن وہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ وجہ بہت معقول تھی۔ آریان اور روبیہ جنہیں ابھی سکول گئے پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے وہ دونوں انتہائی گھبرائی ہوئی حالت میں گیٹ سے داخل ہوئی تھیں۔ زاہدہ بیگم اور بابر شاہ دونوں ہی ان کی حالت دیکھ کر چونک گئے تھے۔ آریان کا تو گھبراہٹ کے مارے اس قدر برا حال تھا کہ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ حلق خشک اور آنکھیں بالکل بنجر سی لگ رہی تھیں۔ چہرے کا رنگ ہلکی سی طرح پیلا پھلک ہو رہا تھا۔ جبکہ روبیہ قدرے حواسوں میں تھی۔ زاہدہ بیگم نے آریان کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھایا۔

”کیا بات ہے؟ کیا ہوا۔۔۔۔۔ اور اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔۔۔۔۔“ انہوں نے پوچھا۔
 ”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ باہر۔۔۔۔۔“ آریان کی زبان اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ بہادر ہونے میں اور بہادر کہنے میں کس قدر فرق ہوتا ہے آریان کو آج اچھی طرح سمجھ آ رہا تھا۔
 ”کیا ہے باہر۔۔۔۔۔“ بابر شاہ کچھ کچھ گئے تھے لیکن پھر بھی کنفرم کرنا چاہتے تھے۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ باہر پان والی دکان پر۔۔۔۔۔ دونوں۔۔۔۔۔ دونوں کتے بیٹھے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔“ آریان کوشش کے باوجود اپنی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ پر قابو نہیں پاسکی تھی۔ بابر شاہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں جی۔۔۔۔۔ نہ جائیں باہر۔۔۔۔۔ لعنت ڈالیں ان پر۔۔۔۔۔“ زاہدہ بیگم ایک ہی سانس میں بولے چلی گئیں۔

”زاہدہ بیگم! تم کبھی عقل سے کام نہ لیتا۔۔۔۔۔“ بابر شاہ دانت پیستے ہوئے کونٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔۔۔۔۔ وہ سب بھی ان کے ہمراہ ہی آ گئے۔۔۔۔۔ بابر شاہ نے لاؤنج میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور کچھ نمبر پر لیس کیے۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ایس۔ پی کا مران صاحب سے بات کرائیں۔“ دوسری جانب سے ریسیور اٹھائے جانے پر انہوں نے کہا۔ کچھ لمحے یونہی سرک گئے غالباً ایس۔ پی کا ریڈر انفارم کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ریسیور سے آواز ابھری۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ایس۔ پی صاحب میں بابر شاہ بات کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“ بابر شاہ نے اپنا تعارف کرایا۔
 ”جی جناب! کیا حال چال ہیں آپ کے۔۔۔۔۔“ ایس۔ پی خوشگوار لہجے میں بولے۔
 ”بالکل ٹھیک ٹھاک۔۔۔۔۔ کل جس سلسلے میں آپ سے ملا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ تفصیل مزید ہے۔“

”جی فرمائیں میں سن رہا ہوں۔“
 ”جن بد معاشوں کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا وہ اس وقت ہماری گلی کی ہی ایک دکان پر موجود ہیں۔۔۔۔۔“ بابر شاہ نے اطلاع بہم پہنچائی۔
 ”ذرا حلیے تو بتادیں ان کے۔۔۔۔۔“ ایس۔ پی نے پوچھا تو بابر شاہ نے روبیہ کے بتائے ہوئے حلیے ان کے گوش گزار کر دیئے۔

آپ فکر مت کریں۔۔۔۔۔ میں ابھی تھانے فون کر دیتا ہوں۔“ ایس۔ پی نے کہا۔
 ”بہت بہت شکریہ آپ کا۔۔۔۔۔“

”بابر صاحب! غیریت مت برتنے۔ ہمارا آپ کا تو بڑا اچھا ساتھ ہے۔“ ایس۔ پی مسکراتے لہجے میں بولے۔ بابر شاہ نے بھی ایک دو باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔
 ”چاچو! کیا کھڑے تھے ایس۔ پی صاحب!“ روبیہ ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ان سے مخاطب تھی۔

”اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایس۔ پی صاحب خود اس معاملے کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ وہ واپس لان میں آ گئے۔

”ویسے آریان بیٹا۔۔۔۔۔ اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو ذرا تفصیل سے اپنے بارے میں آگاہ کریں۔ اپنے والد اور والدہ کے بارے میں۔ تاکہ اس وقت آپ جن لوگوں کے چنگل میں ہیں۔ ان لوگوں پر پکا ہاتھ ڈالا جاسکے۔“ بابر شاہ آریان سے بہت نرم لہجے میں بولے۔

”انکل میرا ماضی کیا تھا میں بتا چکی ہوں۔ ایک طوائف نے مجھے جنم دیا۔۔۔۔۔ باپ کون ہے۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔ ماں کے پاس ایک شکتہ سا کاغذ ہے جس پر ایجاب و قبول کی ایک رسمی سی کارروائی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس شخص کا نام میرے سارے سرٹیفکیٹس پر درج ہے لیکن وہ کیسا ہے میں نہیں جانتی۔ میں نے آج تک اسے دیکھا نہیں۔“ آریان کے لہجے میں درد و کرمیں لیے لگا۔

”ہوں۔ نوے فی صد لوگوں کی طرح گناہ کر کے منہ چھپانے والوں میں سے.....“
 ”نہیں انکل..... اس شخص نے باقاعدہ نکاح کیا تھا امی سے..... لیکن پھر جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ انہیں یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا اور اس کے بعد آج تک پلٹ کر نہ دیکھا..... شاید دنیا سے ڈر گیا۔“

”آریان! ستارہ بیگم کے ہاتھ کیسے لگیں تم.....“ روبہ نے سوال کیا۔

”یہ میری بد قسمتی ہے..... میں اور کیا کہوں اس بارے میں۔ ماں سے محبت کرنا مہنگا پڑا مجھے..... امی کے منع کرنے کے باوجود میں لاہور ان کی جائے رہائش پر پہنچ گئی تھی۔ سات سال سے اٹھارہ سال کی عمر تک بورڈنگ میں رہنے والے بچے کو ایک گھر کے تصور کی کس قدر طمأنینہ اور خوشی محسوس ہو سکتی ہے شاید کوئی نہ سمجھ سکے۔ بارہ سال ماں سے الگ رہی تھی میں۔ اور..... ستارہ بیگم نے بس ایک نگاہ مجھ پر ڈالی..... لیکن اس ایک نگاہ کے بعد میں آزادی کو ترس گئی۔“ آریان پر تپت اپنی ذات کے راز کھول رہی تھی۔

”یہ ستارہ بیگم کس قسم کی ذہنیت رکھتی ہے۔“ بابر شاہ نے پوچھا۔

”وہی ہی ذہنیت رکھتی ہے جیسی ہر کامیاب و حندا کرنے والی بائی کی ہو سکتی ہے۔ وہ خود کو کہا کرتی تھی ستارہ بیگم ولد پیسہ..... اسے بس پیسے کی زبان سمجھ آتی ہے اور پیسے ہی کی بولی بولتی ہے وہ۔“ آریان کے لہجے میں نفرت اُڑا آئی۔

”آریان..... تم فوراً تمہاری امی دونوں ہی بے قصور ہیں۔ ناکردہ گناہوں کی سزا کا بھگتان تم کیوں بھگتو..... ہم ستارہ بیگم کے مطالبات پورے کریں گے..... تمہاری توجان چھوٹ ہی جائے گی لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ تمہاری مافی کو بھی ظلم کے چنگل سے چھڑایا جائے۔“ بابر شاہ مضبوط لہجے میں بولے۔
 اظہر چچا کسی کام سے باہر نکلے تو ان سب کو وہاں بیٹھا دیکھ کر وہ بھی وہیں آ گئے۔

”کیا ہو رہا ہے۔“ ان چیمز پر بیٹھے ہوئے انہوں نے بابر شاہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے پہلی ہی نظر میں ان کی پریشانی بھانپ لی تھی۔

”بس کچھ مسائل ہیں جن کے حل کی وجہ سے پریشان ہوں..... لیکن خیر.....“

”کچھ مجھے بھی تو بتائیں.....“ اظہر نے اصرار کیا تو بابر شاہ نے آریان سے متعلق ساری بات تفصیل سے بتادی۔

”ہوں.....“ اظہر نے پُر انداز میں ہلکا سا بھرا۔ ”بھائی مسئلے پریشان ہونے سے کبھی حل نہیں ہوتے..... پھر آپ تن قہما ہی ہر مسئلے کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے دہری پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے آپ کو..... بہر حال یہاں آپ ہرگز اکیلے نہیں ہیں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ مانا کے

انہیں بہت ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کا تدارک نہ کیا جاسکے..... انسان کرنے پر آئے تو کیا نہیں ہو سکتا۔“ اظہر چچا شروع سے ہی سٹیٹ فارورڈ قسم کے بندے تھے۔ مسئلے کی تہہ میں پہنچ جانا اور فوری اس کا حل نکال لینا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اس کے برعکس بابر چچا کی خاموش طبیعت کے باعث ان کے اندر فیصلہ کن قوت ارادی قدرے کم تھی۔ بس زندگی میں چند بار ایسا ہوا کہ وہ حالات کے سامنے ڈٹ گئے اور حالات کو ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

آریان، اظہر چچا اور بابر چچا کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ کسی قدر سکون کے لمحے میسر آئے تھے اسے ایک طویل عرصے کے بعد۔ زاہدہ چچی اور روبہ بیہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسی وقت صابرہ موبائل ہاتھ میں لیے ان کے قریب چلی آئی..... کال بابر شاہ کے لیے تھی..... انہوں نے موبائل کان سے لگا لیا۔ جیلو کے بعد وہ کچھ نہ بولے دوسری طرف کی بات سنتے رہے اور آخر میں شکر یہ کہہ کر موبائل آف کر دیا۔

”آریان! تمہاری ایک پریشانی تو ختم ہو گئی۔“ بابر چچا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب انکل؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

”اب گھبرانے کی ضرورت نہیں وہ دونوں پولیس کی حراست میں ہیں۔“ بابر چچا نے کہا۔

”فون کس کا تھا بھائی؟“ اظہر چچا نے پوچھا۔

”ایس۔ پی کا..... ابھی کچھ دیر پہلے میں نے انہیں فون کر کے اطلاع دی تھی کہ وہ دونوں غنڈے جو آریان کو تنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے فواد کے کلینک میں بھی کافی توڑ پھوڑ کی تھی ہماری گلی میں ہی ایک دکان پر موجود ہیں۔ ایس۔ پی صاحب کے فون پر تھانے کے عملے نے فوری ایکشن لیا اور انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔ خواہ مخواہ بچی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے منحوس مارے۔“ زاہدہ چچی اپنی لینگوئج میں بولیں۔ آریان نے بھی سکون کا سانس لیا۔

”آریان بیٹا..... تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا.....“ بابر شاہ نے کہا تو آریان سے پہلے اظہر چچا بول پڑے۔

”وہ کس سلسلے میں.....“

”ایس۔ پی صاحب سے ملنے کے لیے..... ان دونوں کے خلاف بیان دینا ہے آریان کو۔“

بابر چچا نے کہا۔

فواد تیار ہو کر باہر نکلے تو بابر چچا نے انہیں پکار لیا۔

”فہدی..... ایک منٹ.....“

”جی ابو..... وہ ٹائی کی ٹاٹ سیٹ کرتے ہوئے ان کے قریب چلے آئے۔“

”ایک منٹ تم ذرا بیٹھو..... آریاں جینا! تم ابھی سکول جاؤ۔ میں تمہیں سکول سے ہی پک کر لوں گا.....“

”وہ پہلے فواد سے اور پھر آریاں سے بولے۔ فواد کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آریاں اور روبیہ سکول جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔“

”بھائی! میں بھی جا رہا ہوں۔ ٹرک لوڈ کروانا ہے گندم سے۔ پرسوں سے مال یونہی پڑا ہوا ہے۔ ٹرک کی کچھ رینٹرنگ کروانی تھی۔ میں بس ایک گھنٹے میں آ جاؤں گا۔ پھر اس مسئلے پر بھی کچھ کرتے ہیں۔“

”انکھر چچا بھی اٹھ کر چلے گئے۔ زابدہ چچی بھی چائے کے برتن اٹھا کر اندر چلی گئیں۔“

”جی ابو..... کہیں.....“

”کلینک جا رہے ہو.....“

”جی ہاں.....“

”وہ تمہارے پیشہ عملی مریض کا کیا حال ہے؟“

”اب کچھ بہتر ہے..... میرا خیال ہے کہ اس کے لیے اب وہاں کی تہہ پٹی بہتر ثابت ہوگی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آج اسے کچھ سیر و تفریح کروادیں۔ کلینک پر تو آج عابد اور عامیہ کی ڈیوٹی ہے۔ ہفتے میں ایک دن وہ دونوں ہوتے ہیں۔ سو میں اور کاشف فارغ تھے تو سوچا..... کچھ چھینچ ہو جائے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر اٹھو چلیں.....“

”ہاں چچا کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔“

”آپ نے بھی کہیں جانا ہے.....“

”ہاں تمہارے ساتھ ہی جانا ہے۔“

”باہر بچا مسکرا کر بولے تو وہ کچھ حیران حیران سے گاڑی میں آ بیٹھے لیکن بولے کچھ نہیں۔“

”کلینک پہنچ کر انہوں نے کاشف کو پروگرام سے آگاہ کیا۔“

”لیکن تمہارا وہ معصوم، بے ضرر مریض تو سو رہا ہے.....“

”کوئی بات نہیں ابھی جاگ جائے گا۔“

”کہاں لے جاؤ گے اسے۔“

”مارگڈ بلز.....“

”فواد نے جواب دیا۔“

”یقین ہو گیا..... تم اپنے ساتھ ساتھ میرا بھی رگڑا لگوا کر رہو گے.....“

”کاشف مصنوعی تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔“

”کچھ نہیں ہوتا۔ تم تو بزدلی میں لڑکیوں کو بھی پیچھے چھوڑ رہے ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض

ہے کہ ابو بھی میرے ساتھ جا رہے ہیں تم اور میں ہی نہیں ہیں۔“

”سر جی! وہ بابا جاگ گیا ہے..... ناشتہ بھی آرام سے کر لیا ہے اس نے۔“

”نرس سلمیٰ نے اندر آ کر بتایا تو فواد کاشف کو ہمراہ لے کر اس کے کمرے میں چلے گئے۔ واقعی وہ بہت خاموش اور تہذیب یافتہ

انسان نظر آ رہا تھا۔ کسی قسم کی حرکت کیے بغیر وہ خاموشی سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔“

”میں جاؤں گا..... میں نے جانا ہے۔“

”وہ سرگوشی والے انداز میں بولا۔“

”یار فواد! یہ تمہیں دیکھتے ہی کہاں جانے کی ضد شروع کر دیتا ہے۔“

”کاشف بولا۔“

”بابا..... کہاں جانا ہے آپ نے.....“

”فواد بہت نرم لہجے میں بولے۔“

”میں جاؤں گا..... میں نے جانا ہے.....“

”ٹھیک ہے بابا آپ کو لے چلوں گا..... لیکن ایک شرط کہ آپ شور نہیں کریں گے۔“

”فواد نے کہا۔“

”شور..... نہیں کروں گا!“

”وہ فواد کو اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے گھورتا ہوا اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں بولا۔“

”ہاں..... اگر آپ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کریں تو آپ کو لے چلوں گا۔“

”نہیں کرتا..... لے چلو گے.....“

”وہ جھٹکے سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک درآئی۔“

”ہاں بالکل..... لے چلوں گا.....“

”لے چلو گے.....“

”ہاں بابا لے چلوں گا..... اب انھیں.....“

”فواد نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں کو زنجیروں سے آزاد کر لیا۔ زنجیروں کے نشان اس کے پیروں پر اس بری طرح بنے ہوئے تھے جیسے وہ اس کے پیروں

میں ہی کھپ گئی تھیں۔“

”انھوں.....“

”ہاں جی..... انھیں.....“

”لواٹھا.....“

”وہ ایک جھٹکے سے بیڈ پر سے اٹھا لیکن لڑکھڑا گیا۔ کافی دنوں سے اس نے زمین پر

پاؤں نہیں رکھا تھا۔ زنجیروں کی وجہ سے بھی پیروں میں خون کی گردش جیسے بہت کم رہی ہوگی۔ اسی لیے

اس کے پیروں کا بو جھنپٹا تھا۔ فواد نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔“

”چلیں.....“

”انہوں نے کاشف کو اور اسے مخاطب کیا۔“

”چلو.....“

”اس نے خوشی سے کہا۔ پتا نہیں کیوں فواد کو اس کا اس طرح مسکرانا بہت اچھا لگا۔ باہر

چچا نے ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے انہیں آتے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کلینک سے باہر آ کر

فواد نے اس کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور کاشف کو اس کے ہمراہ بیٹھنے کو کہا۔

”یار! تمہارے کہنے پر میں بیٹھ جاؤں گا۔ پر میری زندگی اور موت کے ذمہ دار تم ہی ہو گے۔“
کاشف ناراضگی سے بولا۔

”نکو اس نہ کرو اور چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ کھا نہیں جائے گا وہ تمہیں۔“ فواد کے کہنے پر وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ باہر شاہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے اور فواد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی کلینک سے نکال کر مین روڈ پر ڈال دی۔

”ابو! وہ دونوں تو گرفتار ہو گئے جن کی وجہ سے پچھلے دنوں کافی ٹینشن رہی لیکن مکمل طور پر اطمینان والی بات نہیں ہے ابھی۔ آریان کے اصل دعویداروں کے علم میں جیسے ہی یہ بات آئے گی وہ وسیع پیمانے پر اس کی بازیابی کے لیے کوشش کریں گے۔“ فواد نے کہا۔

”ہاں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ مسئلہ فی الوقت ٹل ضرور گیا ہے لیکن حل نہیں ہوا۔ اسی سلسلے میں آج ایس۔ پی سے ملنا ہے مجھے۔ آریان کا بیان بھی ہو جائے گا اور اس کی زبانی ستارہ بیگم کے بارے میں معلومات بھی مل جائیں گی۔ ایس۔ پی کا مران کا پتہ آزاد بھائی لاہور میں ایس۔ پی کے عہدے پر تعینات ہے۔ یقیناً اس وجہ سے بھی وہ ہماری خبر کرے گا۔ مجھے سو فیصد امید ہے کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ باہر چچا پر خیال انداز میں بولے۔

وہ دونوں آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور کاشف خاموش بیٹھا گاڑی کے شیشے سے باہر جھانک رہا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا شخص خلاف توقع رویے کا اظہار کر رہا تھا۔ یعنی شیشے میں سے باہر بھاگتی ہوئی گاڑیوں اور لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے ہنس رہا تھا۔

مارگلہ لٹر پر جانے والی سڑک پر ٹرن لیتے ہی وہ قدرے خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ وہاں پہنچ کر گاڑی روک کر فواد نے اس کی طرف والا دروازہ کھول دیا۔

”آئیں بابا۔۔۔ باہر آ جائیں۔۔۔“

”باہر آ جاؤں۔۔۔“ وہ جھٹکے سے بولا۔

”جی ہاں۔۔۔“ فواد نے کہا تو وہ گاڑی سے اتر آیا۔

”بابا۔۔۔ دیکھیں کتنی خوبصورت جگہ ہے آپ اب گھومیں پھریں۔“ فواد نے اس سے بات کرنے کے بعد کاشف کو اس پر نظر رکھنے کو کہا اور خود باہر چچا کے ہمراہ نسبتاً ہٹ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ان کی نظروں کا مرکز صرف وہی ذات تھی۔ اور وہ حیران تھے کہ وہ جو تمام راست خوشی سے قلقاریاں مارتا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر بالکل چپ ہو گیا تھا اور چاروں طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی یا پسندیدگی کے بجائے کچھ بیجان سا محسوس ہو رہا تھا۔ کاشف اور وہ

دیر سے دیر سے چلتے ان کے قریب آ گئے۔

”یار فواد! تم اس کو یوں تارل لوگوں کی طرح آزادمت چھوڑو۔۔۔۔۔ یہ کسی ہل نظر بچا کر بھاگ بھی سکتا ہے۔“ کاشف نے کہا۔

”نہیں بھاگے گا۔ تمہیں کس لیے کہا ہے کہ اس پر نظر رکھو۔۔۔ اتنی جان تو ہوگی کہ اسے بھاگتے دیکھ کر قابو کر سکو۔“

”تم نے کیا مجھے جھارا پہلوان سمجھ رکھا ہے۔ ہاں بھی ہے کہ دورے کی حالت میں جس آدمیوں بتنی طاقت آ جاتی ہے اس میں۔ میں نخعی سی جان اکیلا کہاں اسے قابو کر سکوں گا۔“ کاشف کا کہنا بھی درست ہی تھا اس کا تجربہ چند دن پہلے انہیں ہو چکا تھا۔ وہ باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے۔

”میں جاؤں گا۔۔۔ مجھے جانا ہے۔۔۔ چلو۔۔۔ لے چلو۔۔۔“

”لو! اب موصوف اور کہیں جانے کو پر تول رہے ہیں۔ تمہاری اس فیاضی کا بھی موصوف کے دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔“

”فیاضی۔۔۔“ ایک لفظ کچھ جانا پہچانا سا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شدید غصے سے اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

”فیاض۔۔۔ فیاض۔۔۔“ اس نے کاشف کو گریبان سے پکڑ لیا اور تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ فیاض۔۔۔ فیاض۔۔۔“ وہ بری طرح کاشف سے چٹا ہوا تھا۔ کاشف بے چارہ تو اس افتاد پر بوکھلا کر رہ گیا۔ جبکہ فواد اور باہر شاہ بھی حیران پریشان سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید ماضی کے تہہ خانے میں یاد کا کوئی روزن کھلا تھا، کوئی کرن چمکی تھی لیکن وہ صرف فواد کے لیے تھی۔ خود اس کے دماغ کو تشنگ کے جھٹکے سے لگنے لگے تھے۔

”فیاض۔۔۔ لے چلو۔۔۔ فیاض۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ جانا ہے۔۔۔“ اس پر آہستہ آہستہ دورے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ باہر شاہ بہت غور سے اس کو دیکھ رہے تھے۔ فواد اور کاشف دونوں ہی اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کے حلق سے واشگاف جھنجھیں بلند ہونے لگیں۔ آنکھیں حلقوں سے ابل کر باہر آ گئی تھیں اور پتلیاں پھیل چکی تھیں۔ چہرے اور گردن کی رگیں ابھر آئیں۔ اس کے عضلات عجیب سے تناؤ کھنچاؤ کا شکار ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ آہستہ آہستہ اس کی جھنجھیں بند ہو گئیں اور حلق سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی ذبح شدہ جانور کرب کے عالم میں ڈکار رہا ہو اور وہ بھرہ بھرہ ہو کر ان دونوں کے ہاڑوؤں میں ہی اڑھلک گیا۔

وہاں رکنا اب بیکار ہی تھا۔ جس کے لیے وہ یہاں آئے تھے وہ تو دنیا و مانیہا سے بے خبر ہو گیا

تھا۔ بمشکل تمام اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فواد نے پہلے باہر شاہ کو گھر پر ڈراپ کیا اور خود کاشف کے ہمراہ پکینک آگئے۔ ایمر جنسی وارڈ میں اس کو خصوصی ٹریٹمنٹ دی جانے لگی۔



لبے بالوں کے ننھے ننھے منتھکروں میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ سفید سادہ ساڑھی میں ملبوس وہ اکیلی بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”بی بی!۔۔۔ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟“ غلام عباس اسے یوں بیٹھے دیکھ کر قریب چلا آیا۔

”خالی ہاتھ جو رہ گئی ہوں۔“ اس نے جیسے عام سے لہجے میں کہا۔

”نہ بی بی!۔۔۔ ایسے نہ کہیں۔۔۔ آپ تو دان کرنے والوں میں سے ہیں۔ آپ کے ہاتھ کیسے خالی ہو سکتے ہیں۔“

”ارے غلام عباس! مجھ جیسے لوگ کسی کو کیا دے سکتے ہیں سوائے دکھوں کے۔۔۔ ساری ریاضت خاک میں مل گئی۔۔۔ برسوں کی اذیت سہنے کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوا۔“ وہ خود کھائی کے سے انداز میں بولی۔

”غلام عباس! جب ساری زندگی چلتے چلتے پاؤں زخمی ہو جائیں، روح میں تھکان اتر آئے اور بعد میں پتا چلے کہ جو اٹا شہ جو زور اور اساتھ لے کر چلے تھے وہ تو کوئی نقیب زن بے خبری میں لے آئے۔ تو اس وقت کیا ہوتا ہے۔“

”بی بی! میں تو خود زندگی بھر سفر میں رہا۔۔۔ چلتا رہا اور پاؤں زخمی ہوتے رہے۔ وجود پر ٹھکن ایسے ہے جیسے زخم پر کھرنڈ۔۔۔ پر مجھ میں اور آپ میں فرق ہے بی بی!۔۔۔ میں جب سفر کے لیے نکلتا تھا تو خالی ہاتھ تھا۔۔۔ میرے پاس زاد سفر نہیں تھا۔ اس لیے میں لٹنے کے کرب سے ناواقف ہوں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ایک مسافر کے لیے زور اور اکتاف ضروری ہوتا ہے۔“

”غلام حسین! اندر زخموں نے کراہٹ مچا رکھی ہے۔۔۔ میں ختم ہوتی جا رہی ہوں۔ کیا میرا گناہ اتنا بڑا تھا کہ جس کی سزا ساری زندگی پر محیط ہو جائے۔ دیکھو اب تو۔۔۔ اب تو میرے بالوں میں پانندی کے تار بھلے لگے ہیں۔۔۔ اب تو میرے چہرے کی رعتائی بھی دم توڑتی جا رہی ہے۔ اس سن کے پیچھے تو دیوانے تھے ناں سب۔۔۔ پھر اب، اب میری مسلسل سزا ختم کیوں نہیں ہو رہی؟“

”بی بی!۔۔۔ آپ نے کون سا گناہ کیا ہے۔ یوں خود کو موت برا کہیں۔۔۔ کبھی کبھی قدرت ہمارے لیے بڑے عجیب فیصلے کرتی ہے اور ہمیں تمام عمر ان فیصلوں کے آگے بے زبان بن کر سر جھکنا پڑتا ہے۔“

”میں احتجاج کا کوئی حق نہیں دیا جاتا۔ اور آپ اور میں انہی لوگوں میں سے ہیں۔“

”نہیں غلام عباس! تم نہیں جانتے۔۔۔ میرا گناہ بہت بڑا ہے۔ میں نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر خدائے وحدہ لا شریک سے معافی مانگی۔۔۔ انہی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے گناہ کی اس سیاح کو دھونے کی کوشش کرتی رہی لیکن ابھی کمی ہے۔ ابھی اور ریاضت چاہئے۔ اور میں۔۔۔ میں نوٹ بجی ہوں۔۔۔ چاندنی کا بکھرالہ غلام عباس کے دل پر چمکے لگا رہا تھا۔

”بی بی! آج آپ کا حرف حرف مایوسی کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ غلام عباس ابھی زندہ ہے بی بی! آپ خدا کے بعد مجھ پر بھروسہ رکھیں۔“

”غلام عباس! تمہیں یاد ہے نا۔ کئی سال پہلے تم نے ایک بار کہا تھا کہ جس استاد سے تم نے سیکھ لیا ہے اس کی نظر کرم مجھ پر بھی ہوگی۔ تب میں تمہارا ان کہا بھی بھٹنے لگ جاؤں گی۔ کیا تمہیں آج بھی اس دن کا انتظار ہے۔“

”آپ کو اب تک یاد ہے بی بی!۔۔۔ وہ کچھ حیران ہو کر بولا۔

”ہاں غلام عباس! لیکن میں آج بھی سمجھ نہیں پاتی تمہارے ان جملوں کا مطلب اس وقت کیا تھا؟“

”آپ نے میرا انتظار کچھ اور بڑھا دیا بی بی! لیکن غلام عباس انتظار سے ٹھکنے والا نہیں ہے۔“

”مجھے بتاؤ تو کسی ان جملوں کا مطلب؟“

”ابھی وقت نہیں آیا بی بی! تھوڑا اور انتظار کریں۔“

”ارے منتھکرو! کہاں سر گیا رہے۔۔۔؟“ باہر سے آنے والی کرخت آواز نے ان دونوں کی محویت توڑ دی۔

”بی بی! زندگی بھر یہ منتھکرو بس دوسروں کی خاطر بچتا رہا۔ لیکن اس کی صدا میں چھپا درد کبھی کسی نے محسوس نہ کیا۔ پر آپ کی ہر کراہ غلام عباس کے دل پر لکھی ہے۔ بی بی! آپ فکر نہ کریں جس رب نے بیس سال اسے اپنی اماں بخشی آج بھی وہی رحیم و کریم اس کا حامی و ناصر رہے گا۔“

”اس کا کچھ پتہ چلا غلام عباس؟“ اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں آئی تو سمجھیں خیریت سے ہے۔ باقی کچھ دنوں میں میں خود چکر لگا کر آؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“ غلام عباس کہہ کر باہر بڑی بائی جی کی بات سننے چلا گیا۔

”پتا نہیں! کس حال میں ہوگی تم؟ ایک ایک لمحہ اذیت سے گزر رہا ہے تمہارے بغیر۔ خدا کرے کوئی تکلیف تمہیں چھو کر بھی نہ گزرے۔ تمہاری حراں نصیب ماں دعاؤں کے علاوہ اور کچھ بھی کیا سکتی ہے۔“ چاندنی خود سے ہم کلام تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی غلام عباس پر یا اس پر کسی کو شک نہیں

اس سے باتیں کرنے لگے۔

”اتفاق سے وہ بھی آج گھر پر موجود نہیں۔“ آریان سکرادی۔

”فواد تو ہے ناں گھر پر.....“ انہوں نے پوچھا۔

”جی غالباً ان کا آج ہاف ڈے تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی واپس آئے تھے شاید کھانا کھا کر سو رہے ہوں۔“

”کمال ہے! ہر ایک ہی اپنی مصروفیت میں پھنسا ہوا ہے کسی کو تمہارا خیال نہیں آیا۔“ باہر چچا متوقف لہجے میں بولتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی پل فواد لاؤنج میں آتے دکھائی دیئے۔

”اسلام علیکم ابو.....“ کیلے بالوں میں تولیہ رگڑتے وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”وعلیکم اسلام..... اچھا ہے تم خود ہی آگئے..... ورنہ میں اب تمہیں ہی بلانے جا رہا تھا۔“

”کیوں خیریت ابو.....“

”تمہیں خود تو احساس نہیں ہوتا..... کم سے کم میری مان لو اور آریان بیٹی کو کہیں گھمانے لے جاؤ.....“

”باہر چچا کے ذہن کے گوشے میں فواد کی پسندیدگی کا پوائنٹ موجود تھا۔ سودہ بڑی عیسٰی نظری سے ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آریان کے نام پر ایک ہلکا سا جگنو جوان کی آنکھ میں چمکا تھا۔ وہ

باہر چچا کی تیز نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ایک طمانیت سی انہوں نے اپنے دل میں اترتی محسوس کی۔

”لیکن انگل.....“ آریان ہچکچا رہی تھی۔

”بس اب خاموش..... جب سے آئی ہو..... آئے روز نئے نئے مسائل میں پڑ کر بہت اپ

سیٹ ہو گئی ہو۔ کچھ پیچھے ہو جائے تو اچھا ہے..... چلو فواد..... آریان کو لے جاؤ کہیں۔“

”ٹھیک ہے ابو میں لے چلتا ہوں لیکن ایس۔ پی سے ملاقات کے بارے میں آپ نے کچھ بتایا

ہی نہیں۔ اس کا کیا بتا؟ کیا کہتا ہے وہ.....؟“ فواد نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس میں کچھ مشکلات ہیں لیکن قابل حل ہیں..... کچھ دنوں تک جانا ہے لاہور..... ایس۔ پی

بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔“

”وہ کس لیے.....؟“

”وہ اس لیے کہ وہاں کا ایس۔ پی اس کا کزن ہے..... سو اس کے ہمارے ساتھ جانے کی وجہ

سے اس کی خصوصی اینشن ہمیں ملے گی۔“

”ہوں.....“ انہوں نے ہلکا سے ہنکارا بھرا۔ ”پہلے آریان..... اچھا ابویں آدھے کھنٹے تک

واپس آ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے جاؤ.....“ آریان کچھ جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ ہوئی۔ باہر چچا

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے جاؤ.....“ آریان کچھ جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ ہوئی۔ باہر چچا

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے جاؤ.....“ آریان کچھ جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ ہوئی۔ باہر چچا

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے جاؤ.....“ آریان کچھ جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ ہوئی۔ باہر چچا

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے جاؤ.....“ آریان کچھ جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ ہوئی۔ باہر چچا

کی گہری نگاہوں نے ان دونوں کے سراپے کا موازنہ کیا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

”اگر یہ دونوں ہمیشہ کے لیے یونہی ساتھ ساتھ رہیں تو اس میں کوئی ہرج تو نہیں۔“

بیٹے کی پسندیدگی تو انہوں نے محسوس کر لی تھی..... خود انہیں بھی آریان اس حیثیت سے اچھی لگی

تھی..... اور انہیں یقین تھا کہ زاہدہ بیگم کو بھی اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ اس دن، جب انہوں

نے بچوں کے سامنے باہر چچا کی ذات کو نامعتر کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ بہت بدل گئی تھیں۔ جب

شاید یہ تھی کہ انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ باہر شاہ کے ساتھ انہوں نے زیادتی کی ہے۔ زندگی بھر جس

شخص نے انہیں کسی کی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ان کا ہر حق ادا کیا۔ محبت پر اعتبار نہیں ہوتا لیکن جس نے

ان کے لیے، اپنے بچوں کے لیے محبت سے دستبرداری کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی شخص کو یوں سرعام نامعتر

کر دینا بہت بڑی زیادتی تھی۔ سودہ پہلے کی نسبت بہت خیال رکھنے لگ گئی تھیں باہر چچا کا۔ شاید اپنی

زیادتی کا ازالہ کرنے کے لیے۔

گازی گیٹ سے باہر نکال کر فواد نے اپنے بائیں جانب خاموش بیٹھی آریان کی طرف دیکھا۔

”آریان! کہاں چلیں.....؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جہاں آپ کا دل چاہے۔“ وہ یونہی سر جھکائے ہوئی۔

”میرا خیال ہے کہ کسی خاص جگہ پر جانے کی بجائے لاگ ڈرائیو بہتر رہے گی.....“ آریان نے

کوئی جواب نہ دیا۔ گازی کے شیشے سے باہر کا منظر انتہائی خوبصورت لگ رہا تھا۔ اسلام آباد کی صاف

ستھری سڑکیں آسمان پر چھائے ہوئے بادل۔ اچانک وڈ سکرین نئے نئے شبنم کے قطرے سے بھینکنے

لگی۔

”فٹاسٹک..... دیکھو! موسم کو بھی ہمارے ساتھ کتنی ہمدردی ہے۔“ فواد کا انداز بالکل نیا تھا۔

یوں جیسے بہت عرصے بعد اندر کا جس ختم ہو گیا تھا۔ باہر کی ٹھنڈی پھوار دھیرے دھیرے اندر کی ساری

کشافت کو صاف کر رہی تھی۔ جذبے نکھرنے لگے۔ یہ احساس کہ ان کے بے حد نزدیک بیٹھا یہ مہکتا وجود

ان کی ساری محبتوں، ساری وفاؤں کا حق دار ہے..... پیار کی نرمی سے اس کے وجود اور روح کا ہر زخم

انہوں نے ہی رفو کرنا ہے خود بخود نشہ سا بن کر ان کی آنکھوں میں سما گیا۔

”آریان! ایک بات پوچھوں؟“ انہوں نے بات شروع کی۔

”جی.....“ گھنیری چٹکیں اٹھا کر اس نے عجب قیامت خیز انداز میں ان کی طرف دیکھا تھا۔

”تم..... تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو.....؟“

”آپ کو جب بھی دیکھتی ہوں دل کرتا ہے آپ کو پکاروں..... آپ کی عزت کرنے میں جان

لڑا دوں۔ کبھی کبھی ہوتا ہے ناں آپ کسی کے بارے میں احرام اور عزت سے اتنا سوچتے ہیں۔ جتنا شاید اپنے بارے میں بھی وقت نہیں نکالنا چاہتے۔ مجھے آپ کے بارے میں عزت سے سوچنا، آپ کو عزت دینا بہت اچھا لگتا ہے۔“

”کمال ہے فواد میاں؟ تم تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھے تھے۔“ انہوں نے دھیمے سے لہجے میں خود سے کہتے ہوئے ہلکی سی چپت اپنے سر پر لگائی۔

”جی۔۔۔۔۔“ وہ حیران سی ہو کر بولی۔ ان کا کہا ہوا جملہ وہ ٹھیک سے سن نہیں پائی تھی۔
”آپ کے خیال میں آریان! آپ کے لیے جو کچھ میں اتنے عرصے سے کرتا آ رہا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟“ وہ تم سے آپ پر آگئے۔

”آپ نے جو کچھ بھی کیا میں اس کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔ بلکہ یہ لفظ اس کیفیت سے بہت کم ہے جو میں دل میں آپ کے لیے محسوس کرتی ہوں۔“ وہ ممنونیت سے بولی۔
”یعنی یہ سب کچھ جو میں نے کیا محض انسانی ہمدردی میں کیا۔ ایم آئی رائٹ۔۔۔۔۔“
”جی۔۔۔۔۔“ وہ سر ہٹا کر بولی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ یہ عجیب و غریب باتیں کیوں کر رہے ہیں۔

”کیا تم اپنا جیو۔ کوئی کمی ہے تمہاری ذات میں کہ تم سے ہمدردی کی جائے۔۔۔۔۔ یہ سب میں نے ہمدردی میں نہیں کیا۔۔۔۔۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“ وہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔
”پھر کا مفہوم سمجھا تو دوں مگر تمہاری ناراضگی کا ذریعہ۔“ وہ شریک سے لہجے میں بولے۔
آریان کو تو آج ان کی ایک بات حیرت زدہ کیے دے رہی تھی۔ فواد نے اس کی طرف دیکھا۔

”حیران مت ہو۔۔۔۔۔ کچھ لفظ کچھ باتیں قبل از وقت کہہ دی جائیں تو اپنی دلکشی کھود جتی ہیں۔ سو پھر کا مفہوم پھر کبھی سہی۔ میرا خیال ہے واپس چلنا چاہئے۔“ گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ آریان کو ان کی نگاہوں میں لکھے جذبے عجیب سی کیفیت کا شکار کر رہے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں دیکھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ فواد بھی اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ سوزِ یادہ ڈنرب کرنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اور واپس ہو لیے۔

کبھی کبھی انسان کا دل چاہتا ہے کہ سفر ختم ہی نہ ہو۔۔۔۔۔ راستے طویل ہوتے چلے جائیں۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب ہماری دل کے قریب تر ہو۔۔۔۔۔ دل ہمسفر کی رفاقت لمحوں کے بجائے

صدیوں پر محیط ہو جانے کی دعائیں کرتا رہا۔ سو اس وقت فواد کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ لفظ کسی آبشار کی صورت ان کے دل سے پھوٹ رہے تھے۔ انہیں ہونٹوں پر روک رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ ابھی محبت کی اوائل تھی۔۔۔۔۔ جذبوں کی تشنگان اس وقت بھلی لگتی ہے جب وہ کندن ہو چکے ہوں۔ وقت سے پہلے کوئی بھی بات کر دینا اس کی اہمیت کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔

اور آریان ان ان کے لفظوں کو کچھ نہ سمجھتی تھی۔۔۔۔۔ بھٹکی بھٹکی ہلکوں میں جس کا عکس سمٹ رہا تھا۔ پھیل رہا تھا۔ اس کے لہجے کی نزاکت کو وہ نہ سمجھتی تھی تو پھر کون سمجھتا۔ وہ زندگی۔۔۔۔۔ وہ زندگی کیسی تھی۔ جب فواد شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو محبت کے ٹھوم سے نا آشنا تھی۔ اس نے سوائے ماں کی محبت کے کسی اور محبت کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ نہ باپ کی رن بہن بھائیوں کی۔ جنگل کی اس البر ہوانے راستے کا تعین کر لیا تھا۔ وہ قفس زدہ ماحول سے نکل کر خنوبہ کی تلاش میں تھی جو اس کی روح کو شانت کر دے۔ محبت کے لمس سے نا آشنا رہی تھی۔ مگر محبت آمیز ہمدردیوں سے بے خبر ہرگز نہیں تھی۔ جس سے دل کے گلزار مہلک اٹھتے ہیں۔ اس کا دل عجیب اتھاہ میں ڈوبتا ہوا تھا۔

”آریان۔۔۔۔۔“ فواد نے اسے بہتر ہو سنے سے پکارا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔
ایک نظم سنیں۔۔۔۔۔ سنیں گی۔

”جی۔۔۔۔۔“ آریان کے کہنے پر ایک کمر لٹے کو فواد خاموش ہوئے۔ گاڑی اس وقت جس روڈ سے گزر رہی تھی وہ کوئی مصروف روڈ نہیں تھا۔ انہوں نے گاڑی کی رفتار بہت دھیمی کر دی۔ وینڈ سکرین پر نظریں جمائے کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بہتر سڑک اور کد زلجے میں بولنے لگے۔

چلو تم کو بتاتے ہیں
کہ تم کو دیکھ کر دل نے
کہا تم رشتہ جاں سے بھی بڑھ کر ہو
دعا کی سرحدوں پر
جو ادھوری ہے، مری ایسی تمنا ہو
میرے دل کا مقدر ہو
کہ تم اک روشنی بن کر، شفاء لے کر
کبھی دست میجا کی طرح
اترے ہوئے، ہر زخم دل پر ہو
چلو تم کو بتاتے ہیں
کہ تم ایماں ہمارا ہو

178

رہتا ہے۔ آج بھی بھاگ گیا۔ ٹھیک کا آدھا عملہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اتنی مشکل سے اسے ڈھونڈ کر قابو کر کے لائے۔ میں اس سے یہ پوچھ رہا تھا کہ کیا ہر سڑک پر پھرنے والے پاگل، بے سہارا کو یہ یونہی اٹھا اٹھا کر ٹھیک لائے گا؟ فضول کی دروسری کا کیا اس نے ہی ٹھیک لے رکھا ہے؟

”یار کاشف! اب تو وہ پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے۔ بات سمجھنے لگا ہے۔ بس کچھ وقت لگے گا اور وہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن اگر اسے ٹرینٹ دینے کی بجائے یونہی سڑکوں پر لوگوں کے حجر، ٹھنڈے، دھکار ملی تو پھر شاید وہ کبھی ٹھیک نہ ہو۔۔۔۔۔۔ بلکہ ممکن ہے کہ مزید خراب ہو جائے اور پھر اسے صحیح کرنا ناممکن ہو جائے۔“ فواد کاشف کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے لیے اس حد تک غصیلے انداز کے باوجود فواد بہت تحمل سے کام لے رہے تھے۔

”اب کہاں ہے وہ۔۔۔۔۔؟“ بابر شاہ نے سوال کیا۔

”کہاں ہوتا ہے موصوف نے۔۔۔۔۔ کسی بندر کی طرح کمرے میں باندھا ہوا ہے۔“ کاشف جلتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“ بابر شاہ نے پوچھا۔

”آئیں میں خود لے چلتا ہوں۔۔۔۔۔“ فواد کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بابر شاہ نے بھی اٹھ کر ان کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔ آریان اٹھنے لگی تو فواد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ”تم بیٹھو۔ ہم بس ابھی آتے ہیں۔“ انہوں نے کہا اور بابر شاہ کے ساتھ آفس کے دروازے سے نکل کر ملحقہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازے سے اندر آگے ہی انہیں وہ بیڈ پر دکھائی نہیں دیا تھا۔ زنجیروں سے باندھا ہوا تھا وہ لیکن بیڈ کے پائے کے ساتھ ٹیک لگائے نیچے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ گھٹنے سینے سے لگا کر ان کے گرد بازو جھانک کر کے ان پر سر رکھے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

”بابا۔۔۔۔۔“ فواد نے آہستگی سے پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا بدستور یونہی بازوؤں پر سر رکھے بیٹھا رہا۔

”بابا۔۔۔۔۔“ اب کی بار انہوں نے قدرے اونچی آواز میں پکارا تو اس نے بہت آہستگی سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی شکست خوردہ آنکھوں میں آنسو جھللا رہے تھے۔ فواد اور بابر شاہ بے چین ہوا تھے۔

”مرد ہو کر روتے ہو؟“ بابر شاہ کا یہ جملہ تلخ سی لیکن اس پر اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ اس نے محض نفی میں سر ہلایا یہ اور بات کہ چلوں پر ٹکے آنسو چھٹک کر اس کے گالوں کو بھگو نے لگے۔

”تو پھر یہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے اس کی بھیگی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

یہ آنسو کیوں نکل رہے ہیں؟

”اندر پانی بہت جمع ہو گیا ہے۔ آنسوؤں کے ذریعے ختم کر رہا ہوں۔ تاکہ پھر کبھی روؤں نہ۔“ بہت سلیقے سے اس نے جواب دیا۔ بابر شاہ اور فواد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”تم نیچے کیوں بیٹھے ہو۔۔۔۔۔ اوپر بیٹھو۔۔۔۔۔ اٹھو شاہاش۔“ بابر شاہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا لیکن اس نے بازو چھڑا لیا۔ کچھ دیر انہیں کھورتا رہا۔ عجیب سا انداز تھا اس کا۔

”آپ سید ہیں نا۔۔۔۔۔“ ان کے سوال کے جواب میں بجائے جواب دینے کے اس نے جو سوال پوچھا وہ ان کے لیے غیر متوقع تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میرا تعلق سادات جمیلی سے ہے۔۔۔۔۔“ ان کا جواب سن کر وہ ایک طرف کوسرک گیا۔ جیسے خود کو سینٹا چاہتا ہو۔

”آپ۔۔۔۔۔ آپ یہاں نہ بیٹھیں۔۔۔۔۔ اوپر بیٹھیں۔۔۔۔۔ آپ سید ہیں۔۔۔۔۔ اوپر بیٹھیں۔۔۔۔۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”تم بھی تو نیچے بیٹھے ہوئے ہو۔۔۔۔۔ میں بیٹھ گیا تو کیا ہو گیا۔“ بابر شاہ بولے۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں تو نیچے ذات کا ہوں۔۔۔۔۔ میرا کوئی نسب نہیں۔۔۔۔۔ میری کوئی پہچان نہیں۔۔۔۔۔ میں آپ کے برابر کیسے بیٹھوں۔۔۔۔۔ کیوں بیٹھوں۔۔۔۔۔“

بابر شاہ کے لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں اس کا جواب سن کر کہیں کوئی سوئی ہوئی یاد دھیرے سے کسمائی لیکن وہ اس یاد کے وجود کو محسوس نہ کر پائے۔

”تمہیں کس نے کہا کہ تم نیچے ہو۔۔۔۔۔ تمہارا کوئی نسب نہیں۔“ بابر شاہ نے اس سے پوچھا۔ تو وہ انہیں یوں دیکھنے لگا جیسے ان کی سوچ پر افسوس کر رہا ہو۔

”ضروری تو نہیں کہ کسی کے بتانے پر ہی میں سمجھوں۔۔۔۔۔ میرے وجود کا کوئی مجھے احساس دلانے تو تب ہی مجھے احساس ہو گا کیا۔۔۔۔۔“ وہ کس مضمون میں بول رہا تھا بابر شاہ نہیں سمجھے۔ پھر انہوں نے دل میں سوچا کہ یہ کون سا نارمل انسان ہے وحشی طور پر اپ سیٹ ہے اور میں اس سے ایسے گفتگو کر رہا ہوں جیسے یہ بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا جو اپنی بات مکمل کرنے کے بعد دوبارہ سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔

”تم کسی فیاض کو جانتے ہو؟“ بابر شاہ نے پوچھا تو ایک جھٹکے سے اس نے سر اٹھایا۔ اف خدا یا کس قدر وحشت تھی اس کے چہرے پر۔ سارے جسم کا خون جیسے آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ اس کی نظریں مسلسل بابر شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں کی وحشت دیکھ کر بابر شاہ اور فواد ایک قدم پیچھے سرک گئے۔

انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر وہ، اپ کی کیفیت طاری ہونے والی ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے

ان کے چہروں پر نگاہیں نکائے نکائے تھیں عجیب سے انداز میں نفی میں سر ہلایا۔
 ”میرے ساتھ چلو گے؟“ ہاہر شاہ نے پوچھا۔
 ”کہاں.....؟“ نبھاری سی آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔
 ”جہاں تم کہو گے؟“

”شاہ صاحب! کیوں مذاق اڑاتے ہو میرا..... یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ میں نے جانا ہے
 ناں تو خود جاؤں گا۔ اور اب کہ جاؤں گا تو ہاتھ نہیں آؤں گا..... حیدروں میں بیڑیاں ڈال کر کہتے ہو کہ تم
 آزاد ہو..... پرندے کے پر کاٹ کر اسے اڑنے کا مشورہ دیتے ہو..... اب کہ جاؤں گا تو نہیں
 آؤں گا..... خود جاؤں گا کسی کی مدد نہیں چاہئے..... جاؤں گا کوئی نہیں روک پائے گا.....“ پھر وہ سر پیچھے
 کر کے بینڈ کی پٹی سے ٹیک کر غلاؤں کو گھورتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔
 ”میں آؤں گا..... نکلوں گا یہاں سے..... جاؤں گا..... جلد آؤں گا.....“

”بابا“ فواد نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر بابر شاہ نے بھی اسے پکارا لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھا یا شاید ان کی طرف متوجہ ہونا ہی نہیں چاہتا تھا۔ فواد نے بابر شاہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں دوبارہ آفس میں آ گئے۔

”فواد! تمہارا کہنا درست ہے..... پہلے کی نسبت بہت بہتر ہو چکا ہے یہ..... آج اس نے جتنی باتیں بھی کہیں بہت سلیقے اور تہذیب سے کہیں..... بے ربط جملے اس کے منہ سے بہت کم نکلتے ہیں۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”جی ابو! میں یہی کاشف کو سمجھتا چاہ رہا تھا کہ اب وہ اپنی پرسنٹ ٹھیک ہو چکا ہے۔ بس کسی کسی وقت میزوی سے اتر جاتا ہے۔ اب اگر ہم اس سے مزید بولنے کی کوشش کرتے، کسی قسم کا استفادہ کرتے تو وہ بھڑک اٹھتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ آپ یہ بتائیں کہ آریان سمیت کہاں سے آرہے ہیں۔۔۔۔۔“ فواد نے بات کے اختتام پر ان سے پوچھا۔

”صبح بتایا تو تھا تمہیں کہ آریان کا بیان قلمبند کروانا تھا۔۔۔۔۔ ایس۔ بی صاحب سے اس کی تفصیلی بات ہوئی ہے۔۔۔۔۔“

”پھر کیا نتیجہ نکلا.....؟“ فواد نے پوچھا۔

”فی الحال تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔۔۔ بہر حال امید کے کئی پہلو روشن ہیں۔۔۔ تم یہ بتاؤ کہ گھر چل رہے ہو ہمارے ساتھ یا ابھی کام ہے کلینک میں۔۔۔“ پارسا نے ان سے پوچھا۔

”ابو اس وقت تو نہیں جاسکتا۔۔۔ ایک ایکسیڈنٹ کیس آیا ہوا ہے کچھ سیریس ہے اس لیے ایک دو گھنٹے مجھے لگ جائیں گے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر ہم چلتے ہیں۔۔۔ چلو بیٹا۔“ انہوں نے پہلے فواد اور پھر آریان کو مخاطب کیا۔ آریان اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں کینک سے نکل کر گاڑی میں آ بیٹھے۔

ہاں شاہ گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے لیکن ان کے ذہن کا ہر نقطہ اس پاگل پر مرکوز تھا۔ اس کا لہجہ اس کی باتیں رو رہ کر ان کے دماغ میں کھلبلی مچا رہی تھیں۔

”اندر پانی بہت جمع ہو رہا ہے اس لیے آنسوؤں کے ذریعے ختم کر رہا ہوں کہ پھر کبھی روؤں ہی نہ۔“

”میں سچ ذات ہوں..... میری کوئی پہچان نہیں..... میرا کوئی نسب نہیں..... میں آپ کے برابر کیسے جینہ سکتا ہوں.....“ ان کے دماغ میں شائیں شائیں ہونے لگی..... آنندھیوں کے جھکڑ سے چلنے لگے..... سوچ کے تناور درخت اس آنندھی کے سامنے ایک ایک کر کے گر کے لگے تھے۔ پھر اچانک دماغ کی گہرائیوں میں دور تار یکیوں کے اندر ایک جھماکا سا ہوا۔ بے اختیارانہ ان کا پاؤں پوری قوت سے بریک پر جا پڑا..... گاڑی کے بائزر بہت بری طرح چرچے چائے اور گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ آریان گھبرا گئی، وحشت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے یہی لگا کہ باہر شاہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات، وحشت ناک حد تک خوں رنگ ہوتی آنکھیں اسے متوحش کر گئیں۔ باہر شاہ کی نظریں پتا نہیں کون سے نقطے پر مرکوز تھیں کہ بالکل ساکت دکھائی دے رہی تھیں۔ جبکہ دماغ جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھا۔

وہ ایک چھانسن جو کافی عرصے سے دماغ میں نیزے کی انی کی طرح کھبی ہوئی تھی وہ نکل گئی تھی۔ وہ کون ہے..... انہیں یاد آ گیا تھا..... اچانک تمام پردے سرک گئے تھے..... انہیں سب کچھ یاد آ گیا وہ پہچان گئے..... بھلا وہ کس طرح فراموش کر سکتے تھے..... آریان نے بہت دیر سے سے بابر شاہ کے اسٹیرنگ پر دھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”انکل کیا بات ہے..... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ اس نے بابر شاہ سے پوچھا تو وہ جیسے ہوش میں آ گئے۔

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں بیٹا..... میں ٹھیک ہوں..... سوری بیٹا۔“ آریان سے بات کرنے کے بعد انہوں نے گاڑی سٹارٹ کی اور تقریباً فل سپید میں بھگاتے ہوئے گھر لے آئے۔ گاڑی روک کر نیچے اترے۔ لان میں اس وقت فیض چچی، شبنم پھوپھو، روبیہ، اہیہ اور بڑی اماں موجود تھیں۔ باہر شاہ جس کیفیت اور عالم میں وہاں سے گزرے تھے اس میں انہیں رسماً بھی کسی سے دعا سلام کا خیال نہ آیا۔ چہرے پر شدید ٹینشن کا غبار سب ہی نے دیکھ لیا تھا اور محسوس کر رہے تھے کہ یقیناً کچھ غیر معمولی ہو گیا ہے۔ ورنہ باہر شاہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپ سیٹ ہونے والے آدمی نہیں تھے۔ آریان گاڑی سے

اتر کر جب ان کے قریب آئی تو وہ سب پریشانی میں اس سے استفسار کرنے لگے کہ بابر شاہ کو کیا ہوا؟
بڑی اماں کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

”پتا نہیں بڑی اماں! ایس۔ پی صاحب کے آفس سے واپسی پر کھینک چلے گئے تھے۔ وہاں کسی مریض سے ملنے کے بعد کچھ اپ سیٹ ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ کے دوران راستے میں بھی ایک دو بار حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔“ آریان کو جو معلوم تھا اس نے بتا دیا لیکن اس سے بابر شاہ کی پریشانی کا کیا ربط ہے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بابر شاہ کمرے میں داخل ہوئے تو زاہدہ چچی وارڈروب کھولے پر بس شدہ کپڑوں کی سینٹنگ میں مصروف تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔
”آپ آگئے۔ کیا بتا؟“ انہوں نے یونہی پوچھ لیا تھا۔ اگر نہ ان کے چہرے پر پھیلی ٹینشن وہ پہلی سی نظر میں دیکھ چکی تھیں۔

بیان ہو گئے۔ ”کھوئے کھوئے لہجے میں کہتے ہوئے وہ بیڈ سائڈ ٹیبل کھول کر دیکھنے لگے۔
”کیا تلاش کر رہے ہیں۔“
”وہ میرے سگریٹ کہاں ہیں۔؟“
”نیچے دالی دراز میں ہیں۔“

”اگر زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے بنا لاؤ۔“ سگریٹ نکالتے ہوئے انہوں نے زاہدہ چچی سے کہا۔

”جی اچھا۔“ وہ بغیر کچھ اور کہے خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔ بابر شاہ کوئی عادی سموکر نہیں تھے۔ صرف شدید پریشانی کے عالم میں کبھی کبھار سگریٹ پینے لگ جاتے تھے۔
جب وہ چائے بنا کر لائیں تو کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔

”خیر تو ہے۔“ کپ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ پریشان سے لہجے میں بولیں۔
”ہاں خیریت ہی ہے۔“ ان کے اندر کیا ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ کسی سے بھی شہر نہیں کر سکتے تھے۔ دماغ کے نیچے ادھر رہے تھے۔ عجیب سی اذیت رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ انہوں نے ادھ جلا سگریٹ ایٹھڑے میں مسلا اور بغیر چائے کے انھہ کر چلے گئے۔

”پتا نہیں کیا پریشانی ہے۔“ مجھے بھی نہیں بتاتے بس اکیلے ہی اذیت سہتہ رہیں گے۔“ وہ بھی خود کھانی کرتی کمرے سے نکل آئیں اور لان میں بڑی اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”زاہدہ چچی۔ یہ بابر کو آخر پریشانی کیا ہے؟“ بڑی اماں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں پتا اماں بی۔ کچھ بتاتے بھی تو نہیں ہیں۔“

”یہ آریان بتا رہی تھی۔ کھینک میں کسی مریض سے ملنے کے بعد ایسے پریشان ہو گیا ہے۔“
”جی اماں۔ فواد نے کھینک میں کوئی پاگل مریض لا کر رکھا ہوا ہے۔ جس دن سے اس کو دیکھا ہے انہوں نے۔۔۔۔۔ رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ انہیں اتنا پریشان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کچھ میں نہیں آتا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔“ وہ حقیقتاً بابر شاہ کے ناقابل فہم رویے پر پریشان تھیں۔
پھر رات گئے بابر شاہ گھر میں داخل ہوئے۔ سادات نگر کے آدھے مکیں سوچکے تھے اور کچھ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ زاہدہ چچی کی بے خواب آنکھیں خواب گاہ کے دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔

”آپ آگئے۔“

”ہوں۔“ وہ خاموشی سے ایزی چیئر پر بیٹھ گئے۔ سگریٹ بدستوران کے ہاتھ میں سلگ رہا تھا۔

”آخر آپ اپنی پریشانی کیوں نہیں بتاتے مجھے۔“

”کیا بتاؤں۔“ بہت کمزور اور ٹوٹا ہوا لہجہ تھا ان کا۔ ”بس اتنا سمجھ لو زاہدہ آج سارے گھواؤ کھل گئے۔ ٹوٹ کر بکھر گیا ہوں میں۔ بہت بند باندھ رکھے تھے طوفان کا۔ لیکن۔۔۔ لیکن سب کچھ بہہ گیا۔“
”ہو کیا گیا۔“ کچھ بتائیں تو سہی۔“ زاہدہ چچی ان کے نونے ہوئے انداز پر گھبرا کر بولیں۔
”کچھ دن پہلے تمہیں میں نے بتایا تھا کہ فواد کے کھینک میں ایک مریض کو دیکھا تھا میں نے۔“
”جی ہاں۔ یاد ہے مجھے کیا ہوا اسے۔؟“

”اسے کچھ نہیں ہوا۔ وہ الجھن دور ہو گئی جو اسے دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔ کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔“

”تو کیا پتا چل گیا۔“

”ہاں پتا چل گیا۔ پہچان لیا میں نے اسے۔ یاد آ گیا مجھے کہ میں اسے کیسے جانتا ہوں۔ کہاں دیکھا تھا میں نے اسے؟“

”کون ہے وہ۔؟“ زاہدہ چچی کے لہجے میں اشتیاق سمٹ آیا۔

”تم جان کر کیا کر دو گی؟“ انہوں نے پہلو بچایا۔

”جس شخص کے لیے آپ اتنے پریشان ہیں وہ کوئی معمولی یا غیر اہم شخص نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کی شریک زندگی ہوں بابر! کم سے کم مجھے تو پتا ہونا چاہئے۔“ ان کی بات کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولے۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لگا کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے انہوں نے دھوئیں کے مرغولوں پر نگاہیں نکا دیں۔ ماحول میں کچھ دیر کو گھبراؤ اور گھمبیری خاموشی درآئی۔

”زاہدہ بیگم! کیس سال پہلے میں نے اس شخص کو دیکھا تھا۔ محض دو لمحوں کے لیے مگر آج تک

نہیں بھلا سکا۔“

”کمال ہے..... اتنی مختصر ملاقات اور ابھی تک یاد ہے وہ آپ کو..... اور اس کی خاطر اس قدر پریشان ہو رہے ہیں آپ.....“

”ہاں..... وہ شخص کس قدر اہم ہے میں نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ شخص اس ایک بندے کی ذات کی وجہ سے اس گھر کی خوشیاں جس نہیں ہوئیں۔ ہمارے سروں سے باپ کا سایہ اٹھا۔ اماں بی کی آنکھوں میں آنسو آئے ایسے جوا بھی تک خشک نہیں ہوئے۔“ بابر شاہ کی بات سن کر زاہدہ چچی جیسے سائے میں رہ گئیں۔ بیویوں بار اس گھر میں ڈھکے چھپے لفظوں میں اس کا تذکرہ ہوا تھا۔ اس کا نام کئی بار ان کی سماعت سے نکل آیا تھا۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”آپ کہیں فر..... فر جاؤ کی بات تو نہیں کر رہے!“

”ہاں زاہدہ! وہ پاگل..... کوئی اور نہیں..... وہ فر جاد ملک ہے۔ مسرت جہاں کی محبت اس کا شوہر..... بہت ٹھہرے ہوئے نہ سکتا لہجے میں انہوں نے کہا۔ زاہدہ چچی دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔

”اور سرتی! اس کا کچھ پتا چلا..... وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟“

”نہیں..... کچھ پتا نہیں چلا..... پتا چل بھی کیسے سکتا ہے جو ہمیں اس کے بارے میں بتا سکتا ہے وہ تو حواسوں میں ہی نہیں..... زاہدہ..... دعا کرو وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔ مسرت جہاں اس گھر کی وہ دکھتی رگ ہے جو اکیس سال سے مسلسل رسی تھی۔ اب اس عذاب مسلسل سے چھٹکارہ مل جانا چاہئے..... بہت سزا دے چکے ہم اسے..... اور بہت کچھ تاروے کما چکے ہیں ہم۔“ بابر چچا کا لہجہ ہار ماننے والوں جیسا تھا۔ وہ ایک فصر ایک تاریکی جو مسرت جہاں کے لیے ان کے دل میں تھی وہ تو بیتے برسوں میں وقت کی دھول کے نیچے دب چکی تھی۔ اب صرف محبت تھی۔ اپنی اکلوتی بہن کے لیے دل میں موجود میٹھے میٹھے نرم سے جذبے تھے۔ زاہدہ چچی خاموش بیٹھی ایک بدلے ہوئے شخص کو دیکھ رہی تھی۔

”تم ہی بتاؤ زاہدہ کیا بہت بڑا گناہ تھا اس کا..... کسی کو پسند کرنا اتنا بڑا جرم تو نہیں۔ رشتہ مناسب نہیں تھا تو انکار کیا جاسکتا تھا اس طرح کہ فر جاد اور مسرت اس میں اپنے لیے ہنگ یا زیادتی محسوس نہ کرتے..... لیکن ابامیاں نے جس طرح کا رویہ فر جاد ملک کے ساتھ روا رکھا اور ہم جس طرح اس کے خون کے پیاسے ہو گئے..... یہ ان دونوں کو ہی بہت ہنگ آمیز لگا ہوگا۔ وہ بچی تھی تاں سمجھ تھی عمر کی جس میڑھی پر وہ کھڑی تھی وہاں ایسے خواب آنکھیں ضرور دیکھتی ہیں لیکن ہم نے اسے اپنے ہی گھر میں اجنبیت کی دیوار میں جن دیا۔ اس کے ساتھ ایسا رویہ رکھا جیسے وہ چھوٹ کی مریضہ ہو۔ اس کے ساتھ بات تک کرنی چھوڑ دی۔ ایسے حالات میں اس نے اگر انتہائی قدم اٹھالیا تو قصور وار اکیلی وہی

نہیں..... ہم بھی برابر کے شریک ہیں..... پھر سزا صرف اسی کے لیے کیوں؟“ بابر چچا آج آئینے میں اپنا اصل دیکھ رہے تھے۔ قصور اور سزا کو کسوٹی پر پرکھ رہے تھے کہ کون کتنا گناہ گار ہے۔ اور انہیں مسرت جہاں کے انتہائی قدم اٹھائے جانے میں اپنا قصور بھی دکھائی دے رہا تھا۔

”یہ سب اپنی جگہ ٹھیک! لیکن آپ کی پریشانی اور وہ بھی اس قدر سنگین پریشانی کی وجہ کیا ہے وہ میں سمجھ نہیں پاتی۔“

”زاہدہ! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ فر جاد چنی طور پر بیمار شخص ہے۔ مسرت کے بارے میں ہمیں تب ہی پتا چلے گا ناں جب وہ ٹھیک ہوگا..... اور وہ..... وہ کلینک میں نکلتا ہی نہیں۔ موقع ملنے پر بھاگنے لگتا ہے..... آج بھی دو گھنٹے مسلسل تلاش کے بعد وہ کلینک کے عملے کے ہاتھ لگا کر وہ ایسے ہی کسی دن پھر بھاگ گیا تو پھر شاید ہی ہمیں مل سکے..... اگر وہ بھیڑ میں گم ہو گیا تو تمام عمر کے لیے ہمیں جی داماں کر دے گا۔“ بابر چچا حساس لہجے میں بولے۔

”تو آپ اس کو کھلے آئیں.....“ زاہدہ چچی نے تجویز دی۔

”کمال ہے! ایک غیر آدمی کو.....“ وہ خاموش ہو گئے۔

”غیر کیوں ہے..... اس گھر کا داماد ہے وہ..... اس گھر کی بہت قیمتی متاع اس کے پاس ہے..... وہ غیر کیسے ہو گیا۔“ زاہدہ چچی کی بات ان کے دل کو لگی۔

”ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو..... اس گھر سے اس کا رشتہ بہت مضبوط ہے پھر وہ غیر تو نہ ہوا لیکن گھر کے باقی سب افراد.....“

”آپ کا کیا خیال ہے سرتی کی محبت صرف آپ کے دل میں ہی جا گی ہے۔ بابر! اس گھر کا ایک ایک فرد اس کو یاد کرتا ہے۔ برطمانہ کسی..... ڈھکے چھپے انداز میں ہی کسی لیکن اس کا ذکر سب ہی کرتے ہیں۔ سوائے عارب بھائی کے..... آپ اسے گھر لے آئیں..... کسی کو اعتراض نہیں ہوگا..... سب ہی سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور ممکن ہے گھر کا ماحول اور اپنے ارد گرد خوشگوار چہروں کو دیکھ کر وہ بھی جلدی ٹھیک ہو جائے..... اتنا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بار اگر یہاں آ گیا تو پھر یہاں سے بھاگے گا نہیں۔“ زاہدہ چچی وثوق سے بولیں۔ بابر چچا کو لگا ان کے ذہن سے آدھا بوجھ سرک گیا ہے۔

”ٹھیک ہے! پھر دیر نہیں کرنی چاہئے میں ابھی اماں بی سے بات کرتا ہوں..... بہت جلد اسے ہم یہاں لے آئیں گے۔“ بابر شاہ مطمئن ہوئے تو انہیں اس کو جلدی لانے کی فکر پڑ گئی۔ وہ اٹھ کر اماں بی کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

چھٹی کی گھنٹی بجی آریان نے ٹبل پر بکھری چیزیں سمیٹیں اس کا آخری پیریز فری ہوتا تھا اور وہ یہ وقت پر ٹبل آفس میں بیٹھ کر اخبار وغیرہ کا مطالعہ کر کے گزارتی تھی۔ تھوڑی دیر میں تمام لمچرو وہیں آگئیں۔ اینڈنس لگا کر سب ہی آفس سے نکلتی چلی گئیں وہ اور وہ یہ بھی سکول کے گیٹ سے باہر نکل آئیں۔ سکول کے سامنے دکانوں کی ایک قطار تھی اور قدرے فاصلے پر ایک چائے کا ہوٹل تھا۔ وہ دونوں سر جھکائے چلی آ رہی تھیں یہ جانے بغیر کے دو انگارہ آنکھیں مسلسل انہیں دیکھ رہی ہیں۔ پہلے روبیہ کو اپنے چہرے پر غیر محسوس سی چشم محسوس ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہوٹل کے باہر بچے ہوئے بچ پر کالے کسبل میں لپٹا ہوا وہ شخص اس کے لیے بالکل انجان تھا لیکن اس کی متلاشی نظروں کی چھین روبیہ کو اپنے وجود کے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آریان کا ہاتھ تھام لیا۔ آریان نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے روبی؟“

”رینی..... وہ..... وہ شخص.....“ روبیہ نے دائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا تو آریان اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھنے لگی۔ سیاہ کسبل میں منہ سر پہنے وہ شخص اس کے لیے بھی اجنبی ہی تھا۔ اس کا چہرہ تقریباً کسبل میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ بچ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”رینی..... وہ..... وہ اٹھ گیا ہے بچ سے۔“ روبیہ اس کے اس طرح اٹھنے پر گھبرا گئی۔

”روبی..... تیز قدم اٹھاؤ..... آج انکل بھی نہیں.....“ آریان بولی۔ روبیہ کی ساری توجہ اس سیاہ کسبل والے پر مرکوز تھی جو اب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اسی راستے پر آ گیا تھا جدھر سے چل کر وہ آئی تھیں۔ غیر محسوس طریقے سے روبیہ اور آریان کے قدموں میں تیزی آگئی..... کمرشل ایریا ختم ہو چکا تھا اور رہائشی کالونی شروع ہو گئی۔ دو پہر کا وقت تھا..... چلچلاتی دھوپ میں سب گھروں میں تھے گلیاں تقریباً سناٹا تھیں۔ وہ شخص مسلسل ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتا تو اس کے قدموں میں بھی تیزی آ جاتی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی تو وہ بھی آہستہ آہستہ چلنے لگتا۔ لیکن ان کا درمیانی فاصلہ اب کم ہوتا جا رہا تھا۔ آریان اور روبیہ کو اب یقین ہو گیا تھا کہ وہ ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ دونوں گھبرا رہی تھیں۔

”رینی! یاد کیا مصیبت ہے..... یہ کون ہے؟ اب تو ستارہ بیگم کے غنڈے بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔“ روبیہ پریشان سے بولی۔

”تو تم کیا سمجھتی ہو ستارہ بیگم کے پاس غنڈوں کی کمی ہے۔ پتا نہیں کتنے پال رکھے ہیں حرام کی کمائی کھلا کھلا کر.....“ آریان کا خون کھولنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ شخص اب ان کے بے حد قریب آ گیا تھا۔ روبیہ اور آریان کی تو جان ہی حلق میں اٹک گئی۔ وہ اب تقریباً بھاگنے کا سوچ رہی تھیں جب اچانک بہت نرم سی آواز آئی۔

”رانی بیٹا.....“ تیز ہوتے قدم سنست پڑ گئے۔ دھڑکنیں جیسے تھم سی گئیں۔ آریان کو شاید اپنی نامت پر یقین نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رک نہیں تھی۔

”رانی بیٹا.....“ آواز پھر آئی اور اب کی بار آریان کے قدم رک گئے۔ اس نے گھوم کر اس سیاہ کسبل والے کو دیکھا۔ ایسے تو اسے صرف گھٹکرہ بابا پکارتے تھے۔ پھر جیسے وہ جان گئی۔

”گھٹکرہ بابا.....“ اس کے ہونٹوں سے ادا ہوا۔

”روبی..... روبی یہی ہیں میرے گھٹکرہ بابا..... یہی ہیں میرے دوست، میرے ہمراز، میرے بچپن کے ساتھی..... یہی ہیں گھٹکرہ بابا آپ..... آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....“ آریان بے تابی سے ان کا ہاتھ تھام کر خود فراموشی کی سی کیفیت میں بولی۔ اس لمحے وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ گھر کی چار دیواری میں نہیں بلکہ گلی میں کھڑی ہے۔ روبیہ بھی خاموش کھڑی اس کو دیکھ رہی تھی۔

”رانی بیٹا! معاف کرنا تمہیں پریشان کیا..... تمہاری خیریت معلوم کرنا بھی ضروری تھا۔ بس اسی لیے چلا آیا۔ منہ اس وجہ سے چھپا رکھا ہے کہ ستارہ بیگم کے کتے پہچان نہ لیں۔“ اسی وقت ایک گاڑی ان کے قریب آرکی۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے بہت غور سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ گھٹکرہ بابا نے ایک نظر گاڑی کی طرف دیکھا۔

”بس رانی بیٹا! میں اب چلتا ہوں۔“ وہ کہہ کر تیز تیز قدموں سے چل پڑے۔ باہر شاہ گاڑی سے اتر آئے۔

”آریان بیٹا! کون ہیں یہ؟“ وہ آریان کو ان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔

”انکل..... یہ میرے گھٹکرہ بابا ہیں.....“ آریان خفیہ لہجے میں بولی۔ گھٹکرہ بابا تھے ہی ایسے کہ جن سے تعلق پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتی تھی۔

”تو روکو انہیں! کہاں جا رہے ہیں یہ۔“ باہر شاہ تیزی سے گھٹکرہ بابا کی طرف بڑھے۔

”ایک منٹ رکھیے پلیز.....“ باہر شاہ کے پکارنے پر گھٹکرہ بابا نے رک کر پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور پھر آریان کی طرف۔

”بابا! آپ گھر چلیں ہمارے ساتھ..... وہاں تفصیل سے بات کریں گے۔“ وہ بولی۔

”نہ رانی بیٹا! بی بی بے گل ہوں گی۔ وہ تو کہہ رہی تھیں غلام عباس تمہارے چوکھٹ سے پیر باہر کھتے ہی میرا انتظار شروع ہو جائے گا..... جلدی آنے کی کوشش کرنا..... بی بی کا کہا رکھنا ہے مجھے..... میں دیر نہیں کر سکتا.....“

”گھٹکرہ بابا! میں بھی تو آپ کی بی بی کی کچھ لگتی ہوں۔ ناراض ہوں تو میرا نام لے دیجیے گا..... کچھ نہیں کہیں گی۔ اب چل پڑیں۔“ آریان ان کا بازو تھام کر گاڑی تک لائی تو انہیں گاڑی میں

بیٹھے ہی بنی۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے۔ پھر بابر شاہ، آریان اور تھنکر و بابا کو ساتھ لیے بی بی۔ وی لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ زاہدہ چچی کو زبردستی چائے کا آرڈر دینے کے بعد بابر چچا، تھنکر و بابا سے تفصیل سے گفتگو کرنے لگے۔

”رستم اور کبیر نے پکڑے جانے سے پہلے ستارہ بیگم کو فون کر کے اس گھر اور سکول کا پتا بتا دیا تھا۔ اب ان کے پکڑے جانے کے باوجود ستارہ بیگم کے ہر کارے ہر جگہ چوکس پھر رہے ہیں۔ رانی بیبا کی خیریت کی طرف سے اطمینان نہیں تھا سو مجھے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں آنا پڑا۔ بی بی کی بے چینی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔“

”غلام عباس صاحب! یہی نام بتایا ہے؟ آپ نے۔“ بابر چچا ایک پل کور کے۔

”جی ہاں۔“

”جی غلام عباس صاحب! آریان کی طرف سے آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ اور اپنی بی بی سے بھی کہہ دیجئے گا کہ آریان اب محفوظ ہے۔ اس کے ارد گرد جو حصار ہے وہ اتنا کمزور نہیں کہ ستارہ بیگم یا اس کے آدمی وہ حصار توڑ کر آریان تک پہنچ سکیں۔ ہماری اپنی بھی بنیاں ہیں اور بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔“ بابر شاہ کا چنانوں کی طرح مضبوط لہجہ تھنکر و بابا کے اندر طمانیت بھر گیا۔ انہوں نے سکون بھر اسانس لیا۔

”مجھے اب کوئی فکر نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ اکیس سال اس بچی کو بہت سست سست کر رکھا ہے۔ تھنکر و کی جان چلی جائے غم نہیں لیکن اسے کچھ نہیں ہونا چاہئے۔“ تھنکر و بابا کا لہجہ اور آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ان کا سر جھک گیا۔ بابر شاہ اور آریان کے دل میں ان کے جملے اتر رہے تھے۔ کمرے کے ماحول پر ایک عجیب سی بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔

”آپ کی دعائیں رہیں تو بہت جلد آریان ہی نہیں آپ کی بی بی بھی ان ظالموں کے چنگل سے آزاد ہوں گی۔“ بابر شاہ بولے تو تھنکر و بابا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”اٹھی تیرے رنگ۔۔۔۔۔۔ زمین اور آسمان کا ملاپ ہو جائے گا۔ شاہ صاحب! ایک معجزہ ہو گا یہ جو وہاں آباد ہیں ان سب کے لیے انہونی ہوگی۔ بھلا کوٹھے والوں کو کسی نے کب عزت دی ہے۔“

”نہیں غلام عباس صاحب! ہر انسان عزت کا حق دار ہے۔ وہاں بیٹھے لوگ شوق نہیں مجبوری میں ذلت خریدتے ہیں اور عزت بیچتے ہیں۔ آریان کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی خاندانی لوگ بھی اس کچڑ بھری دلدل میں گر جاتے ہیں۔ پھر اگر ہم جیسے لوگ ان کو کسی مشکل سے نجات دلائے گا، سیلہ بن جائیں تو کیا مقصد ہے۔“ بابر شاہ سادہ سے لہجے میں بولے۔

”تھنکر و کی آنکھوں نے بڑے نگارے دیکھے۔ ایک ایک چہرے کے کئی کئی پرت۔ ذات

والوں کی بد ذاتی۔ غیرت والوں کی بے غیرتی۔ غرور سے اٹھے سروں کو کھٹے دیکھا۔۔۔۔۔۔ فخر کرنے والوں کو بھٹکتے دیکھا پر شاہ صاحب! ایسا کہیں نہیں دیکھا۔ عزت دار وہاں جاتے ضرور ہیں، کچھ روز کے لیے ذات فردشوں کو عزت کے پلنگ پر بھی بٹھاتے ہیں لیکن آپ جانو طوائفیں تو تریز کھائے برتن کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی کشش دنوں میں ختم ہو جاتی ہے اور پھر ان عزت داروں کے گھروں میں ان نوٹے ہوئے برتنوں کے لیے کون سا شوکیس رکھا ہوتا ہے۔ اپنے بکھرے ارمان سمیت کرواپس وہیں آ جاتی ہیں جہاں سے عزت کی زندگی کے خواب دیکھتے ہوئے رخصت ہوتی ہیں۔ پر شاہ صاحب! آج تک ایسا کوئی ایسا مرد نہیں دیکھا جو کسی طوائف کو بہن اور بیٹی بنا کر گھر کی چار دیواری کی اماں بنے۔“ غلام عباس عرف تھنکر و بابا کے لہجے میں بابر شاہ کے لیے عقیدت ہی عقیدت تھی۔

”بس غلام عباس صاحب! اور زیادہ شرمندہ مت کریں۔ میں کسی میڈل کسی تمغے کی خواہش میں یہ سب نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی مجھے تعریف کا لالچ ہے۔ میں تو بس آریان بیبی کی روشن پیشانی پر مثبت نگاہ ڈال کر دیکھتا ہوں۔ اسے اس کا اصل مقام دلانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”میری مدد کی۔۔۔۔۔۔ پر مجھ جیسا کم مایہ انسان آپ کی کیا مدد کر سکتا ہے؟“ تھنکر و بابا حیرت سے بولے۔

”آپ اندر کے آدمی ہیں۔ یقیناً ستارہ بیگم کی برعادت سے واقف اور اندرونی تمام رازوں کو جانتے ہوں گے۔“ بابر شاہ نے کہا

”جی ہاں! بڑی ہائی جی میزری بڑی عزت کرتی ہیں۔ میری ماں مرتے دم تک ان کی وفادار تھی اور مجھے بھی یہی سبق پڑھایا تھا اس نے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ ستارہ بیگم کی زندگی بھر خدمت کرنا۔ پر شاہ جی بی بی کی ذات ایسی بچ میں آئی کہ ماں کا کہا بھول گیا میں۔ ستارہ بیگم سے غداری کرنے لگ گیا۔ پر جی وہ ابھی مجھ پر ویسا ہی اعتبار کرتی ہے جیسا پہلے کرتی تھی۔“ غلام عباس سر جھکائے بولا۔

”تو آپ کے خیال میں کیا وہ آریان اور اس کی امی کو ہمارے حوالے کر دے گی؟“

”ناممکن ہے۔ ستارہ بیگم اپنے کوٹھے کے نوٹے ہوئے برتن اور پھولوں کی کھری ہوئی پتیاں بھی بابر نہیں پھینکتیں۔ یہ تو پھر دو زندہ وجود ہیں۔ رانی بیبا میں وہ اپنے مستقبل کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ اور بی بی! پچھلے اکیس بائیس سال سے صرف آواز بچ کر اس کے لیے لاکھوں کی کمائی کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ آج بھی بہت سے لوگ محض ان کی آواز پر لاکھوں انا دیتے ہیں۔ ستارہ بیگم کبھی نہیں چاہیں گی کہ یہ دونوں ان کے ہاتھ سے نکلیں۔“

”پھر کیا ہمیں قانونی راستے سے انہیں حاصل کرنا ہوگا۔۔۔۔۔“ بابر شاہ استغیاہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”قانون۔۔۔۔۔“ بڑی زبردست سکرابٹ اس کے ہونٹوں پر پھٹی۔ ”قانون تو خود بائی جی کے کلوے چاہتا ہے۔ یہ وردی والے جودن بھر کمزوروں پر قہر بن کر نوٹے رہتے ہیں۔ رات کی سیاسی میں ستارہ بیگم کے آگے یوں جھکتے ہیں جیسے نیاز مند پیر و مرشد کے آگے۔ اپنا ایمان، اپنی عزت گردی رکھ رکھی ہے انہوں نے۔۔۔۔۔ لیکن آپ ہمت نہ ہاریں۔ کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ ان کی دھتھی رگ کو پکڑیں۔ شاید وہ مان جائے۔“

”کیا مطلب؟“

”طوائف کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ جیب دیکھ کر رو پیے میں رو بدول کرتی ہے۔ جہاں نوٹ نظر آئے وہاں مسکراہٹ ہوگی اور الفت بھی آپ کو ان سے سودا کرنا ہوگا۔ ممکن ہے وہ مان جائے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔ آپ ہمارے ساتھ ہی چلیے گا۔ ایک آدھ دن میں۔۔۔۔۔“

”نہیں شاہ جی! مجھے اجازت دیں۔ بی بی کو جا کر تسلی دینی ہے کہ رانی بیٹا بالکل ٹھیک ہے اور خوش بھی ہے۔۔۔۔۔ بس آپ سے انتہا ہے اس کا بہت خیال رکھیے گا۔“ گھٹنگرو بابا نے اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے کر اس کا سر سینے سے لگایا۔ اس کی پیشانی چومی۔

”آپ کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم مزید اصرار کرتے لیکن ایک ماں کی تکلیف کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ کو رکنے پر مجبور نہیں کریں گے لیکن آپ یہاں سے جاتے ہوئے مطمئن رہیے۔ آریان کو یہاں کوئی نگہ نہیں ہوگی۔“ بابر شاہ انہیں رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان کے ساتھ ہی گیت تک آئے۔

گھٹنگرو بابا نے بہت گرم جوش سے بابر شاہ سے مصافحہ کیا ایک بار پھر آریان کو ہمارا کیا اور بھئی آنکھیں لیے رخصت ہو گئے۔ آریان کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ گئے لیکن یونہی کسی دکھ کی وجہ سے نہیں ان سے ملنے کی خوشی کی وجہ سے تھی۔

☆ ☆ ☆

دہلیز پر لگی آنکھوں میں انتظار کی ریت چبھنے لگی تھی۔ دو دن سے اس نے کوئی محفل بھی امینہ نہیں کی تھی۔ ستارہ بیگم جانتی تھی کہ ماتا کو بیٹی کی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی لیکن وہ ہمدردی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہاں ہمدردی کر کے خود ہی نقصان اٹھانے والی بات تھی۔ اس نے اگر ذرا سی بھی چاندنی کی دلجوئی کرنی تھی تو جواب میں چاندنی کی انتہا اور آرزو یہی ہوتی تھی کہ اس کی بیٹی سے دستبردار

ہو جائے۔۔۔۔۔ اور ستارہ کے لیے یہ گھانے کا سودا تھا۔ اسی لیے اس نے چاندنی کے اس رویے کا زیادہ ٹوٹ نہیں لیا تھا۔ گھٹنگرو بابا بھی کل سے غائب تھا۔ نہیں تو اسی کے ذریعے چاندنی کو سمجھا بھالیتی۔ تماش بین بار بار چاندنی کی فرمائش کر رہے تھے اور وہ اس کی ناسازی طبیعت کا بہانہ کیے جا رہی تھی۔

رات ہو گئی لیکن وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ کمرے میں ہی اندھیرا کیے بستر پر پڑی رہی۔ طلبوں پر تھاپ پڑنے لگی۔ گھٹنگرو پوروں میں بندھنے لگے، لچکتے، منکتے، مہکے ہوئے سراپے ادھر سے ادھر سے آ جا رہے تھے لیکن کسی کو فرصت نہیں تھی کہ کوئی اس سے اس کا دکھ پوچھتا۔

”ایک وہ نہیں۔۔۔۔۔ تو یہاں کسی کو بھی میرا خیال نہیں۔ یہ لوگ جو میرے ارد گرد بستے ہیں۔ زندہ دل، بے فکرے لوگ۔۔۔۔۔ یہ لچکدار ڈالیوں جیسی لڑکیاں جن کی مانیں خود انہیں غیروں کی آغوش میں دھکیل کر بے غیرتی کے اس سر عام مظاہرے پر کھٹکھٹا کر ہنستی ہیں۔ یہاں میرا کون ہے۔ میں یہاں کس لیے ہوں۔۔۔۔۔ بدوسوں دامن کو پچائے میں نے کرب سہتہ زندگی گزار دی اور اب اب میری بیٹی بھی گھٹنگرو دبانہ مے گی۔ اس کے ذمے چپے ہوئے سراپے کو ہونا ک نظریں برے کی طرح چسپدیں گی اور میں۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔ یا الہی! تیری اس دنیا میں کوئی جائے اماں ہے بھی یا نہیں۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”بی بی۔۔۔۔۔“ اندھیرے میں آواز ابھری تو وہ ٹپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ اسی پل کر روشنی میں نہا گیا۔ مسافت میں دھول دھول ہوتا ہوا غلام عباس اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”غلام عباس! اتنی دیر کر دی تم نے۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ یہ انتظار نہیں ہوتا مجھ سے۔ بہت بے صبری ہوں میں۔۔۔۔۔ پھر بھی۔۔۔۔۔ پھر بھی تمہیں احساس نہیں ہوا۔ اتنی دیر لگا کر آئے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”بی بی۔۔۔۔۔ بی بی معاف کر دیں پر یوں نہ روئیں۔ بی بی۔۔۔۔۔ خدا ادا۔۔۔۔۔ چپ ہو جائیں۔“ غلام عباس نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”غلطی ہو گئی بی بی! پر رانی بیٹا کے اصرار پر مجھے وہاں کچھ دیر رکنا پڑ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ بی بی منتظر ہوں گی۔ پر اس نے کہا کہ میرا نام لے لینا وہ ناراض نہیں ہوں گی۔“ غلام عباس سر جھکا کر بولا۔ چاندنی نے پیر سیٹ لیے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھم گئے۔

”کیسی ہے وہ۔۔۔۔۔ ٹھیک تو ہے۔۔۔۔۔“

”بی بی! ہماری رانی بیٹا کو تو اللہ نے ایسی امان دی ہے کہ کیا کہوں۔۔۔۔۔ شاید فرشتے اگر انسانوں کے روپ میں آئیں تو وہ ایسے ہی ہوں گے جیسے وہ لوگ۔۔۔۔۔ انہوں نے رانی بیٹا کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ اس کی ہر ضرورت ہر سہولت کا خیال رکھتے ہیں۔ میں پیسے دینے لگا تو منع کر رہے تھے

کہ یہ ہماری بیٹی ہے اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ پر میں نے آپ کا نام لے کر
اصرار کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔“

”اچھا..... تو وہ..... وہ خوش بھی ہے۔“ چاندنی بے تابلی سے بولی۔

”ہاں بی بی! بہت خوش ہے وہ بس آپ کو یاد کر کے اداس ہو گئی تھی۔ بی بی! پتا ہے وہ لوگ کیا
کہتے ہیں..... آپ اطمینان رکھیں..... وہ رانی بٹیا کو بائی جی کے چنگل سے آزاد کرالیں گے خواہ انہیں
اس کے لیے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے.....“ غلام عباس کی بات سن کر چاندنی کی آنکھوں میں تشکر کے
آنسو آ گئے۔

”مولا! تو معاف کر دینا۔ بہت تھزدلی ہوں میں..... تکلیف آئی تو شکوہ کر بیٹھی تھی۔ حالانکہ یہ
میرا مقام نہیں..... تو تو بہت بلند ہے اور میں حقیر ذرہ..... میری کیا بساط کے تجھ سے شکایت کروں۔
مجھے معاف کر دینا پالنے والے۔“ وہ دل ہی دل میں اپنے رب سے مخاطب تھی۔ سچی بات یہ تھی کہ غلام
عباس کی باتیں سن کر وہ بہت حد تک مطمئن ہو گئی تھی کہ اب آریان کو بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن ماں کبھی
تھل طور پر سکون نہیں پاسکتی سو وہ بھی اس کے لیے پریشان تھی۔



اماں بی اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بات کر کے بابر شاہ کافی حد تک مطمئن ہو گئے تھے۔
فرجاد کو گھرانے کی مخالفت کسی نے نہیں کی تھی۔ البتہ عارب تایا ابھی بے خبر تھے کہ گھر میں کیا کچھڑی پک
رہی ہے۔ اماں بی کے دل کا درد سوا ہو گیا تھا۔ مسرت جہاں کو اٹھارہ سال انہوں نے اپنی آغوش میں
سمیٹ سمیٹ کر رکھا تھا۔ پانچ بھائیوں کے بعد کتنی منتوں مرادوں سے انہوں نے بیٹی پائی تھی۔ اس کی
بلکی سی تکلیف پر اماں بی ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتیں۔ اس کی پردریش کے دوران وہ گھر
بچوں میںاں حتی کہ اپنے آپ سے بھی غافل ہو گئی تھیں۔ وہی مسرت جہاں جوان کے گلے میں بازو ڈال
کر اور ان کے بازوؤں میں مھول مھول کر فرمائشیں کیا کرتی تھی جب اس گھر کی دہلیز پار کرنے لگیں تو
ایک بل کو بھی ماں کی قربانوں، اس کی محبت کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔ اگر سوچتیں تو ضرور یہ خیال
بھو آتا کہ میری ماں جیتے جی مر جائے گی۔ وہ تو سادات گھر کی ساری محبتیں، ساری رفاقتیں، سارے
رشتے بھول کر ایک نئی منزل کی طرف چل پڑی تھیں لیکن شبیر حسین شاہ کے لیے وہ رات ساری زندگی
محیط ہو گئی۔ انہوں نے خود کو اس امتحان کے قابل نہ سمجھا کہ اس رات کی کالک منہ پر تھوپ کر وہ ایک با
پھر دنیا کا سامنا کرتے۔ سو اس رات کی سیاہی میں ہی مدغم ہو گئے۔ ایسے خاموش ہوئے کہ پھر کبھی نہ بول
پائے..... بھری دنیا میں حقیر اور اذیت کے تیر سہنے کو اماں بی رہ گئیں۔ بیٹوں نے مسرت جہاں کے گھر
چلے جانے کے بعد چپ سا دھلی۔ سارا جوش، ساری غیرت اپنی موت آپ مر گئی۔ وہ دنیا کے کارخانوں
میں اپنے حصے کا کام کرتے رہے۔ سانس بھی لیتے رہے لیکن مسرت جہاں جو زخم ان کے دل پر لگا
تھیں۔ وقت بھی اس کا مرہم نہ بن سکا۔

پر اب اکیس سال بعد اس کے ملنے کی امید نظر آئی تو سارے گلے شکوے جیسے کہیں
جاسوئے۔ ایک خلش تو تھی لیکن اب وہ اتنی اذیت نہیں دیتی تھی۔ اور اماں بی..... وہ تو اپنے جگر پار
سے ملنے کو اتنی بے کل ہو گئی تھیں کہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھیں فرجاد جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔ انہوں
ان کی مسرت جہاں کا پتا تادے۔ وہ ایک بار اسے اپنے سینے سے لگا کر دل میں جلتی ممتا کی آگ

کر لیں۔ پھر چاہے زندگی ان سے روٹھ جائے۔ شاید وہ ابھی تک اسی امید اور اسی آرزو پر جی رہی تھیں۔ شاید پروردگار نے انہیں مہلت اسی لیے دی ہوئی تھی۔

بابر شاہ فرجاد کو کلینک سے لے آئے تھے۔ گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو فرجاد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”یہ کہاں لے کر آئے ہیں مجھے.....“

”آج سے تم نے سیکر رہنا ہے ہمارے پاس..... وہ کلینک والے تمہیں تنگ کرتے تھے ناں۔ تمہارے ہاتھ پیر باندھتے تھے زنجیروں سے..... تمہیں زبردستی انجکشن لگاتے تھے۔ میں اس لیے تمہیں یہاں لے آیا ہوں..... یہاں تم آزاد پھر دو گے۔ تمہارے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں ڈالے گا۔“ بابر شاہ بات مکمل کر کے گاڑی سے نیچا ترے۔ پھر گھوم کر دوسری طرف آئے اور اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔

”آؤ.....“ انہوں نے اسے باہر آنے کو کہا تو وہ بغیر مزاحمت کیے خاموشی سے اتر آیا۔ وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن ان آنکھوں میں کوئی جذبہ، کوئی رنگ نہیں تھا۔ جیسے اس کے لیے یہ کوئی اجنبی جگہ نہ ہو۔ بہت عام سا انداز تھا اس کا۔ بابر شاہ کے ہمراہ وہ لان میں آ گیا۔ شام کا وقت تھا سب ہی حسب معمول وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اماں بی اسے دیکھ کر اضطرابی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بابر شاہ نے سب کو تنبیہ کی ہوئی تھی کہ اس پر ابھی اپنی یا اس کی حقیقت واضح نہ کی جائے۔ اسے بس یہاں گھر کا ماحول ملنا چاہئے۔

”اماں بی..... یہ ہیں میرے دوست..... اور دوست یہ میری اور اب تمہاری بھی اماں بی ہیں۔“ بابر شاہ نے بہم سا تعارف کروایا۔ فرجاد بہت دھیمے قدموں سے چلتا تقدس کی اس صورت کے قریب آن رکا جنہیں بابر شاہ نے اماں بی کہا تھا۔

”اماں بی.....“ یہ لفظ اسے اپنے ہونٹوں پر بہت غیر مانوس اور اجنبی سے لگے۔ اماں بی کا لرزنا ہوا ہاتھ اس کے سر پر ایک لمحے کونکا اور پھر ان کے پہلو میں جمول گیا۔ کیسی کیفیت تھی جس کا عذاب وہ اپنے دل پر سہہ رہی تھیں۔

”یہ شخص جو خود سے بھی بے گانہ ہے..... ان کی سرت جہاں کا شریک زندگی ہے..... اس شخص کے خواب سرت جہاں کی آنکھوں نے دیکھے..... پتا نہیں کتنا عرصہ اس شخص کے ساتھ گزارا ہوگا انہوں نے..... پتا نہیں اب کس حال میں ہوگی وہ؟“ اماں بی کو خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ کیسی ماں تھیں وہ جو اپنی بیٹی سے اکیس سال تک بے خبر رہیں۔ پتا نہیں یہ سال اس نے ہنس کر گزارے یا رو کر، سکھ میں بتائے یا کھ میں۔

بابر شاہ نے فرجاد کو کچھ دیر کے لیے سب کے درمیان بٹھایا۔ فیضی چچی اور حدیثہ چچی بہت دلچسپی

سے اس گھر کے داماد کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے تو پہلی بار دیکھا تھا۔ اچھا خاصا ہینڈم آدمی تھا وہ بس ذہنی طور پر اپ سیٹ ہونے کی وجہ سے خود سے لا پرواہ ہو گیا تھا۔ بابر شاہ نے جب دیکھا کہ فرجاد اب تنہا محسوس کر رہا ہے تو وہ اسے لے کر اپنے پورشن میں آ گئے..... جہاں پہلے ہی اس کے لیے کمرہ سیٹ کیا ہوا تھا۔ اسے کمرے میں بستر پر لٹا کر زاہدہ چچی کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ خود کسی ضروری کام سے دوبارہ باہر نکل گئے۔

رات کو عارب تاپا کو جب یہ خبر ملی کہ فرجاد ملک کو بابر شاہ گھر لے آئے ہیں تو ایک بار پھر خون کھول اٹھا۔ وہ غصے سے تن فٹن کرتے اماں بی کے پاس پہنچ گئے۔

”اماں بی..... یہ باہر آخر چاہتا کیا ہے..... کیوں سادات گھر میں کوئی ایسا طوفان لانا چاہتا ہے کہ اس آشیانے کا جناح کا بکھر جائے۔“

”کیا ہو گیا..... آرام سے بیٹھ کر بات کرو.....“

”اماں بی! پہلے ایک طوائف زادی کو زبردستی اس گھر آنے پر تھوپا اس کے بیٹے نے..... اور بجائے روک ٹوک کے الٹا سب نے اسی کی حمایت کی..... اور اب یہ فرجاد..... اس کو کس خوشی میں یہاں آنے کی اجازت دیدی گئی؟“

”وہ یہاں خود نہیں آیا..... اسے لایا گیا ہے۔“

”وہی وجہ جاننا چاہتا ہوں کہ کس لیے اسے یہاں لایا گیا۔“ عارب شاہ بلند آواز میں بول رہے تھے۔

”اس لیے کہ وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں۔ اس کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ کلینک میں ٹکنا نہیں تھا۔ مجبوراً بابر اس کو گھر لے آیا تاکہ اس کے ٹھیک ہونے پر سرت بچی کے بارے میں پوچھا جائے کہ وہ کس حال میں ہے کہاں ہے؟“

”آخر کس لیے..... جب یہاں سے چلی گئی ہے وہ تو مرے یا جیسے ہمیں اس سے کیا؟“ وہ برا فروختہ ہوتے ہوئے بولے۔

”اتنے پتھر دل مت بنو عارب! بے شک اس نے جو کیا غلط کیا لیکن اس گھر کی دہلیز چھوڑ کر چلے جانے کے باوجود وہ اب بھی یہاں حق رکھتی ہے۔ اب بھی خون کا رشتہ قائم ہے اس سے.....“

”میں ایسے رشتوں کو نہیں تسلیم کرتا جن کو نبھاتے ہوئے عزت اور غیرت کا جنازہ نکل جائے..... جس دن اس نے یہ دہلیز چھوڑی..... ہر رشتہ تو وہ خود توڑ گئی۔ کیا باپ کی غیرت، بھائیوں کی ناموس، ماں کی ممتا اس قدر بے وقت اور حقیر تھیں جنہیں وہ روند کر چلی گئی..... معاف کیجئے گا اماں بی اس کے لیے آپ کے دل میں جگہ ہو سکتی ہے لیکن میں اس کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا۔“ عارب

شاہ کے لہجے میں نفرت کھلی ہوئی تھی۔ اماں بی نے لامتناہی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”نہ جانے عارب تمہاری فطرت کیسی ہے۔۔۔ میں یا تمہارے اماں تو ایسے نہیں تھے۔ اور اگر آج وہ زندہ ہوتے تو یقیناً مسرت جہاں کے لیے ان کے دل میں بھی میری ہی طرح محبت جاگ اٹھتی۔“

”وہ زندہ ہوتے تب ناں۔۔۔ انہیں تو آپ کی لاڈلی خود اپنے ہاتھوں قتل کر کے مٹی ہے۔۔۔ اور آپ کتنی آسانی سے ایک قاتل کو معاف کر رہی ہیں۔ اس لیے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ اکیس سال تک اس گھر میں اس کا نام تک نہ لیا گیا اور اب اب اس شخص کو جس کی وجہ سے سادات مگر طوقانوں کی پیٹ میں آیا تھا۔ اس گھر میں داماد کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ کل کو مسرت جہاں کے لیے بھی اس گھر کا دروازہ کھل جائے گا۔۔۔ سب کچھ دیا ہی ہو جائے گا لیکن کیا اماں کی زندگی اتنی ارزاں تھی کہ جسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ اماں بی! وہ اس گھر میں آئی تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔“ عارب شاہ فیصلہ کن لہجے میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ اماں بی سر دی آہ بھر کر رہ گئیں۔

ادھر فرجاد جب سے سادات مگر میں آیا تھا وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی رہتا کبھی کبھار لان میں ٹھکا تو ایک گوشے میں بیٹھا رہتا۔ کینک سے آنے کے بعد اسے دورہ بھی نہیں پڑتا تھا۔ باہر شاہ اس کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ محض دو تین دنوں میں ہی اس کی آنکھوں میں کچھ چمک آگئی تھی۔ زاہدہ چچی اس کی خوراک اور دوا کا بہت باقاعدگی سے خیال رکھ رہی تھیں۔ باہر شاہ ایک دن اسے بھر کینک سیلون بھی لے گئے تھے۔ ہال ترشوانے اور شیو کروانے کے بعد اس کی شخصیت بہت نکمری نکمری لگنے لگی تھی۔ باہر شاہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ گھر کے بڑوں کی نسبت بچوں کے درمیان بیٹھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ گھر کے سب ہی بچے اور نوجوان اس کے قریب رہنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ فواد بھی ان میں شامل ہونے لگے۔ فرجاد ملک کے لیے یہ نیا بہت فرالی اور اچھوتی سی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے سب اس کے ساتھ یوں فرینک ہو گئے تھے جیسے وہ شروع سے ہی اس گھر کا ایک فرد رہا ہو۔ اس کی ذہنی کیفیت آہستہ آہستہ اعتدال پر آنے لگی تھی۔

آج سب کزنز فواد کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور فرجاد کو بھی اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔ پہلے بڑے کزنز کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ ہوا۔۔۔ کافی دیر تک شعر و شاعری ہوتی رہی پھر اپنے اپنے قصے سناتے شروع کر دیے۔ چھوٹے بچے پورے لگ گئے۔

”نہدی بھائی! ہم پورہ رہے ہیں۔“ طاہر منہ بسور کر بولا۔ بڑوں کی محفل میں انہیں کیا مزہ آتا تھا۔

”تو پھر کیا کیا چاہئے۔۔۔“ فواد نے مسکرا کر کہا۔

”یہ کیا چاہئے۔۔۔ کہ ہمیں کہانی سنائی جائے۔“ ہاسر نے مشورہ دیا۔

”کہانی۔۔۔ اوں۔۔۔ جیٹا کہانی تو عمر۔ ہوا پڑھنی چھوڑ دی سو یاد نہیں ہاں۔۔۔ ایسا کرتے ہیں اٹل سے کہتے ہیں کہ وہ تم سب کو کوئی کہانی سنائیں۔“ فواد نے فرجاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل ٹھیک۔۔۔“ ہاسر چمک کر بولا اور پھر ہاسر، اطہر، طاہر اور حسنین نے بھی فرجاد کے گرد کیر اڈال لیا۔

”ہاں اٹل! ہمیں کہانی سنائیں۔۔۔“

”کہانی۔۔۔“ فرجاد نے ان سب کی طرف دیکھا۔

”جی۔۔۔ ہم نے آج آپ سے کہانی سنی ہے۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔“ حسنین نے کہا۔

”نادیں اٹل! ورنہ یہ نمونے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے۔“ ایتھ نے کہا تو فرجاد نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے ننھے سنے دوستو! ایک کہانی یاد تو ہے مجھے لیکن تم بور تو نہیں ہو گے۔“ فرجاد نے کہا۔

”نہیں اٹل! ہم بور نہیں ہوں گے لیکن کہانی میں دیو ہوں گے ناں۔“ ہارر کا دلدادہ اطہر اشتیاق سے لبریز لہجے میں بولا۔

”ہاں اس کہانی میں ایک شہزادہ ہے اور ایک شہزادی۔ اور پوچھ بھی ہیں۔“ سب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ فواد بہت غور سے فرجاد کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس کی ذہنی کیپ اٹھانی کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ فرجاد نے سر جھکا لیا۔ اب صرف چھوٹے بچے ہی نہیں ایتھ، رویہ، آریان، مہوش، شاذان سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”یہ کہانی ایک شہزادی کی ہے ایک انتہائی خوبصورت اور پیاری سی شہزادی کی۔۔۔ وہ بادشاہ کی

اکوٹی بیٹی تھی اور بہت لاڈ پیار میں پلی گئی۔ شہزادی کو پتا ہے کیا عادت تھی؟“

”کیا۔۔۔؟“

”وہ سادون میں جھولے جھولا کرتی تھی۔ گیت گایا کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشیاں ہی

خوشیاں تھیں۔ رنگ ہی رنگ تھے۔۔۔ پھر ایک دن اس شہزادی کی ملاقات ایک شہزادے کے ساتھ ہوئی

لیکن وہ شہزادہ اس کی طرح نہ تو امیر تھا اور نہ ہی لاڈلا۔۔۔“

”اٹل۔۔۔ کیا شہزادے بھی غریب ہوتے ہیں۔۔۔؟“ ہاسر معصومیت سے بولا تو فرجاد نے مسکرا کر اس کا محال چھتیا لیا۔

”ہاں! کبھی کبھی شہزادے بھی غریب ہوتے ہیں۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس مدرسے میں شہزادی

پڑھنے جاتی تھی شہزادہ بھی اسی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ شہزادے کو شہزادی کی پیاری پیاری صورت اور اس

پڑھنے جاتی تھی شہزادہ بھی اسی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ شہزادے کو شہزادی کی پیاری پیاری صورت اور اس

کا بھولیں بہت اچھا لگا وہ اس سے چپکے چپکے پیار کرنے لگا۔
 ”انکل ہمیں تو نہیں پتا پیار کیسے ہوتا ہے؟“

”جب بڑے ہو گے تو سمجھ جاؤ گے۔ فی الحال چپ کر کے کہانی سنو۔“ شاذان نے اطہر کے سر پر ہلکی سی چیت لگائی۔

”ایک دن موقع پا کر شہزادے نے شہزادی کو بتا دیا کہ وہ اسے بہت چاہتا ہے۔ شہزادی پہلے تو بہت گھبرائی، کسمپاسی لیکن آخر کار اس نے شہزادے کی محبت قبول کر لی۔ پھر وہ ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ شہزادی کا باپ بہت سخت بادشاہ تھا۔ شہزادی اس سے ڈرتی بھی بہت تھی لیکن شہزادے کی محبت کی وجہ سے اس میں کچھ ہمت آ گئی۔ اس نے شہزادے سے کہا کہ وہ بادشاہ سے اس کا ہاتھ مانگ لے۔“

”اس کا بھلا کیا مطلب ہوا؟“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بادشاہ سے درخواست کرے کہ وہ شہزادی کی شادی اس کے ساتھ کر دے۔“

”تو کیا بادشاہ نے ان دونوں کی شادی کر دی۔“ طاہر غلٹ میں بولا۔

”تم سچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ تو شاید ہو جائے۔ ظالم سماج کی طرح بار بار سامنے آکرے ہوتے ہو۔“ شاذان طاہر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا تو فرجاد نے مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا۔

”نہیں بیٹا! ان کی شادی نہیں ہو سکتی تھی شہزادی امیر تھی اور شہزادہ غریب۔ پھر بھی شہزادے سے بادشاہ سے کہا کہ وہ شہزادی کو ہر طرح خوش رکھ سکتا ہے۔ پر بادشاہ نے شہزادے کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ شہزادی کے پانچ بھائی جو اصل میں دیوتے تھے وہ اس شہزادے کے دشمن ہو گئے۔ شہزادہ اپنے گھر چلا گیا چپ چاپ لیکن شہزادی کو بادشاہ کے رویے پر بہت دکھ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شہزادے کے ساتھ چلی جائے گی اپنا محل اور ساری دولت چھوڑ کر۔“ فرجاد کی نگاہیں دور خلاؤں کے پار جیسے کسی نقطے پر مرکوز تھیں۔ باہر سے گزرتے ہوئے باہر شاہ وہیں کھڑکی کے قریب رک گئے تھے۔

”پھر کیا ہوا انکل۔ کیا شہزادے کو دیوؤں نے مارا؟“

”نہیں۔ شہزادہ ان کے ہاتھ ہی نہیں آیا لیکن انہوں نے شہزادی پر ظلم ڈھانے شروع کر دیے۔ ایک دن شہزادی تنگ آ کر اپنا سب کچھ چھوڑ کر شہزادے کے پاس چلی گئی۔“

”واہ یہ ہوئی تاباں بات۔ بڑی بہادر شہزادی تھی۔“ شاذان خوش ہو کر بولا۔

”ہاں شہزادی بہت بہادر اور حوصلے والی تھی۔ شہزادے نے اس شہزادی کا ملک چھوڑ دیا اور اسے لے کر ایک دوسرے ملک میں اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا۔ وہاں جا کر شہزادے نے ایک چھوٹا

سا گھر بنایا اور اپنے دوست کے ساتھ کاروبار کرنے لگا۔ ان دونوں کی زندگی میں بہت سکون تھا۔ اور پھر جب انہیں یہ پتا چلا کہ ان کے گھر ایک اور نسا شہزادہ یا شہزادی آنے والا ہے تو وہ دونوں خوشی سے پاگل ہو گئے۔ شہزادہ جی جان سے اس کا خیال رکھتا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری۔ لیکن شہزادے کا دوست در پردہ اس کا دشمن بننا چلا گیا۔ اس کی نیت شہزادے کی دولت پر بھی تھی اور شہزادی پر بھی۔ پھر جب ایک دن وہ کام کے سلسلے میں کسی دوسرے ملک گئے ہوئے تھے۔ شہزادے کے دوست نے سیر کا پروگرام بنایا اور پھر جب سیر کرنے کے لیے وہ کسی پہاڑی علاقے میں گئے تو شہزادے کے دوست نے اسے پہاڑ سے دھکا دے دیا۔“

”تو کیا شہزادہ مر گیا اور انکل۔۔۔ اس ننھے ننھے شہزادے کا کیا بیٹا۔“ انا جو بڑی محبوبیت سے سن رہی تھی اسے کہانی میں یہیں دلچسپی محسوس ہوئی۔ فواد اس سارے دورانیے میں نہایت خاموشی سے فرجاد کا جائزہ لیتے رہے۔

”پتا نہیں شہزادہ مر گیا یا بچ گیا۔ یہ بھی نہیں پتا کہ نسا شہزادہ تھا یا شہزادی۔ شہزادے کو تو اپنی شہزادی کی بھی خبر نہیں ہوگی کہ وہ کس حال میں ہوگی۔“ بات ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”انکل کہاں جا رہے ہیں آپ۔۔۔“

”میں۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔۔۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔۔۔“ وہ یکدم ہی ڈسٹرب نظر آنے لگا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد بہت آہستہ سب ہی اٹھ کر پہلے گئے تو باہر شاہ اندر داخل ہوئے۔

”فہدی۔ کیا ہو رہا تھا بیٹا۔“ وہ کہتے ہوئے فواد کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

”ابو۔۔۔ کچھ خاص نہیں اصل میں انکل جب سے آئے ہیں بالکل خاموش خاموش رہتے ہیں۔ سو ان کو ذرا انجوائے کرانے لے بیٹھے تھے کہ شاید ماحول کی خوشگواریت ان کی سوگاری کو کم کر دے۔“

”تو اس نے تم لوگوں کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیا یا نہیں۔“

”بچوں کو ایک کہانی سنائی بس۔“

”اس کے بولنے سے کچھ اندازہ لگایا تم نے۔“ باہر شاہ نے پوچھا۔

”جی ابو! وہ ٹانکھی قاتیو پرسٹ ٹھیک ہو چکے ہیں بس ایک محض خول سا ہے جو انہوں نے اپنے ارد گرد چڑھا رکھا ہے۔ جب یہ خول بھی نوٹ کیا تو سمجھیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ اور عین بہت جلد ہوگا۔“ فواد نے یقین لہجے میں بولے۔ اس کی کہانی بچوں کے لیے تھی لیکن فواد کو بہت سے کلیول گئے انہیں لگا یہ اس کی اپنی کہانی تھی۔

گویا فرجاد کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اس کا ذمہ دار اس کا دوست ہے اور پھپھو کے ساتھ جانے اس نے کیا سلوک روا رکھا ہوگا... کیا خبر وہ زندہ بھی ہیں یا... فواد اس سے آگے نہ سوچ سکے۔

”تم کس سوچ میں گم ہو گئے؟ میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ ایس بی صاحب دو تین دنوں کے لیے لاہور جا رہے ہیں، اپنے آفیشل کام کے سلسلے میں اور انہوں نے ہمیں بھی ساتھ جانے کو کہا ہے تاکہ آریان والا معاملہ بھی لگے ہاتھوں نمٹا لیا جائے۔“ بابر شاہ نے ظاہر ہی نہ کیا کہ وہ فرجاد کی ساری کہانی سن چکے تھے اور مسرت جہاں کے معاملے میں بھی قدرے مایوس تھے۔ اس لیے کہ فرجاد اب ٹھیک ہو بھی جاتا تو انہیں مسرت جہاں کے بارے میں شاید کچھ نہ بتا پاتا۔ بہر حال یہ تو بعد کی باتیں تھیں پہلے جو مسئلہ ان کے سامنے تھا اس کا حل بہت ضروری تھا۔

”تو ٹھیک ہے ابو چلے چلتے ہیں ان کے ساتھ۔“ فواد نے بھی ہائی بھری۔ رات میں اماں بی کے کمرے میں جب بابر شاہ نے یہی بات تفصیل سے بتائی تو اظہر شاہ بھی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ اماں بی خوش تھیں کہ آریان کی طرف اب میلی نگاہیں نہیں اٹھیں گی۔ اب وہ ایک گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہوگی۔

”اماں بی آریان کے ساتھ ساتھ اس کی والدہ کا بھی رہائی پانا ضروری ہے ورنہ یہ آزاد ہونے کے باوجود کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔“ بابر شاہ نے کہا۔

”اور ابو دوسری بات یہ ہے کہ وہ بھی اس کی طرح بے گناہ ہیں، وہ کوئی پیشہ ور نہیں ہیں۔ ستارہ بیگم ان کی مجبوری کا سودا کرتی رہی ہے۔“ فواد نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اب ستارہ بیگم سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔“ اظہر شاہ جوش سے بولے۔ علی الصبح وہ تینوں جانے کو تیار کھڑے تھے۔ سبھی گھر والے انہیں رخصت کرنے گیت تک آئے۔ اماں بی نے تینوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، پیشانی چومی اور دعائیں دیں۔ آریان اماں بی کے کندھے سے لگی کھڑی تھی۔ فواد اماں بی سے پیار وصول کرنے کے بعد جانے کے لیے پٹے پھر کچھ سوچ کر رک گئے۔۔۔۔۔ رخ موز کر شریر نظروں سے آریان کی طرف دیکھ کر بولے۔

”مانا کہ آپ دعائیں نہیں دے سکتیں لیکن دعا کر تو سکتی ہیں۔“ آریان جھینپ گئی۔

”میں دعا کروں گی۔۔۔۔۔“

”بہت بہت شکریہ۔۔۔۔۔ بڑی نوازش۔۔۔۔۔“ لہجہ شرارتی اور آنکھوں میں جھللاتی جوت۔ آریان نے خود کو اماں بی کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔

”اب آ جاؤ۔۔۔۔۔ ایس بی صاحب ہمارے انتظار میں بیٹھے نہیں رہیں گے۔۔۔۔۔ فلائٹ میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔“ اظہر چچا نے ہانک لگائی تو وہ مسکراتے ہوئے سب کو خدا حافظ کہہ کر گیت سے باہر نکل

گئے۔۔۔۔۔ آریان جانتی تھی کہ وہ ناممکن کو ممکن بنانے نکلے ہیں۔ اماں بی کے ہاتھ میں تسبیح کے دانے اوپر تلے گر رہے تھے اور ہونٹوں پر جانے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

”الٹی۔۔۔۔۔ تو جانتا ہے میرے بچے ایک نیک کام کی تکمیل کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ تیرا حکم ہے برائی کو روکو، زبان سے ہاتھ سے کسی بھی طرح اور میرے بچے برائی کو روکنے کی خواہش لے کر گئے ہیں۔“ مولانا کی مدد کرتا۔۔۔۔۔ اس بچی کی عزت کا اب تو ہی محافظ ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ آریان بھی باقی سب کے ساتھ واپس ہوئی تھی یہ اور بات کہ اس کا رواں رواں فواد، بابر شاہ اور اظہر شاہ کی کامیابی کے لیے دعا گو تھا۔

لاہور پہنچ کر ایس بی صاحب ان تینوں کے ہمراہ پہلے اپنی عارضی قیام گاہ گئے جہاں انہوں نے ان تینوں کی رہائش کا بندوبست کروایا اور پھر سب سی فرنیچر ہو کر لاہور کے ایس بی زاہد صاحب کے آفس چل پڑے۔ وجہ یہ تھی کہ کامران صاحب سرکاری دورے پر تھے اس لیے انہوں نے اپنے ریٹ نام میں ان کا معاملہ دیکھنا تھا۔ سودقت ضائع کئے بغیر وہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر زاہد صاحب کی طرف آ گئے۔ وہاں ان کا بہت اچھی طرح استقبال کیا گیا۔ زاہد صاحب پولیس میں ہونے کے باوجود خاصی خوشگوار طبیعت کے مالک تھے۔

”زاہد بھائی! ہم ایک بہت اہم معاملے پر آپ سے ڈسکس کرنا چاہ رہے تھے اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابھی لاہور پہنچے ہیں اور بغیر ریٹ کئے آپ کی طرف آ گئے۔“ کامران نے بات شروع کی۔

”اس کا مطلب ہے کوئی بہت اہم مسئلہ ہے۔۔۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ بہت اہم اور انتہائی نازک بھی لیکن آپ کی پہنچ میں ہے۔ آپ چاہیں تو سلجھ جائے گا۔“ کامران بہت اچھے طریقے سے انہیں اپنے ٹریک پر لا رہے تھے۔

”ارے یار جب اپنی پہنچ میں ہے تو پھر پریشانی کا بہنے کی۔۔۔۔۔ جلدی سے بتاؤ۔“ زاہد صاحب سیدھے کرسی پر ہو بیٹھے۔ کامران نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ میرے بھائی معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔۔۔۔۔ بڑے سبب سے حل کرنا پڑے گا۔ ستارہ بیگم کا نام تو بڑے اونچے اسٹیشن کے لوگوں میں لیا جاتا ہے، بڑی مضبوط معاشرتی ساکھ رکھتی ہے وہ۔۔۔۔۔ اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں۔“ زاہد صاحب سنجیدگی سے بولے۔

”کیا مطلب؟ کیا پولیس اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔“

”ارے بھائی میرے! پولیس کا خیال تو تم اپنے ذہن سے نکال بی دو۔۔۔۔۔ قانون اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہم اس پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اس کا محض ایک فون پورے تھانے کے عمل کی

گو یا فرجاد کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اس کا ذمہ دار اس کا دوست ہے اور پھپھو کے ساتھ جانے اس نے کیا سلوک روار کھا ہوگا۔ کیا خبر وہ زندہ بھی ہیں یا۔۔۔ فواد اس سے آگے نہ سوچ سکے۔

”تم کس سوچ میں گم ہو گئے؟ میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ ایس بی صاحب دو تین دنوں کے لیے لاہور جا رہے ہیں، اپنے آفیشل کام کے سلسلے میں اور انہوں نے ہمیں بھی ساتھ جانے کو کہا ہے تاکہ آریان والا معاملہ بھی لگے ہاتھوں نمٹا لیا جائے۔“ بابر شاہ نے ظاہر ہی نہ کیا کہ وہ فرجاد کی ساری کہانی سن چکے تھے اور مسرت جہاں کے معاملے میں بھی قدرے مایوس تھے۔ اس لیے کہ فرجاد اب ٹھیک ہو بھی جاتا تو انہیں مسرت جہاں کے بارے میں شاید کچھ نہ بتا پاتا۔ بہر حال یہ تو بعد کی باتیں تھیں پہلے جو مسئلہ ان کے سامنے تھا اس کا حل بہت ضروری تھا۔

”تو ٹھیک ہے ابو چلے چلتے ہیں ان کے ساتھ۔“ فواد نے بھی ہامی بھری۔ رات میں اماں بی کے کمرے میں جب بابر شاہ نے یہی بات تفصیل سے بتائی تو اظہر شاہ بھی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ اماں بی خوش تھیں کہ آریان کی طرف اب پہلی گام ہیں نہیں اٹھیں گی۔ اب وہ ایک گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہو گئی۔

”اماں بی آریان کے ساتھ ساتھ اس کی والدہ کا بھی رہائی پانا ضروری ہے ورنہ یہ آزاد ہونے کے باوجود کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔“ بابر شاہ نے کہا۔

”اور ابو دوسری بات یہ ہے کہ وہ بھی اس کی طرح بے گناہ ہیں، وہ کوئی پیشہ ور نہیں ہیں۔ ستارہ بیگم ان کی مجبوری کا سودا کرتی رہی ہے۔“ فواد نے کہا۔

”ہاں۔۔۔ اب ستارہ بیگم سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔“ اظہر شاہ جوش سے بولے۔ علی الصبح وہ تینوں جانے کو تیار کھڑے تھے۔ بھی گھر والے انہیں رخصت کرنے کیٹ تک آئے۔ اماں بی نے تینوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، پیشانی چومی اور دعائیں دیں۔ آریان اماں بی کے کندھے سے لگی کھڑی تھی۔ فواد اماں بی سے پیار وصول کرنے کے بعد جانے کے لیے پلٹے پھر کچھ سوچ کر رک گئے۔

رخ موڑ کر شریر نظروں سے آریان کی طرف دیکھ کر بولے۔

”مانا کہ آپ دعائیں نہیں دے سکتیں لیکن دعا کر تو سکتی ہیں۔“ آریان جھینپ گئی۔

”میں دعا کروں گی۔“

”بہت بہت شکر یہ۔۔۔ بڑی نوازش۔۔۔“ لہجہ شرارتی اور آنکھوں میں جھلملاتی جوت۔ آریان نے خود کو اماں بی کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔

”اب آجاؤ۔۔۔ ایس بی صاحب ہمارے انتظار میں بیٹھے نہیں رہیں گے۔۔۔ فلائٹ میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔“ اظہر بچانے ہانک لگائی تو وہ مسکراتے ہوئے سب کو خدا حافظ کہہ کر گیٹ سے باہر نکل

گئے۔ آریان جانتی تھی کہ وہ ناممکن کو ممکن بنانے نکلے ہیں۔ اماں بی کے ہاتھ میں تسبیح کے دانے اوپر تلے گر رہے تھے اور ہونٹوں پر جانے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

”الٹی۔۔۔ تو جانتا ہے میرے بچے ایک نیک کام کی تکمیل کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ تیرا حکم ہے برائی کو روکو، زبان سے ہاتھ سے کسی بھی طرح اور میرے بچے برائی کو روکنے کی خواہش لے کر گئے ہیں۔ سولہ! تو ان کی مدد کرنا۔۔۔ اس بچی کی عزت کا اب تو ہی محافظ ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ آریان بھی باقی سب کے ساتھ واپس ہوئی تھی یہ اور بات کہ اس کا رواں رواں فواد، بابر شاہ اور اظہر شاہ کی کامیابی کے لیے دعا گو تھا۔

لاہور پہنچ کر ایس بی صاحب ان تینوں کے ہمراہ پہلے اپنی عارضی قیام گاہ گئے جہاں انہوں نے ان تینوں کی رہائش کا بندوبست کر دیا اور پھر سب ہی فرنیشر ہو کر لاہور کے ایس بی زاہد صاحب کے آفس چل پڑے۔ وجہ یہ تھی کہ کامران صاحب سرکاری دورے پر تھے اس لیے انہوں نے اپنے ریٹ نام میں ان کا معاملہ دیکھنا تھا۔ سو وقت ضائع کئے بغیر وہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر زاہد صاحب کی طرف آ گئے۔ وہاں ان کا بہت اچھی طرح استقبال کیا گیا۔ زاہد صاحب پولیس میں ہونے کے باوجود خاصی خوشنوا طبیعت کے مالک تھے۔

”زاہد بھائی! ہم ایک بہت اہم معاملے پر آپ سے ڈسکس کرنا چاہ رہے تھے اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابھی لاہور پہنچے ہیں اور بغیر ریٹ کئے آپ کی طرف آ گئے۔“ کامران نے بات شروع کی۔

”اس کا مطلب ہے کوئی بہت اہم مسئلہ ہے۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔ بہت اہم اور انتہائی نازک بھی لیکن آپ کی پہنچ میں ہے۔ آپ چاہیں تو سلجھ جائے گا۔“ کامران بہت اچھے طریقے سے انہیں اپنے نزدیک پر لا رہے تھے۔

”ارے یار جب اپنی پہنچ میں ہے تو پھر پریشانی کا بہنے کی۔۔۔ جلدی سے بتاؤ۔“ زاہد صاحب سیدھے کرسی پر ہو بیٹھے۔ کامران نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

”ہوں۔۔۔ میرے بھائی معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔۔۔ بڑے سجاؤ سے حل کرنا پڑے گا۔ ستارہ بیگم کا نام تو بڑے اونچے اسٹیشن کے لوگوں میں لیا جاتا ہے، بڑی مضبوط معاشرتی ساکھ رکھتی ہے وہ۔ اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں۔“ زاہد صاحب سنجیدگی سے بولے۔

”کیا مطلب؟ کیا پولیس اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔“

”ارے بھائی میرے! پولیس کا خیال تو تم اپنے ذہن سے نکال ہی دو۔ قانون اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہم اس پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اس کا مقرر ایک فون پورے تھانے کے عملے کی

پیشیاں اتر داسکتا ہے۔۔۔۔۔

”تو پھر۔۔۔۔۔“ کامران شش و پنج میں مبتلا ہو کر بولے۔

”تو پھر یہ کہ اس کو کسی قسم کی دھمکی دینے کی بجائے۔۔۔۔۔ اس پر کوئی دباؤ ڈالنے کی بجائے اس سے طریقے سے بات کرنی ہوگی۔“ زاہد صاحب نے کہا

”وہی تو پوچھ رہے ہیں وہ کون سا طریقہ ہے۔“ فواد پہلی بار بولے۔ باہر شاہ اور اظہر اس تمام وقت میں خاموش رہے۔

”یہ اس طرح کہ ہمیں خود کو اس کے رنگ میں رنگ کر اس سے ملاقات کرنی ہوگی، ہم ایک خریدار کی حیثیت سے اس سے متعارف ہوں گے، بعد میں آہستہ آہستہ اس کو اپنی لائن پر لے آئیں گے۔“

”لگتا ہے ستارہ بیگم کی بڑی دہشت ہے لاہور میں۔“ اظہر شاہ طنز سے بھرپور لہجے میں بولے۔ انہیں ایس بی زاہد جیسے عہدیدار کے منہ سے ایک طوائف کے بارے میں اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔

”دیکھئے جناب! ہم اس سے ڈرتے نہیں لیکن مصلحت سے کام لیتے ہیں، ہم اس پر دباؤ ڈالنا چاہیں تو ڈال سکتے ہیں لیکن جواب میں کیا ہوگا۔ کسی وزیر کسی شیر کا بھانجا، بھتیجا، بیٹا اس کے ہاں آنے جانے والا چند لکھوں میں ہی اس کی جان چھڑوادے گا۔ یہ ایک جین ہے میرے بھائی۔ بڑے بڑے عہدیداروں اور کوٹھے والوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے یہاں مصلحت سے کام لینا ہماری مجبوری ہے۔ بہر حال آپ کامران کے ساتھ آئے ہیں سو میرے لیے انتہائی محترم ہیں۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ پہلی فرصت میں آپ کا کام کیا جائے جس کی خاطر آپ اتنی دور سے یہاں آئے۔“

زاہد صاحب اظہر شاہ کے طنز کو نظر انداز کر کے بہت دھیمے لہجے میں بولے۔

”تو بھائی اس مسئلے پر اب کرتا کیا ہے؟“ کامران نے سوال کیا۔

”کامران آج تو دو تین بہت ضروری کام ہیں۔۔۔۔۔ کل شام دو چار سول کپڑوں میں پولیس والوں کے ہمراہ وہاں چلے چلیں گے، ماحول بھی دیکھ لیں گے اور مناسب وقت دیکھ کر ستارہ بیگم سے بات بھی کر لیں گے۔“

”پھر ہم چلیں۔۔۔۔۔“ کامران اٹھے تو فواد، باہر شاہ اور اظہر شاہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ایز بولائیک۔۔۔۔۔ لیکن کل شام تیار رہنا۔“ سب سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے کامران سے کہا تو سر ہلاتے ہوئے ان تینوں کے ہمراہ آفس سے باہر نکل آئے۔ باہر شاہ اس دوران کچھ نہیں بولے تھے لیکن سوچوں کا ایک طویل آسمان تھا جس پر ان کا تخیل محو پرواز تھا۔

☆.....☆.....☆

آج کا دن اپنے جلو میں بہت سی ہلچل لیے آیا تھا۔ ستارہ بیگم کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ شہر کے ایس بی صاحب آج اس کے دولت کدے کو رونق بخشنے آرہے تھے۔ صبح انہوں نے فون کر کے اپنی آمد کا بتا دیا تھا اور ستارہ بیگم اچھی طرح جانتی تھی کہ ان اونچے لوگوں کو کس طرح مٹھی میں کیا جاتا ہے۔

”ارے گھٹکھرو! جاذب رانیلو کی طرف۔“ سمجھا دیا اسے کہ آج کسی تلاش بین نے نہیں آنا۔ کوئی مجرا نہیں ہو رہا۔“ ستارہ بیگم نے پاس سے گزرتے غلام عباس کو روک کر کہا تو وہ حیران سے ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”بڑی بائی جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے برسوں پرانا اصول ٹوٹ جائے گا۔ لوگ ہمارے کو خٹے کا رخ کرنا چھوڑ دیں گے۔“ غلام عباس نے کہا۔

”ارے ہم نے یہ اس لیے کہا کہ کوئی عام تلاش بین نہ آئے۔ آج خاص پروگرام ہے صرف خاص بندوں کے لیے سمجھا کیا۔“ ستارہ بیگم کا معنی خیر لہجہ ان کی سمجھ میں آ گیا۔

”ٹھیک ہے بائی جی میں جا کے کہے دیتا ہوں۔“ غلام عباس بیرونی سیڑھیوں کی طرف لپکے۔

نیلو کہنے کو تو اس بازار میں ایک پھولوں والی تھی لیکن کس کو خٹے پر کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ کس طوائف کا لیا چکر ہے اور کون یہاں سے فرار ہونے کو پر تول رہی ہے، اسے سب خبر ہوتی تھی۔ اب بھی یہ خبر اس نے منٹوں میں سارے بازار میں پھیلا دی تھی اور نتیجہ ستارہ بیگم کی مرضی کے مطابق ہی نکلتا تھا۔ سواں طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے چندن کو بلا کر کوٹھے کی صفائی، ستھرائی، تزئین و ترتیب اس کے ذمے لگائی۔ سجنو اس کو خٹے کا پرانا سا ہوکا رہا تھا۔ خاص شربت کی ساری سپلائی وہی کیا کرتا تھا۔ ستارہ بیگم نے اسے بھی فون کر دیا۔ آج کی شام وہ کسی طور بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سواپنی طرف سے کیل کانٹوں سے لیس ہو کر میدان میں اترنے کی تیاری کر رہی تھی۔ چاندنی کے کمرے میں آ کر ایک پل کو رک کر اس نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔

”چاندنی! تیرے کو کیا ہے ری۔۔۔۔۔ کیوں منہ سر پینے پڑی ہے؟“ چاندنی کو بستر پر دراز دیکھ کر وہ بولی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”شام میں ایس بی صاحب آرہے ہیں چند خاص مہمانوں کے ساتھ۔ محفل میں کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہئے۔۔۔۔۔ بستر چھوڑ اور تیاری کر۔۔۔۔۔ چل اٹھ شاباش۔“

”باپی جی! آج میں محفل نہیں کر سکوں گی۔۔۔۔۔ دو تین دن سے مجھے شدید بخار ہو رہا ہے۔“ چاندنی نے اسے ٹالنا چاہا۔

”نہ چاندنی! ایسا نہ کر۔۔۔۔۔“ اس نے کہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولی۔ ”چل ٹھیک ہے

زیادہ نہیں پر ایک گیت تو تجھے گانا پڑے گا۔ ایس پی ٹی میں آ گیا تو سمجھ لاہور پر راج ہو جائے گا ہمارا۔
دوسرے کوٹھوں والے چلیں گے۔“ ستارہ بیگم خلا میں نظریں جماتے ہوئے بولی۔

”اچھا.....“ چاندنی آزدہ لہجے میں بولی۔ ایک طویل عرصہ ہو چکا تھا اسے یونہی اپنی مستی کا خون کرتے ہوئے..... ستارہ بیگم ماں نہیں تھی..... بہن نہیں تھی..... کسی کی بیٹی نہیں تھی..... بس ایک طوائف تھی۔ بھلا وہ ایک ماں کے جذبات و احساس کو کیا سمجھتی اور چاندنی کی مجبور مستی ستارہ بیگم کی خواہشات کے ہاتھوں میں کٹ چکی تھی۔ وہ چپ چاپ سب حکم مانتی رہی تھی صرف اس لیے کہ اس کا کوئی قدم اس کی معصوم بیٹی کے راستے میں کانٹے نہ بچھا دے لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا ایسی جگہ پر قیام اس کی بیٹی کی زندگی کا ایک حصہ ہے وہ چاہنے کے باوجود بھی اس کی پہچان بن گئی تھی۔ اس کی جدائی کا زہر پیتے پیتے اس کی روح نکلی ہو گئی تھی لیکن ستارہ بیگم ایک جیل تھی اور آریان ایک ننھا سا چوزہ..... جب تک وہ کسی محفوظ جائے پناہ پر نہیں پہنچ پاتی اسے چین کیسے آسکتا تھا۔ غلام عباس نے اس کی تسلی تو کر دی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی مستی کے ہاتھوں مجبور تھی اور جھپٹے دو چار دنوں سے بس اس کا ذہن سوچوں کی انہی بھول بھلیوں میں سفر کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ وہ اس ماحول سے فرار چاہتی تھی۔ کسی ایسی جگہ چلی جانا چاہتی تھی جہاں اس کے ماتھے کا یہ سیاہ داغ لوگوں کی نظروں میں نہ آتا۔

ستارہ بیگم کمرے سے نکل گئی تو چاندنی بستر پر اٹھ بیٹھی۔ دائیں طرف دیوار میں لگے قد آدم آئینے میں اس نے اپنے منہ پر سرائے پر بھر پور نگاہ ڈالی، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اپنی چمک اور رعنائی تقریباً کھو چکی تھیں۔ سیاہ گھنیری زلفوں کے نیچے کہیں کہیں سفید چاندی کے تار دکھائی دے رہے تھے۔ حادثہ زمانہ نے اس کی صبیح پیشانی پر چند ریکھائیں کھینچ ڈالی تھیں۔ وہ پھٹکی سی ہنسی ہنس دی۔

”گویا میری سزا اب ختم ہونے والی ہے، چڑھتے سورج کے پجاریوں کو ڈھلتے ہوئے سورج کی پھٹکی روشنی کہاں بھا سکتی ہے۔“ وہ دل میں خود سے مخاطب تھی۔ اس کی چمک ماند پڑ رہی تھی اور ستارہ بیگم کی جہاندیدہ نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ چراغ اب کم روشنی دے رہا ہے سو اس کا نعم البدل اس نے آریان میں تلاش کر لیا۔

”تمہاری سزا ختم نہیں ہوئی چاندنی بی بی بس اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔“ چاندنی کے دماغ نے سرگوشی کی۔

”کیا مطلب؟“ وہ جیسے تڑپ اٹھی۔

”ہاں! اصل سزا تو اب شروع ہوئی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو اس لیے اب اس کوٹھے کے ایک سنور میں تمہارے لیے تھوڑی سی جگہ بنا کی جائے گی جہاں زندگی کے آخری ایام نوے فیصد طوائفوں کی طرح تم خون تھوکتے اور بیمار یوں سے مدد سر پیکار ہو کر گزار دو گی..... لیکن چاندنی! تمہاری جگہ کون لے گا.....“

آریان..... آریان لے گی تمہاری جگہ..... اس کے پیروں میں گھٹکروں ہوں گے اور زلفوں میں پھول۔ اب تمہاری جگہ وہ تماشا بینوں کی نگلی نظروں کا سامنا کرے گی۔“ دماغ ایک حقیقت کا نشتر اس کی روح میں اتار رہا تھا اور وہ تڑپ رہی تھی۔

”نہیں! ایسا نہیں ہوگا..... میں..... میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

”پھر کیا کرو گی تم؟“ دماغ استہزائیہ انداز میں بولا۔

”کچھ بھی..... کچھ بھی کر گزروں گی لیکن، آریان کو یہاں سے بچاؤں گی.....“ چاندنی کرب میں ڈوبی آواز میں بڑبڑاتی۔ ”میں ستارہ بیگم کی ہر بات مانوں گی۔ بس اس سے التجا کروں گی کہ آریان کا پیچھا چھوڑ دے۔ وہ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دے، اس کے بدلے میں، میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ معصوم ارادہ کرتے ہوئے بستر سے اٹھی، گالوں پر پھسل آنے والے بے بس آنسو بے دردی سے ہتھیلی سے رگڑ ڈالے۔ آئینے سے صرف نظر کرتی وہ کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھی، شام کو محفل تھی تا اور اسے آنے والے خاص مہمانوں کا خاص انداز سے سواگت کرنا تھی۔ اپنے سر جھائے ہوئے پھولوں جیسے گالوں کو غارے سے تروتازہ کرنا تھا۔ اپنے سر اپنے کو قیامت خیز بنانا تھا، اسے بھولنا تھا کہ وہ ایک ماں ہے۔ بس وہ ایک طوائف ہے اور طوائف کبھی ماں، بہن، بیٹی نہیں ہوتی۔

سورج ڈھل چکا تھا۔ ارد گرد کے کوٹھوں پر آبادی ہونے لگی تھی۔ گھٹکروں اور طبلے کی تھاپ ہوا کے دوش پر چکرانے لگی تھیں لیکن خلاف معمول ستارہ بیگم کا کوٹھا آج خاموشیوں کی زد میں تھا۔ ارد گرد والے آج بڑے خوش تھے کہ ستارہ بیگم کے کوٹھے کی ویرانی ان کے کوٹھوں پر رونق بڑھانے کا باعث بن گئی تھی۔ خوش تو ستارہ بیگم بھی تھی لیکن اس کی خوشی کی وجہ کچھ اور تھی۔ سارا کوٹھا آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ ہال کمرے میں سرخ قالین بچھے ہوئے تھے اور چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ گدے بچھا کر گاؤں کے لگائے گئے تھے۔

ہال کے وسط میں چھت پر لگے فانوس کی روشنی نے عجیب سا جادوئی تاثر بنا دیا تھا۔ آنے والے مہمانوں کی دلچسپی کا ہر طرح سے سامان کر رکھا تھا ستارہ بیگم نے..... چاندنی آج ایک طویل عرصے بعد تیار ہوئی تھی۔ سفید خواب کے غرارے پر سرخ قمیض پہنے بڑا سا سرخ اور سفید کنٹر اسٹ کا دو پہن اوڑھے لمبے بالوں کی پٹیا میں موٹے کے پھول گوندھے ہوئے اور ہاتھوں، کانوں اور گلے میں پھولوں کے کہنے پہنے ہوئے وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ ستارہ بیگم نے بڑھ کر اس کی بلائیں لیں اور بولیں۔ ”اے چاندنی تو تو اب بھی قیامت ہے ری..... تیرے کو کتنا سمجھایا۔ آج ہماری لائن پر۔ ارے لگ جاتی تا دھندے سے تو دولت تیرے گھر کی باندی ہوتی، پر تو تو سودا کی بھلی رہی اسے۔ اب رانی بنیا کو سمجھا دے ہوں پر او، تیری بھی استاد ہے ری۔ کوئی بات نہیں۔ غلام عباس جا کر لے آوے گا اسے۔ ہم خود سمجھا لیں گے۔“ ستارہ

بیگم اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئی اور چاندنی جیسے پتھر کے مجسمے کی طرح وہیں گڑی کی گڑی رہ گئی۔
 ”یہ نظریں..... یہ آدم خور نظریں کھا جائیں گی اسے..... میری بیٹی کو کھا جائیں گے یہ سب لوگ مل کر..... یہ اسے جینے نہیں دیں گے۔“ وہ سکتے کی سی کیفیت میں گڑی تھی لیکن وجود کے اندر جیسے زلزلے برپا تھے۔ وہ مردہ قدموں سے چلتی وہاں اپنے کمرے میں لوٹ آئی، اس کی روح کسی پتے کی طرح لرز اٹھی تھی۔

میرے مولا! میری سزا معاف کر دے..... میرے پالنے والے تو جانتا ہے ایک پھونی سی خطا کی تھی لوگ تو کتنے بڑے بڑے گناہ کر کے بھی تیری زمین پر گردن اکڑا کر چلتے ہیں۔ اڑے میں تو جیتے جی مرنے لے رہی ہوں۔ پچھتاؤں کی آگ میں جل جل کر خاکستر ہوتی رہی ہوں۔ کب تک سزا دے گا مجھے..... کب تک خزاؤں کی زد میں رہے گا میرا وجود..... اسے رحیم و کریم! ایک ہی بار موت کیوں نہیں دے دیتا مجھے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ پتہ نہیں کتنا روچکی تھی وہ کہ آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو گئے تھے مگر شاید اس کے آنسو بھی اس کی طرح بے قیمت تھے۔ اوپر والے کو ان آنسوؤں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم..... جب ستارہ بیگم نے دروازہ سے اندر جھانکا۔

”چاندنی! مہمان آنے والے ہیں..... تیار رہتا۔“ اس نے جواب میں نہ سراٹھایا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی۔ ستارہ بیگم بھی اس کے جواب کا انتظار کرنے کی بجائے اپنی بات کر کے ہال کمرے کی طرف جانے لگی۔ اسی پہلے پیر دنی جانب سے غلام عباس آتا دکھائی دیا۔
 ”مہمان آگئے بڑی باقی جی۔“ اس نے آکر بتایا۔

ستارہ بیگم پر جوش انداز میں تیزی سے دروازے تک آئی۔ ایس پی صاحب کے ہمراہ چار افراد اور بھی تھے۔ ستارہ بیگم نے ان کے اندر داخل ہوتے ہی ہاتھ میں پکڑے پھول ان کے قدموں میں رکھ دیے۔



زندگی بھی بعض اوقات کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ جس گہری دلہیز پر پاؤں رکھنے پر اسے دھکے اور ٹھوکریں ملی تھیں جہاں کے درو دیوار نے اس کی تضحیک کی تھی جن رشتوں نے اس کی ذات کو اس کا جرم قرار دے کر تسلیم نہیں کیا تھا آج وہ ان سب کے درمیان تھا۔ ان کے قریب اتنا کہ ہر رشتے سے منسلک شخص کا قرب اسے میسر آ گیا تھا یہاں تک کہ اماں بی کی پیاسی نگاہوں میں بھی اس نے اپنے لیے ایک محبت بھرا سہا پایا تھا۔ ان سب کی توجہ اور محبتیں پا کر یقیناً وہ خود پر تازا ہوتا لیکن اب وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ آج بہت دنوں بعد اسے تنہائی میسر آئی تو پند در کا پناہ اس کے سامنے کھل گیا۔ وہ تنہائی کی

دشت سے گھبرا کر خود میں ہی پناہ ڈھونڈنے لگا۔

”وہ جو میری خاطر اس عایشان گھرانے کی عزت قدموں تلے روند کر میرے ساتھ مسفری کے خواب دیکھتے ہوئے دلہیز پار گئی۔ میں نے کیا کیا اس کے لیے..... کانٹے ہی کانٹے بچھا دیئے اس کی راہوں میں۔ اپنی محبت میں اندھا ہو کر میں نے اس پر بھی زندگی تنگ کر دی۔ خدا جانے کہاں ہوگی وہ کس حال میں ہوگی؟ اس کی کوکھ میں پلنے والی میری نشانی اس دنیا میں سانس بھی لے پائی ہوگی یا..... پہلی بار ان سوچوں نے اس کے وجود روح کو جھنجھوڑ ڈالا۔“

یہ سب بچے جو میرے ارد گرد اپنی محبتوں کا حصار کیے ہوئے ہیں جانتے ہیں کہ میں ان کے لیے غیر نہیں۔ ان کا اپنا ہوں۔ ایک ایسا رشتہ میرے وجود سے وابستہ ہے جس سے برسوں اس گھر کے کیمنوں نے نظریں چرا لی ہیں۔ یہ بچے میرے وجود میں اسی رشتے کی آسودگی ڈھونڈتے ہیں اور میں..... میں ان سب کی محبتوں کے آگے ہارنے لگتا ہوں۔ زندگی کے روز و شب میرے لیے محض اذیت کے سوا کچھ نہیں۔ محبتیں بچپن سے میرے لیے بس ایک حسین خواب رہی ہیں شاید یہ بچے جانتے ہیں کہ میں ہر زنجیر توڑ سکتا ہوں لیکن محبت کی زنجیر نہیں توڑ سکتا۔ تبھی تو میرے پیروں میں محبتوں کی بیڑیاں ڈال دی ہیں انہوں نے..... لیکن نہیں..... مجھے ان زنجیروں کو توڑنا ہوگا اس لیے نہیں کہ ان سب کو دکھ پہنچاؤں اس لیے کہ ان سب کو ان کے ایک کشیدہ حصے سے ملانے کے لیے..... مجھے یہاں سے جانا ہوگا، میں اسے تلاش کروں گا۔“

وہ خود کھائی کے سے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس وقت سادات گھر کے ہر کیمن کی نگاہیں اسی پر جمی ہیں۔ ہر ایک کی سوچ کا محور اس وقت اسی کی ذات ہے۔ وہ سب اس کی ذات سے ایک امید وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ مسرت جہاں، اس گھر کا روشن چراغ جو ایک طویل عرصہ پہلے فرجاد ملک کے خانہ دل میں نیا، بھیرنے کی چاہ لیے سادات گھر کی دیواروں کو اندھیروں کے حوالے کر گیا تھا۔ وہی مسرت جہاں جو ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ تھیں جو بھائیوں کی جان تھیں وہی مسرت جہاں جنہوں نے محض چند دن اپنے پیار کرنے والوں کا دوسرا روپ دیکھ کر دلیرداشتہ ہو کر ایک انتہائی قدم اٹھایا تھا اور ان کے اس قدم نے شبیہ حسین شاد کی جان لے لی تھی۔ وہی مسرت جہاں آج بھی ایک کسک بن کر سادات گھر کے کیمنوں کے دلوں میں آباد تھیں۔ اور فرجاد ملک وہ واحد شخص تھا جو ان سب کو ان کے بارے میں بتا سکتا تھا لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ بھی ویسا ہی بے خبر اور لاعلم ہے جیسے وہ سب۔

کبھی کو اس کے صحیح ہونے کی جلدی تھی اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب یہ سب جان لیں گے کہ وہ ٹھیک ہو چکا ہے تو ان سب کا پہلا سوال مسرت جہاں کے بارے میں ہی ہوگا اس کے دماغ میں

سوچیں کسی لادے کی طرح پک رہی تھیں۔

”اس سے پہلے کہ سب جان جائیں کہ میری ذہنی کیفیت اعتدال پر آ چکی ہے۔ مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔ جتنی محبتیں سمیٹنی تھیں سمیٹ لیں۔ جتنی رفاقت میرا آتی تھی آچکی۔ مجھ جیسے حرام نصیب کے لیے یہ تھوڑا بھی بہت زیادہ ہے۔ میری منزل سادات مگر نہیں، مسرت جہاں کا حصول ہے، اسے پا کر ان سب سے ملا کر ہی میں اپنی اور سب کی نظروں میں سرخرو ہو سکوں گا۔ جانے اتنے طویل عرصے خود فراہوشی کی کیفیت میں، میری مسرت جہاں پر کیا بنتی ہوگی۔ وہ مجھے فرحتی، دھوکے باز سمجھتی ہوگی۔ شاید اس نے یہ بھی سوچا ہو کہ میں کوئی آوارہ، بدقماش شخص ہوں جو محض چند دن اس کے ساتھ رتین لحات گزار کر اپنے راستے ہولیا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں اپنی ہمراہی کے خواب سجا کر بچے راستے میں چھوڑ گیا لیکن وہ ملے کی تو اسے سب کچھ بتاؤں گا۔۔۔ اکیس سال خوابیدہ ذہن کے ساتھ گزارے ہیں میں نے۔ میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں چھوڑا جس کی محبت پانے کے لیے میں تڑپا رہا تھا اسے جان بوجھ کر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔“ وہ جیسے خود کو تسلی دے رہا تھا۔

”میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو ان سب کی سوالیہ نگاہیں بھی دکھائی نہیں دیں گی۔ بس ایک دو دن۔۔۔ پھر میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا بالکل اسی طرح جیسے اکیس سال پہلے مسرت جہاں چپ چاپ یہاں سے چلی گئی تھی۔“

اس نے دل ہی دل میں پختہ ارادہ کر لیا۔ صرف دو دن بعد یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ یہاں صرف اسی صورت میں آئے گا جب اس کے ہمراہ مسرت جہاں ہوں گی اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو وہ اس دنیا کی بھیڑ میں ایسے کھو جائے گا کہ پھر خود کو بھی تلاش نہ کر سکے۔



سبک ہوا کے نرم لمس سے جھومتے درخت اور پودے، آسمان پر پھیلا بادلوں کا رتھ اور دور غروب ہوتے ہوئے سورج کی تاریخی کرنیں جنہوں نے بادلوں کو بھی شفق کی سرخی عطا کر دی تھی۔ سبھی کچھ زندہ تھا، جاندار اور خوبصورت لیکن وہ سب اس وقت ان چیزوں کے حسن سے بالکل بے نیاز تھے۔ سادات مگر کالان اس وقت وہاں کے مکینوں سے آباد تھا۔ بچے بھی، بڑے بھی سبھی موجود تھے۔ سوائے اہیقہ کے جو چائے بنانے کے خیال سے اٹھ گئی تھی۔ سادات مگر کے مکینوں میں یہ خوبی ضرور تھی کہ پریشانی کے وقت سب ایک دوسرے کا آسرا سہارا بن جاتے تھے۔ اس سے پریشانی ختم تو نہیں ہوتی لیکن اس کی سنگینی بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی سب ہی پریشان تھے لیکن اپنی دانست میں ایک دوسرے کی پریشانی دور کرنے کو مل بیٹھے تھے۔

”ہینا بچی! یہ عارب کل سے دکھائی نہیں دیا۔ کیا کہیں گیا ہوا ہے؟“ بڑی اماں نے ہینا پھپھو

سے پوچھا جو ان کے دائیں طرف لان چیئر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی اماں کے پوچھنے پر انہوں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ خاموش سی ہو کر ان کو دیکھنے لگیں۔ ایک طویل عرصہ ہو چکا تھا انہیں ان خاموش نگاہوں کو پڑھتے اور ان کی بے بسی کا مفہوم سمجھتے ہوئے۔

”بی اماں بی! وہ گھر پر نہیں ہیں۔ دو تین دنوں سے بہت عجیب رویے سے پیش آرہے تھے۔ کل ایک دو دوست آگئے تو ان کے ساتھ کہیں چلے گئے ہیں کہہ رہے تھے چند دن لگ جائیں گے۔“ ہینا پھپھو کے لہجہ میں محسوس کی جانے والی آزر دہی نے بڑی اماں کا دل دکھا دیا۔

”پتہ نہیں بچی! یہ ایسا کیوں ہے۔ ارے تو تو میری سب سے پیاری بیٹی ہے پر تیری اچھائیاں اس کو زمین کو کیوں نہیں نظر آتیں۔“

”اماں بی! آپ کیوں دل پر لگاتی ہیں۔ اب تو عرصہ ہو گیا عادت سی پڑ گئی ہے۔“ ہینا پھپھو زخمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولیں۔

”یہ خبر نہیں سادات مگر کی خوشیاں کہاں کھو گئیں۔ سکھ اور شانتی جیسے ہم سے منہ ہی موڑ گئی ہے، اب تو ہواؤں کی تیزی سے بھی خوف آتا ہے۔ کل سے میرے بچے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ دل بہت پریشان ہے۔ اللہ ان کی حفاظت کرے۔ اپنی اماں میں رکھے۔“ بڑی اماں کے لہجہ میں اندیشے کھلے ہوئے تھے۔

”اماں بی! وہ ایک نیک مقصد کو لے کر گھر سے نکلے ہیں۔ اللہ ان کی حفاظت کرنے والا ہے۔ بس مجھے طاہر کے پاپا کی طرف سے خدشہ ہے غصے کے تیز ہیں کہیں کچھ کر نہ بیٹھیں۔“ فیضی چچی سر سراتے لہجہ میں بولیں۔

”یہ بات تو ہے۔ چاچو کا غصہ تو اللہ معاف کرے۔۔۔ خلاف توقع بات پر کتنی بری طرح بھڑک اٹھے ہیں وہ۔“ شاذان نے مزید دہشت کری ایٹ کرنے کی کوشش کی۔

”اگر ایسی بات ہے تو اظہر بھائی کو جانتا ہی نہیں چاہئے تھا۔ غصے پر کنٹرول نہ کر سکے تو بہت برا بھی ہو سکتا ہے۔“ حدیقہ چچی نے بھی اپنی سیٹ سنبھال لی۔ اتنی دیر میں اہیقہ بھی چائے لے کر آگئی تھی۔ سب کو چائے سرو کر کے اپنا کپ ہاتھ میں لیے وہ آریان کے قریب نیچے گھاس پر براجمان ہو گئی۔

”کیا بحث چل رہی ہے۔“ آریان کے کان کے پاس منہ لے جا کر اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”بائبر انکل اور اظہر انکل کی باتیں ہو رہی ہیں۔“ آریان نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

”بڑی اماں اگر جو اظہر بچا نے وہاں کوئی ہنگامہ کر دیا پھر۔۔۔“ شاذان بولا۔

”آئے ہائے خبر کے کلمات منہ سے نکالو بچے۔۔۔ اتنے بڑے لوگوں کے بچے کے پھنسے ہوئے ہیں۔ اللہ نہ کرے جو کوئی فساد کھڑا ہو۔ اظہر کو جانتا ہی نہیں چاہئے تھا۔“

”اماں بی! آپ کیوں ہلکان ہوئی جارہی ہیں۔ اظہر بچہ تو نہیں۔ سمجھدار، ذمہ دار آدمی ہے معاملہ فہم ہے۔ کیا حالات کی نزاکت کا علم نہیں اسے۔ اس کا اٹھایا ہوا کوئی بھی الناقہ ماریاں اور اس کی مظلوم ماں کے لیے کوئی مصیبت بھی لا سکتا ہے۔“

شینا پھپھو نے بھی اماں کی پریشانی رفع کرنے کی کوشش کی۔

”ارے بچی معاملہ بھی اپنی جگہ پر جب وہ کسی بات پر اڑ جاتا ہے تو پھر اس سے کس نہیں ہوتا۔ ضد میں بالکل اپنے مرحوم باپ پر پڑا ہے۔ خدا نخواستہ وہاں کوئی بات مرضی کے خلاف ہوگئی تو فساد کھڑا کر دے گا۔ ارے میرے تودل کو ہول اٹھنے لگے ہیں۔ خدا خیر کرے۔“ بڑی اماں حقیقتاً انتہائی پریشان ہوگئی تھیں۔

”اماں بی! حوصلہ کریں، اللہ سے دعا مانگیں کہ وہ ہماری مدد کرے۔ آریاں اور اس کی امی ظالموں کے چنگل سے نکل آئیں۔“ زاہدہ چچی بڑی اماں کا ہاتھ تھام کر نرمی سے بولیں۔

”ہاں بابا بتا رہا تھا کہ وہ لوگ بہت برے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے بچھا نہیں پھوڑیں گے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم پوری کوشش کریں گے لیکن ممکن ہے آریاں کی ماں کو وہ لوگ نہ آنے دیں۔ ارے بچی میں نے تو ای لیے اس سے کہا تھا کہ اکیلا نہ جا۔ ساتھ اظہر، شا کر میں سے کسی کو لے جا۔ اتنے خطرناک لوگوں کے توسائے سے بھی بچنا چاہئے۔“ بڑی اماں بولیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ ان کے ان چند جملوں نے آریاں پر کیا اثر کیا تھا۔ وہ تو کل سے پریشان تھی ہی لیکن امید کی ایک ننھی سی کرن نے مایوسی کے اندھیروں کو گدیرایا ہوا تھا اور اب بڑی اماں کی بات نے امید کی اس ننھی سی کرن کا بھی گھا گھونٹ دیا، اس کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

”اماں! ساری زندگی یونہی گھسنے رہنا ہے تمہیں بھی اور مجھے بھی کوئی نہیں جو ہمیں بچائے۔ ہمیں جینے کا حق دلائے۔“ آنسو پلکوں کی منڈیروں سے پھلکنے کو تھے وہ ایک دم اٹھ کر اندر چلی گئی۔

”اسے کیا ہوا.....؟“ حدیقہ چچی نے صغومیں اچکا کر عجیب ناگوار لہجے میں کہا۔

”بچی ہے۔ پریشان ہے اپنی ماں کے لیے شاید میری کوئی بات اچھی نہیں لگی۔“ بڑی اماں دھیمے لہجے میں بولیں۔

”آپ نے ایسا کیا کہہ دیا۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولیں۔

”حدیقہ بچی! ضروری نہیں کہ کسی کو طعنوں کے تیروں سے ہی زخمی کیا جائے۔ بعض اوقات جگڑے ہوئے زخموں پر نرم روئی کا پھوہا بھی چھتا ہے۔ میں آریاں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بڑی صبر اور برداشت والی بچی ہے۔ میرے لفظ اس کو ناگوار نہیں گزرے ہوں گے ہاں کوئی بات اس کے دل کو لگی ہوگی۔ ایتھ، روہیہ بچی تم دونوں اس کے پاس جاؤ۔ اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرو۔“ بڑی اماں کسی

ماہر فیض شناس کی طرح نہایت مہارت سے آریاں کے رویے کی جانچ کرتے ہوئے بولیں۔ ایتھ اور روہیہ اٹھ گئیں۔

”خیال کرنا بیٹا کوئی دکھ دینے والی بات نہ منہ سے نکالنا۔ تمہارے مضبوط لیجے اس کی بہت بڑھائیں گے۔“

”جی بڑی اماں!“ وہ سر ہلاتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ فیضی چچی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تم کہاں چل دیں فیضی۔“ بڑی اماں نے ان سے استفسار کیا۔

”اماں بی دل بہت پریشان ہے، ان کی طرف سے جی گھبرا رہا ہے، ان کی خیریت اور کامیابی کے لیے اللہ کے حضور دعا کروں گی۔“ وہ بات مکمل کر کے اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئیں۔ شینا پھپھو پہلے ہی عصر کی نماز کے لیے اٹھ کر جا چکی تھیں۔

”میرا خیال ہے مجھے بھی چلنا چاہئے۔“ حدیقہ چچی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں غالباً ماحول میں اب ان کی دلچسپی کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی اور آج انہوں نے خلاف توقع طے بھی کم ہی کیا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد اماں بی وہاں اکیلی رہ گئی تھیں، ان کی ہڈ سوچ نکا ہیں خلا میں جمی ہوئی تھیں اور ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانوں پر متحرک تھیں۔

ایتھ اور روہیہ جب کمرے میں داخل ہوئیں تو منظر حسب توقع تھا۔ آریاں بیڈ کے ایک طرف سگری مکنی سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی، ہلکی ہلکی لرزش اس کے وجود پر طاری تھی جس سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھیں۔ روہیہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی جبکہ ایتھ نیچے بیٹھ گئی۔ اس کے ٹخنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ تھوڑا آگے کوچھکی۔ آریاں کے ہیکے گالوں کو دیکھا اور پیچھے ہو گئی۔

”رہنی آئی! موسم بہت خوشگوار سی لیکن آج ہر سات دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ ایتھ کا اشارہ اس کے آنسوؤں کی طرف تھا لیکن وہ خاموش رہی کچھ نہ بولی۔

”رہنی ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں نا..... ہم دوست ہیں نا۔“ روہیہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولی۔ جواب میں آریاں شدت گریہ کے باعث بول تو نہ سکی لیکن اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر اپنے ان قیمتی آنسوؤں کو ضائع مت کرو..... مجھے بتاؤ کس بات نے تمہیں اتنی تکلیف دی۔ کیا بڑی اماں کی بات سے.....“ روہیہ نے بات ادھوری چھوڑ کر آریاں کی طرف دیکھا۔

”نن..... نہیں..... انہوں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔“ آریاں نے تردید کی۔ روہیہ اور ایتھ کے آ جانے سے جیسے اسے کچھ حوصلہ ملا تھا لیکن اس کی آنکھیں ہنوز بھیگی ہوئی تھیں۔

”پھر..... پھر بتاؤ تو کسی رہنی شاید تم نہیں جانتیں کہ تمہارا اس طرح رونا ہمیں کتنی اذیت دے رہا

ہیں کہ شہر کا ایس ہی آج ان کے کوٹھے پر آ رہا ہے۔" ایس ہی خاور ملک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گاڑی اس وقت نسبتاً سکون میری سے گزر رہی تھی۔ کامران مشتاقی سے ڈرائیونگ کر رہے تھے۔

"کامی! تمہارے نزدیک اس مسئلے کو کس طرح بینڈل کیا جائے، تم نے اس پر کوئی ہوم ورک کیا؟"

"کیا مطلب خاور بھائی؟ میں سمجھا نہیں۔"

"بھئی یہاں تک تو معاملات اور حالات کسی حد تک درست رہے ہیں لیکن اب معاملہ صرف ہمارے درمیان نہیں رہے گا۔ اب دوسرا فریق بھی اس میں شامل ہو جائے گا اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اب آگے کیا کرنا ہے کچھ اس بارے میں سوچا۔ وہاں جا کر کیا کرنا ہے کیا کہنا ہے؟"

"ملک صاحب! کہنا کیا ہے جس مقصد کے لیے آئے ہیں اسے پورا کرنا ہے بس دو لفظی بات ہی تو کرنی ہے، ہم کون سا کسی مباحثے میں شرکت کرنے جا رہے ہیں۔" انظر شاہ مضبوط لہجے میں بولے۔

"شاہ جی! مقصد کے حصول کے لیے تک دو بھی تو کی جاتی ہے ہم جس کام کے لیے جا رہے ہیں وہ اتنا معمولی نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں اور نہ ہی یہ دو لفظوں میں نمٹنے والی بات ہے۔" خاور ملک معاملے کی گہرائی اور الجھاؤ کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔

"اتنا غیر معمولی بھی نہیں ہے ملک صاحب! بھلا ہم چار پانچ مرد مل کر ایک عورت کو نہ بینڈل کر سکیں گے۔"

"شاہ جی! آپ شاید اس قسم کی عورتوں کے بارے میں معلومات نہیں رکھتے، وہ کوئی مجبور و بے بس، حالات کی چٹکی میں پسنے والی مظلوم عورت نہیں! بازار حسن کی سب سے مشہور ناگہ ہے۔ بڑے بڑے بیوروکریٹس اس کی ایک جنبش اور پر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جائیں۔" خاور ملک بولے۔

"لیکن اس کی پہنچ سے ڈر کر ہم پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے۔" سخی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو انگلیاں نیز محی بھی کی جاسکتی ہیں۔"

"انظر صاحب! جوش سے نہیں ہوش سے کام لیں۔ آپ کوئی نوجوان یا غیر ذمہ دار شخص تو نہیں کہ معاملے کی سنگینی اور نزاکت کو نہ سمجھ سکیں۔ اس وقت گیند ستارہ بیگم کے کورٹ میں ہے سو ہمیں نہایت طریقے سے چلنا پڑے گا، ہمیں مسئلے کو حل کرنا ہے اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا نہیں کرنی۔"

"تو میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ بجائے اس عورت سے ڈرنے کے اپنا دماغ اس کے سامنے بیان کر دیں گے، سیدھی طرح مان گئی تو ٹھیک ورنہ پھر کوئی اور طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔"

"دیکھئے! ہم اس عورت سے ڈر نہیں رہے اور نہ ہی اپنا دماغ بیان کرنے کی ہمیں جلدی ہے۔ پہلے اسے رام کر کے اپنے ٹریک پر لانے کے بعد اصل مقصد پر آئیں گے تو ہمیں کامیابی حاصل ہوگی۔ آپ

ایک کاروباری شخص ہیں یہی سمجھ لیں کہ ہم یہاں ایک ذیل کرنے جا رہے ہیں۔ ایک مینڈر پاس کروانا ہے لیکن اس مینڈر کے اور بھی کئی امیدوار ہیں سب سے زیادہ مینڈر کا مالک دلچسپی لے رہا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں بہت سوچ سمجھ کر چلنا ہے کہ ہر امیدوار کو کنگ آؤٹ کر کے مالک اپنی دلچسپی کو پس پشت ڈال کر وہ مینڈر ہمارے حوالے کر دے۔ ایک بزنس مین سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر مشکل ذیل ہے، ہم اسے نہ تو مجبور کر سکتے ہیں اور نہ ہی طاقت کے زور پر اپنی بات منوا سکتے ہیں پھر یہی ہے کہ معاملہ کیوٹی کیشن کے ذریعے حل ہو اور اگر اس پتویشن میں آپ کچھ سخت کہیں گے تو معاملہ الٹ بھی ہو سکتا ہے۔"

خاور ملک نے انہیں رسانیت سے سمجھایا۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہی ملک صاحب! کہ سیدھا صاف راستہ ہے پھر ہمیں پیچیدہ مل کھائے ہوئے راستے پر چلنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہی تو بات ہے ناشاہ جی! کہ یہاں پیچیدہ راستے میں ہمارے لیے نسبتاً کم دشواریاں ہیں۔"

"ملک صاحب! کیا اس سلسلے میں آپ کے اختیارات بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ بالفرض محال اگر ہمیں قانون کا راستہ اختیار کرنا پڑے تو کیا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"قانون..... کون سے قانون کی بات کر رہے ہیں، انظر صاحب؟ ہم جیسے بظاہر ہر اختیار لوگ انہی اختیارات کی جھلکیوں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجبور..... ہم سے اسی قانون کی آڑ میں غیر قانونی کام لیے جاتے ہیں۔ ان اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والوں نے قانون کو رکھیل بنا رکھا ہے۔ ان کے ہاتھ میں ڈوریاں ہیں اور قانون کے اصول کٹھ پتلیاں۔ جیسے چاہیں نچا دیں۔ اور یہ ستارہ بیگم اور اس جیسی کئی بڑی تانیکاں ہم سے زیادہ ہر اختیار ہوتی ہیں کہ قانون بنانے والے ان کے تلوے چاٹتے ہیں، ہم ان پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اگلے دن اوپر سے ان کی سفارش آجائے گی، ان کے بڑے بڑے نفوس ہماری پٹیاں تو اتروا سکتے ہیں لیکن ہم ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔" خاور ملک کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"حیرت ہے! ایک بیوروکریٹ ہو کر آپ اس طرح کی بات کر رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا، پورے شہر کے حاکم ہیں آپ۔"

"نہیں انظر صاحب! حاکمیت تو دور کی بات ہم تو خود حکم کے غلام ہیں، ہم جیسے بیوروکریٹس کو تو ستارہ بیگم جیسی عورتیں چٹکی میں مسل دیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ایک اسلامی مملکت میں جہاں کھلے عام گناہ کبیرہ کی دعوتیں دی جاتی ہیں، قحبہ خانے اور ریڈ لائٹ ایریا ہیں، یہ سب ہماری یا ہمارے قانون کی نگاہوں میں نہیں ہیں، ایسی بات نہیں ہم سب کچھ جانتے ہیں، کہاں کیا ہو رہا ہے لیکن ان لوگوں کے پاس کچھ ایسے قانونی جواز ہوتے ہیں جن کی بنا پر ہم ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے پھر ان لوگوں کی پشت پناہی کرنے والوں کی بے حساب طاقت کے سامنے بھی ہمارا پانچ قانون نہیں ٹک سکتا۔ یہ اگر اتنا آسان ہوتا

تو یہ کوٹھے آپ کو آباد نہ دکھائی دیتے۔ یہ انہی اونچے ایوانوں کے مالکان کے دم قدم سے ہیں۔“ ایس بی خاور ملک نے ایک تلخ حقیقت بیان کی۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم سب نے ایک طوائف کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، ہم اس کی پہنچ سے خوف زدہ ہو گئے ہیں، لعنت ہے ہمارے مرد ہونے پر۔“ اعظم شاہ کا لہجہ چہستا ہوا تھا۔ ایس بی خاور ملک نے ایک نظر ان کے چہرے کے طرز پر تاثرات پر ڈالی اور گویا ہوئے۔

”یعنی آپ کا خیال ہے کہ کسی قسم کا ہنگامہ کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جائے۔ یہی کہنا چاہتے ہیں ناں آپ۔۔۔۔۔ لیکن سوری نو سے اعظم صاحب! یہاں مردانگی آزمانے کا نتیجہ مائوس زیدو کے سوا کچھ نہیں نکلتے گا۔ بہر حال میرا مقصد تو آپ کو سمجھانا تھا، آگے آپ لوگوں کی مرضی۔“ خاور ملک کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ اعظم شاہ سے بات کرنے کے بعد انہوں نے ڈرائیونگ کرتے کامران کو مخاطب کیا۔

”کامی۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے میرا تم لوگوں کے ساتھ جانا بھی کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں ہوگا اور میری کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں، گاڑی روکو میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“

”ارے خاور بھائی! ناراض نہ ہوں۔۔۔۔۔ جیسے آپ بہتر سمجھیں گے اور کریں گے ہم بھی وہ کریں گے۔“ کامران سنجیدگی سے بولے۔

”میں ناراض نہیں۔۔۔۔۔ لیکن میں اپنے کیریئر کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتا۔ اب تک کے بے داغ کیریئر پر کوئی دھبہ لگ جائے، کم سے کم یہ مجھے منظور نہیں پھر میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ ان کا یا ستارہ بیگم کا ہے یہ آپس میں جیسے چاہیں گے ڈیل کر لیں گے۔“ خاور ملک حقیقتاً اعظم شاہ کی ضد سے نالاں تھے۔

”نہیں ملک صاحب! ہم آپ کے توسط سے جا رہے ہیں اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ آپ اس مسئلے پر ہماری مدد کا وعدہ کر چکے ہیں اس لیے پلیز گول ڈاؤن۔ اور اعظم یار تم بھی قتل سے کام لو۔۔۔۔۔ ابھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے شخص مفروضے قائم کئے جا رہے ہو۔ دیکھو جھگڑا یا ہنگامہ کسی مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہم حادثہ مند ہیں سو ہمیں جھکنا پڑے گا اگر وہ کچھ سخت ست سنائے بھی تو چپ کر کے من میں کے۔ اس لیے کہ مسئلہ دو افراد کی زندگی کا ہے۔ کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو جھکا لینے میں کوئی ہرج نہیں۔“ باہر شاہ پہلے خاور ملک سے اور بعد میں اعظم شاہ سے مخاطب ہوئے۔

”لیکن بھائی!۔۔۔۔۔“ اعظم شاہ نے کچھ کہنا چاہا۔

”اعظم تمہیں میری بات پر یقین ہے یا نہیں، ابھی تو ہم اس عورت سے ملے ہی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلی بار ہی میں مان جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں یہاں چند بار آنا پڑے۔ تو یار! آئیں گے۔ ہر ممکن طریقے سے کوشش کریں گے کہ یہ معاملہ بہ حسن و خوبی منت جائے اور اگر ایسے نہ ملے ہوا تو پھر تمہارے طریقے پر چلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔“ باہر شاہ بہت دھیمے لہجے میں بولے۔

اور ان کے الفاظ کا خاطرہ خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اعظم شاہ مان گئے۔

”نھیک ہے جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔“ ان کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات بھی کسی حد تک نرم پڑے گئے۔ باہر شاہ نے طمانیت بھری سانس لے کر سیٹ کی پشت سے سر نکا دیا۔ خاور ملک کے تنے ہوئے اعصاب بھی کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اس تمام سرے میں فواد کچھ نہیں بولے تھے، ان کا ذہن مسلسل ادھیڑ بن میں تھا وہ حالات کی نزاکت کو پوری طرح سمجھ رہے تھے اور یہ بھی جان رہے تھے کہ جو مسئلہ انہیں درپیش ہے اس کا حل بے انتہا قفل، بردباری اور سو جہ بوجھ سے ہی ہو سکے گا۔ ذرا سی بے احتیاطی، ذرا سا اشتعال سارے کئے کرائے پر پانی پھیرنے کو کافی تھا۔

آریان اور اس کی ماں ستارہ بیگم کی ملکیت تھیں۔ وہ چاہتی تو انہیں آزاد کر دیتی۔ چاہتی تو ان کی قیمت لے لیتی یا پھر ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی قیمت پر ان دونوں کو نہ جانے دیتی کہ بہر حال وہ دونوں اس کے کاروبار کی بنیادی اکائیاں تھیں۔ باہر شاہ نے اعظم شاہ کو تو سمجھا بھجا دیا تھا لیکن وہ متفکر تھے اس لیے کہ کوٹھے کا ماحول اور وہاں بسنے والوں کی ذہنیت کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہاں پہنچ کر بھی اعظم شاہ کی طرف سے انہیں فکر لگی دینی تھی کہ حراج کے خلاف کوئی بھی بات سن کر وہ سمجھتے سے اکھڑ سکتے تھے بہر حال اوکھلی میں سر دے کر موسلوں سے ڈرنے والوں میں سے تو وہ بھی نہ تھے۔ اب جو ہونا تھا اسے فیس کرنا تھا۔

گاڑی چند ایک خوبصورت کونٹھوں کے قریب سے گزر کر سڑک کے ایک طرف رک گئی۔

”یہاں سے پیدل آگے جانا پڑے گا، گاڑی آگے نہیں جاسکتی۔“ خاور ملک اپنی جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے تو وہ سب بھی گاڑی سے نیچے اتر آئے، رک کے دائیں طرف قدرے کشادہ گلی تھی۔ خاور ملک اس گلی کی طرف چل پڑے تو باقی سب بھی ان کی تقلید میں آگے بڑھنے لگے۔ فواد نے بازار حسن کا صرف نام ہی سنا تھا۔ پہلی بار ایسی جگہ آئے تھے، انہیں یہ جگہ کوئی غیر معمولی نہیں دکھائی دی۔ دو منزلہ تین منزلہ مکانات کی آٹھ سائے بنی قطاریں کہیں سے کشادہ اور کہیں سے تنگ گلیاں کافی آگے آنے کے بعد وہ دوبارہ دائیں جانب مڑ گئے۔ بائیں ہاتھ پان سٹریٹ بیزی کی دو تین دکانیں تھیں یہ گلی چھپلی گلیوں کی نسبت قدرے وسیع تھی اور لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی۔ قدم قدم پر پھول بیچنے والے ہاتھوں میں پھولوں کی لڑیاں لیے کھڑے تھے اور ہر نووارد کی طرف پکیتے تھے۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی، مکانات کے اوپری چوہا رے روشن ہو چکے تھے۔

”ہا ہو۔۔۔۔۔ پھول تو لے لو۔۔۔۔۔“ ایک عورت جلدی سے آگے بڑھی اور اس نے پھولوں کی لڑیوں والا ہاتھ کامران کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

”نہیں چائیں۔۔۔۔۔“ کامران سنی ان سنی کر کے آگے بڑھے۔